# پیلے
# سیاہ
# پھول





میمونہ اس کتاب کے سحر میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی۔ ایسا نہیں کہ وہ اسے پہلی بار پڑھ رہی ہو۔ یہ کتاب وہ بلامبالغہ درجنوں بار پڑھ چکی تھی اور ہر بار اس نے اسے اسی طرح مسحور کیا تھا۔ ہر بار وہ ان جانے دیسوں کی سیر کرتی' ان دیکھی خوب صورت وادیوں میں گھومتی پھرتی۔ اس کی آنکھیں ان چھوئے حسن فطرت کو جذب کرتیں۔ کتاب ختم کرنے کے بعد وہ کئی دن اداس رہتی لیکن وہ کوئی عام اور ناپسندیدہ اداسی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو بے حد حسین اور رومان انگیز اداسی ہوتی تھی۔ اس عرصے میں وہ چلتی پھرتی' سب کچھ کرتی لیکن یوں جیسے عالم خواب میں ہو۔

اس وقت وہ صرف پڑھ نہیں رہی تھی' لفظوں کی انگلی پکڑے' سطروں کی پگڈنڈیوں پر قدم رکھتے وہ ناران سے جھیل سیف الملوک کا سفر کر رہی تھی۔ چلتے چلتے رک کر اس نے ایسے نرم و نازک اور حسین پھولوں کے گچھے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو ارضی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو پریوں کے خوب صورت ترین خواب تھے' جنہوں نے ان پھولوں کا پیراہن اوڑھ لیا تھا۔

ابھی وہ ان پھولوں کو چھو بھی نہیں پائی تھی کہ تصور کا شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا۔ ''مون ـــ اے مون بیٹا ـــ'' انا بوا اسے پکار رہی تھیں۔

اس نے جھنجلا کر کتاب سے نظریں اٹھائیں۔ ''کیا بات ہے بوا؟'' اس نے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بات کیا ہے؟ پھر اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے بہت ڈسٹرب کرتی ہو بوا' سکون سے پڑھنے بھی نہیں دیتیں۔''

''اے بٹیا' ہر وقت تو تم سکون سے پڑھتی رہتی ہو۔ نہیں تو پڑھاتی رہتی ہو۔ اس پر بھی شکایت؟''

"اچھا' بتاؤ کس لئے آئی تھیں؟"

"یہ پوچھنا تھا بٹیا کہ کیا پکائیں آج؟"

"مجھے معلوم تھا۔" میمونہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "تم ہر روز اتنے اہتمام سے یہی کچھ پوچھتی ہو۔ کچھ بھی پکا لو بوا' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا' کبھی نہیں ہوتا۔"

"تو یہی کون سی اچھی بات ہے بٹیا' کوئی کیسا ہی صابر ہو' کبھی کوئی خاص چیز کھانے کو دل تو چاہتا ہے۔"

"میرا نہیں چاہتا بوا۔ میں زندہ رہنے کے لئے کھاتی ہوں بوا' کھانے کے لئے نہیں جیتی۔"

"ہماری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ تم جیتی کس کے لئے ہو۔" بوا نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"فاب میں کیا بتاؤں بوا!" میمونہ نے دل میں سوچا۔" وہ بس ایک نام ہی تو ہے۔۔۔ ایک بھولی بسری یاد ہی تو ہے۔ اسے تو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ کوئی اس کا منتظر ہے۔

"میں نے سوچا آج شاید تم کوئی خاص چیز کھانا چاہو۔" بوا نے مزید کہا۔

"کیوں' آج کیا خاص بات ہے؟"

"لو تمہیں یہ بھی نہیں پتہ؟" بوا نے پھر پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "بٹیا! کبھی آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد بھی دیکھ لیا کرو۔ اے ایسی بھی کیا بے خبری کہ آدمی کو موسم کا بھی پتہ نہ چلے۔ ارے تمہاری دنیا سے منہ موڑنے کی عمر ہے کیا؟"

میمونہ اس لیکچر سے ہمیشہ کی طرح بوکھلا گئی۔ "ہوا کیا ہے بوا! کیا ہو گیا؟"

"بارش ہو رہی ہے تین گھنٹے سے مگر تم اپنے کمرے سے نکلو تو پتا چلے نا۔ کھڑکی ہی کھول لیا کرو کبھی۔"

"سچ بوا! بارش ہو رہی ہے؟" میمونہ کھل اٹھی۔ "واقعی مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ مجھے بارش بہت اچھی لگتی ہے۔" اس نے جا کر پردے کھسکائے اور کھڑکی کھول دی۔ بارش اس رخ کی نہیں تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر اپنے باغیچے کو دیکھتی رہی۔

درخت اور پودے بارش میں جھومتے معلوم ہو رہے تھے۔

انا بوا کو اس وقت اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر یقیناً حیران ہوتیں۔ وہ کھو سی گئی، جیسے کہیں دور کسی اور دنیا میں نکل گئی ہو۔ پتوں پر، گھاس پر اچھلتی ناچتی، بوندیں دیکھتے دیکھتے وہ برسوں پیچھے چلی گئی تھی۔ بارش تو اسے ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی۔

پھر اچانک اس کے وجود میں اداسی ایک دم سے گھٹا کی طرح امڈی۔ بوا یہ رنگ دیکھ لیتیں تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگتا۔ اداسی اس کی آنکھوں سے بارش کی طرح برس رہی تھی۔ چہرے پر بھی اداسی کا گہرا رنگ تھا۔ جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا اسے، ا وہی یادیں تو اس کا سرمایہ تھیں۔

"آج دھنک تو نہیں نکلے گی۔" اس نے متاسفانہ انداز میں خود کلامی کی، اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

"کیوں نہیں نکلے گی؟" بوا کے لہجے میں چیلنج تھا۔

اس نے پلٹ کر بوا کو دیکھا۔ "آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سورج غ ہونے کے بعد دھنک نہیں نکلتی۔"

بوا خجل ہو گئیں۔ "ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ بھئی دھنک کا ت بارش سے ہے نہ کہ سورج سے۔"

"بارش کے بعد دھنک نکلتی ہے مگر دھوپ کی موجودگی ضروری ہے۔" م نے انہیں سمجھایا۔

"اے بٹیا، یہی تو باتیں ہیں۔ خود کو اتنا بڑا سمجھتی ہو تم۔ ہمیں بھی پڑھانے جاتی ہو۔" اچانک انہیں خیال آیا اور انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "بھئی تم ہمیں پاگل کر دو گی، ہم یہاں بارش، دھوپ اور دھنک کی سائنس پڑھنے نہیں آئے تھے"

"تو پھر؟" میمونہ نے غائب دماغی کی اداکاری کی۔

"ارے ہم کھانے کا پوچھنے آئے تھے 'کیا پکائیں آج؟'" بوا جھنجلا گئیں۔

"کچھ ہی پکا لو بوا۔ میں کھانے کے لئے نہیں جیتی، جینے کے لئے کھاتی ہوں"

بوا کو اپنے مکالمے دہراتے ہوئے شرمندگی ہوئی۔ انہوں نے معاملہ رفع



کرنے کی غرض سے کہا۔ "اتنا اچھا موسم ہے، قیمہ بھرے پراٹھے پکاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، پکا لو۔" میمونہ نے بے دلی سے کہا۔ "پیسے تو ہیں نا تمہارے پاس؟"

"وہ تو ہوتے ہی ہمارے پاس ہیں۔ تم کہاں رکھتی ہو پیسے۔ سب کچھ ہم پر ڈالا ہوا ہے۔" بوا نے شکایت کا ایک اور پہلو نکالا۔

میمونہ پھر کھڑکی کی طرف پلٹ گئی۔ اداسی اپنی جگہ مگر برسات کے موسم سے تو کوئی نہیں لڑ سکتا نا۔ چند لمحوں میں وہ سب کچھ بھول گئی۔ اسے انا بوا کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا۔

انا بوا کمرے سے نکل آئیں۔



بارش رکی تو انا بوا جا کر قیمہ خرید کر لائیں اور تیاری میں مصروف ہو گئیں مگر ان کے دماغ پر میمونہ سوار تھی۔ وہ اس کے لئے کڑھ رہی تھیں۔ کیوں نہ کڑھتیں، ان کے پاس اب زندہ رہنے کے لئے میمونہ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

بوا کی یہ وابستگی بتیس سال پرانی تھی۔ میمونہ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شہلا اس وقت چھوٹی سی تھی۔ چھ سال کی رہی ہو گی۔ بوا جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ گھروں میں کام کاج کر کے گھر چلانے اور بچوں کا پیٹ پالنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایسے میں انہیں صغیرہ باجی کے ہاں کام مل گیا۔ صغیرہ باجی انہیں بہت اچھی لگیں ـــ نرم دل، مہربان، درد مند۔ بوا کا ان سے ایسا دل ملا کہ وہ انہی کی ہو کر رہ گئیں۔ اگرچہ مرحوم امجد صاحب مزاج کے بہت سخت تھے اور بوا انہیں خاصا ناپسند کرتی تھیں مگر ان سے ان کا ایسا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو صغیرہ باجی کی خاطر وہ سب کچھ برداشت کر لیتیں۔

صغیرہ باجی کو یاد کر کے انا بوا کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش ٹپاٹپ پھر شروع ہو چکی تھی۔ اچھے لوگوں کے لئے آسمان بھی 'روتا ہے۔ انہوں نے دکھ سے سوچا۔

صغیرہ باجی کو کام کرنے والی کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ خود بہت تھیں۔ گھر کا کام بہت شوق اور محبت سے کرتی تھیں۔ بدقسمتی ہوئی کہ شہلا کے بعد بار ان کا پاؤں چھوٹ گیا۔ دوسری بار کے بعد ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ اب وہ ا کے متعلق بھول جائیں۔ اب کے کچھ ہوا تو ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تھا بھی یہی کہ دوسری بار کے بعد وہ کمزور بے تحاشا ہو گئیں۔ ذرا تیز چلتیں تو آتے۔ اس لئے انہیں مدد کی ضرورت پڑ گئی۔

بوا ان کے ہاں برتن اور کپڑے دھوتیں اور جھاڑو پونچھا کرتیں۔ انہیں باجی کے ہاں کام کرتے سوا سال ہوا ہو گا کہ باجی کا پاؤں پھر بھاری ہو گیا۔ ڈاکٹ نے کہا کہ اس بار انہیں بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی امجد صاحب گھبرا گئے تھے۔

اتنے عرصے میں اس روز امجد صاحب نے پہلی بار بوا سے بات کی۔ "بوا! اب پورے دن کے لئے ملازمہ چاہئے۔"

"صاحب' میں دس گھروں میں کام کرتی ہوں تو گھر چلتا ہے۔" بوا نے لجاجت سے معذرت کی۔

"کتنا مل جاتا ہے؟"

"پانچ سو روپے ہو جاتے ہیں صاحب!"

"اور تھک کر چور بھی تو ہو جاتی ہو گی۔ ایک گھر میں کام کرو گی تو اتنی نہیں ہو گی۔"

"تھکن کا کیا ہے صاحب! بچے تو پالنے ہیں' تھکن تو ہمارا نصیب ہے۔"

"میں تم سے اس لئے اصرار کر رہا ہوں کہ بیگم تم سے بہت خوش ہیں ملازمہ کا ملنا کوئی مسئلہ نہیں۔" امجد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں اوقات یاد دلائی۔ "سوچ لو' میں تمہیں سات سو روپے دوں گا۔"

سات سو کا سن کر بوا ہل گئیں۔ "ہمیں کرنا کیا ہو گا صاحب؟"

"صبح سات بجے آنا ہو گا اور رات دس بجے تک رہنا ہو گا۔ اس دوران ہر کام کرنا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بیگم کچھ بھی کریں' پورا گھر سنبھالنا ہو گا



"میں تیار ہوں صاحب!"

امجد صاحب کسی سوچ میں پڑ گئے۔ بوا ڈریں کہ وہ ارادہ بدلنے والے ہیں۔ اب وہ سوچ رہی تھیں کہ یہ پیشکش تو ان کے لئے فائدہ مند ہے۔ واقعی دس گھروں سے تھکن سمیٹنے کے عوض پانچ سو روپے۔ اس کے مقابلے میں تو ایک گھر میں خواہ کتنا ہی کام ہو' آرام کہلائے گا اور پھر سات سو روپے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم یہیں رہا کرو؟" چند لمحے بعد امجد صاحب نے سر اٹھا کر کہا۔

بوا کے لئے یہ بہت مشکل لمحہ تھا۔ مگر بچوں کے خیال نے اتنی بڑی ترغیب کو بھی نگل لیا۔ "نہیں صاحب' بچوں کا معاملہ ہے۔ وہ بہت چھوٹے ہیں۔"

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟" امجد صاحب نے انہیں تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ بوا اس وقت پچیس چھبیس کی ہوں گی۔ کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھیں۔

بوا بدکنے لگیں۔ بے آسرا ہونے کے بعد سے اب تک مردوں کی ہوس ناک نظروں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا مگر وقت نے انہیں بچ بچا کر جینے کا ہنر بھی سکھا دیا تھا۔ کہیں بات خطرناک حد تک بڑھنے لگتی تو وہ خاموشی سے کام چھوڑ دیتیں۔

بوا نے سر اٹھا کر امجد صاحب کو دیکھا۔ وہاں سختی ہی سختی تھی۔ ایسی ویسی کوئی بات انہیں نظر نہیں آئی اور کمال یہ کہ اس لمحے وہ سختی انہیں بہت اچھی لگی۔ وہ انہیں تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔ "تین بچے ہیں صاحب! سب سے بڑا چار سال کا ہے۔ چھوٹی بچی دو سال کی ہے۔"

"تمہارے بغیر کیسے رہتے ہوں گے وہ؟" امجد صاحب نے جھرجھری لی۔

"ہماری ایک چھوٹی بہن ہے --- بارہ تیرہ سال کی۔ وہ انہیں سنبھال لیتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" امجد صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ "تم یہاں رہ نہیں سکتیں۔ بس اتنا کرنا کہ ہماری بیگم کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔"

"آپ فکر نہ کریں صاحب!"

یوں بوا کی اس گھر سے مکمل وابستگی شروع ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ اس نے
باجی کا ایسا خیال رکھا کہ سگی بہن بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ کبھی صغیرہ شکایت کر
وہ خود کو بیمار محسوس کرنے لگی ہیں۔

صغیرہ کے ہاں ارشد کی پیدائش ہوئی تو انا بوا گھر کے جزوقتی فرد کی
اختیار کر چکی تھیں۔ شہلا سے انہیں محبت ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی بہت نیک ا
الطبع بچی۔ نافرمانی نہ کرتی' جیسا کہا جاتا کر لیتی۔

ارشد دو ماہ کا تھا کہ انا بوا پوری طرح اس گھر کی فرد بن گئیں۔ ایسے ہ
کے پیچھے کوئی المناک واقعہ ہوتا ہے۔ یہ معاملہ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں
بوا کا اپنا گھر پوری طرح اجڑ گیا تھا۔

قریب ہی ایک کچی بستی تھی۔ وہیں انا بوا کی جھونپڑی تھی۔ کب
خواب دیکھتی تھیں کہ اس جگہ وہ ایک کچا مکان بنوائیں گی۔ جھونپڑی میں ہر
میں انہیں بچوں کو اپنے جسم تلے چھپا کر یوں بیٹھنا پڑتا کہ جیسے سر پر چھت
نہیں۔ اور وہ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھی ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ خا
سوچتیں کہ اس بار تو پیٹ کاٹ کر ہی سہی' کچا مکان بنوا کر ہی دم لیں گی۔

اس روز وہ ارشد کے پوتڑے دھو رہی تھیں کہ بستی کی ایک ع
کانپتی آئی۔ "ہاجرہ --- جلدی سے چل میرے ساتھ۔"

بوا نے ایک نظر اس عورت کے چہرے کو دیکھا اور پھر خاموشی کے
پاک کرنے لگیں۔ بغیر ایک لفظ کے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ موت نے
لیکن یہ اندازہ انہیں خود بھی نہیں تھا کہ ان کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ پڑ
گری تھی اور ان کی بہن اور بچوں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔

انہوں نے گھر سے نکلتے وقت صغیرہ باجی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ بتا
انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا۔ صغیرہ باجی خود ہی شہلا کی انگلی پکڑے نے
میں لئے' پوچھتے پاچھتے ان کے گھر آگئیں۔ پھر انہوں نے ہی تدفین کا بن
شام کو وہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔



بچوں کی موت کا زخم بھرنے والا نہیں تھا مگر انہوں نے اپنی مامتا' باجی کے بچوں
کو سونپ دی۔ تین سال بعد میمونہ پیدا ہوئی۔ وہ تو بوا کی آنکھوں کا تارا ہی بن گئی۔

بچوں کی موت کے بعد انا بوا آزاد تھیں۔ وہ جوان بھی تھیں اور خوب صورت
بھی۔ ان کی شادی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ امجد صاحب نے صغیرہ باجی کے توسط سے
کئی بار کہلوایا مگر انا بوا کا ایک ہی جواب تھا۔ "اگر میں آپ کو اپنے گھر میں بری اور
بوجھ لگتی ہوں تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ ورنہ آپ کے بچوں میں تو مجھے اپنے
بچے مل گئے ہیں۔"

پھر یہ بات بھلا دی گئی۔ انا بوا صرف انا بوا رہ گئیں۔

انا بوا نے سر جھٹکا۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ آنکھوں سے برسات ہو رہی ہے۔
آنکھیں پونچھ کر انہوں نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو پتا چلا کہ بہت زور کی بارش
ہو رہی ہے۔ آگے یاد کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی اور پراٹھے بھی پکانے تھے۔ انہوں
نے اپنی توجہ پراٹھوں پر مرکوز کی۔ اسی وقت ان کی ذہنی رو پھر میمونہ کی طرف مڑ گئی۔

"یہ لڑکی آخر کرے گی کیا؟" انہوں نے آٹے کے تسلے سے کہا۔ "اسے بڑا
بننے کا شوق ہے۔ چشمہ چڑھا لیا آنکھوں پر۔ کپڑے اچھے نہیں پہنتی جان بوجھ کر۔
ایسے کپڑے پہنتی ہے کہ اپنی عمر سے بڑی --- بلکہ بدصورت لگے۔ ہم کیا سمجھتے نہیں
ہیں' سب جانتے ہیں۔"

یہ بیماری تھی --- اور بیماری بھی تیس سال پرانی۔ یہ بچوں کی موت کے بعد
لاحق ہوئی تھی۔ بوا کسی معاملے میں بہت پریشان ہوتیں اور اس سلسلے میں کسی سے
گفتگو نہ کر پاتیں تو کسی بھی چیز سے باتیں شروع کر دیتیں۔ وہ مفصل' مکمل اور مدلل
گفتگو ہوتی۔

"یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔" اس بار انہوں نے گھی کے ڈبے سے کہا۔
"کیوں؟ اب یہ تمہی بتاؤ۔"

گھی کا ڈبا جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ چولھے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "دل
ٹوٹ گیا بچی کا۔ ارے بدنصیب تھے وہ جو جہیز کے نام پر اسے چھوڑ گئے مگر بعد میں تو
اللہ نے اسے بہت دیا۔ جہیز سا جہیز بن جاتا اس میں۔ دنیا دیکھتی رہ جاتی مگر اس نے کیا

کیا؟ کہنے لگی۔۔۔ ایک مثالی اسکول قائم کروں گی بوا! اور سکول قائم کر لیا۔ اب
میں سر کھپاتی ہے۔ ان کے ساتھ کھپتی ہے۔ کیا یونہی زندگی گزرے گی؟" اس
پر بوا خود ہی لرز کر رہ گئیں اور توے سے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ "ہم تو ایسا
ہونے دیں گے۔" انہوں نے توے کو چولھے پر پٹخا اور پراٹھے کا پرت بیل کر اس
قیمہ پھیلایا۔ دوسرا پرت جوڑ کر انہوں نے پراٹھے کو توے پر ڈالا اور چمچہ بھر گھی
کر توے پر ڈال دیا۔ "کیسے اچھے اچھے رشتے آئے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔" ان
نے پراٹھے سے کہا۔ پھر ہاٹ پاٹ میں اخبار بچھانے لگیں۔ "وجہ ہماری سمجھ میں
آتی۔ جب سے پیدا ہوئی ہے' تب سے دیکھ رہے ہیں ہم۔ کوئی چکر ہوتا تو
معلوم ہوتا۔" انہوں نے پراٹھے کو پلٹا اور اس حصے سے باتیں کرنے لگیں جو ذرا
پہلے توے سے ملا ہوا تھا۔ "کوئی چکر ہوتا تو انکار سمجھ میں بھی آ جاتا۔ اب اختر
لے لو' اچھا بھلا لڑکا ہے۔" انہوں نے پھر پراٹھے کو پلٹا۔ "خوش شکل ہے۔ پڑھا
ہے' اچھی تنخواہ ہے' پیچھے پڑا ہوا ہے کب سے۔ اور یہ ہے کہ گھاس بھی نہیں
اسے۔ توبہ بھیا' کیا بنے گا۔" انہوں نے پراٹھا اتار کر ہاٹ پاٹ میں ڈالا اور
ڈھکنا بند کر دیا۔

انہیں احساس ہوا کہ کال بیل بج رہی ہے۔ دوسرا پراٹھا بیلتے ہوئے انہوں
سوچا' ابھی بٹیا دروازہ کھول دے گی لیکن تیسری بیل پر انہیں یقین ہو گیا کہ
ہونی سوچ رہی ہیں۔ "وہ تو کھوئی ہوئی ہو گی کہیں۔" انہوں نے بیلن کو مخاط
"دروازہ ہمیں ہی کھولنا پڑے گا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے اختر کھڑا تھا۔ "ہم کہیں گے کہ تمہاری
بڑی ہے۔" بوا نے کہا۔ "صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو کہتے۔۔۔ ادھر شیطان کا
ادھر وہ حاضر۔"

"بوا مجھ سے آسان گفتگو کیا کرو۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے ہم تمہیں یاد کر رہے تھے بیٹا!"

"آپ ہمیں راستہ نہیں دیں گی تو ہم بھیگ کر کمزور ہو جائیں گے بوا
نے انہی کے لہجے میں کہا۔



"شکایت تم کرتے ہو اور باتیں تمہاری ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"ارے انا بوا' ہم مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور بارش بہت تیز ہو رہی ہے' مٹی بہے گی تو ہم کمزور نہ ہوں گے؟"

"ارے تو اندر آ جاؤ نا۔" بوا نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہمیں صاحب مرحوم ہی کی بات درست لگتی ہے' اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔"



میمونہ اسی وقت سے ازخود رفتگی کی کیفیت میں کھڑی رم جھم کا وہ سماں دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی بارش رک گئی۔ اندھیرا اچھا خاصا تھا۔ بارش رکنے کے بعد فضا بھی اداس اور سوگوار سی لگنے لگی۔ سامنے والی دیوار' اس سے لپٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیل' پودے اور درخت' سب ساکت تھے اور اداس بھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ناصر کاظمی کا ایک مقطع گنگنا رہی ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

احساس ہوا تو وہ مسکرا دی۔ کیسا شاعر تھا یہ ناصر بھی۔ اس نے سوچا۔ اپنے اندر رہنے' اپنے اندر بسنے والوں کی نمائندگی کرنے والا شاعر! کیسی عجیب بات ہے کہ ناصر کی شاعری احساس دلاتی ہے کہ اصل موسم تو آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ باہر کی کسی چیز کو کیا پڑی کہ کسی کو اداس دیکھ کر اداس ہو جائے۔ ناصر نے کتنی سادگی سے کہا تھا:

دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ یہ دل عجیب طرح سے اداس ہوا تھا۔ اب کتاب پڑھنے کو طبیعت مائل ہی نہیں ہو رہی تھی۔ شاید بارش کا موسم ہوتا ہی ایسا ہے۔ یادوں کی دنیا میں لے جانے والا۔ جب وہ لوگ پاس نہ ہوں' جو برسات میں محفل

آرائی کرتے تھے تو آدمی بارش سے محظوظ ہونے کے بجائے یادوں میں کھو جاتا ہے۔

اسے ناصر کا ایک اور شعر یاد آیا:

اک شام کی ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ بیٹھے
ہم دل کے اجڑنے کا سبب سوچ رہے ہیں

وہ پھڑک کر رہ گئی۔ یہ ایک کمال بھی ناصر کا ہی ہے کہ مختلف کیفیات میں ایک ہی شعر کس طرح کا تاثر مرتب کرتا ہے۔ ہر بار ایک مختلف انداز میں متاثر کرتا ہے۔

اس نے محسوس کیا کہ ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہے اور وہ گھر کی چوکھٹ پر اداس اور اکیلی بیٹھی ہے۔ کیسے پیارے پیارے لوگ تھے' جنہوں نے اسے کیسے حسین اور یادگار لمحے دیئے' کیسی پیاری پیاری یادیں دیں' جن سے لپٹ کر وہ اب بھی دکھوں کی رت میں چین سے سو جاتی ہے اور سب اس سے بچھڑ گئے۔ کچھ ایسی دنیاؤں میں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کچھ نامعلوم دنیاؤں میں چلے گئے' جہاں سے اپنی خیریت کی خبر بھی نہیں دی جا سکتی۔

شام کی اس ٹوٹی ہوئی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے وہ اتنا پیچھے چلی گئی کہ پانچ سال کی ننھی منی بچی بن گئی۔ اسی طرح وہ دل کے اجڑنے کا سبب سوچ سکتی تھی۔



اس روز امی گھر میں نہیں تھیں۔ انا بوا اس کمرے میں گھسی اس کی صفائی کر رہی تھیں' جو عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ کبھی کوئی مہمان آ جاتا تو اسے کھول دیا جاتا۔ آپی بھی اسی کمرے میں تھیں۔ وہ باہر سے پھولوں کا بہت خوب صورت دستہ بنا کر لائی تھیں اور اب اسے گل دان میں سجا رہی تھیں۔

میمونہ اسکول سے آئی تو سب کو تلاش کرتی اس کمرے تک چلی گئی۔ گل دستہ دیکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گئی۔ پھولوں سے اسے پیدائشی عشق تھا۔ "اللہ آپی' آپ اتنا پیارا گلدستہ کیسے بنا لیتی ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"گل دستے محبت سے بنتے ہیں گڑیا!" آپی نے کہا۔

"کس کی محبت سے؟" اس نے پوچھا۔

"آپی گڑبڑا گئیں۔ ان کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ "پھولوں کی محبت سے ---- اور کس سے پگلی۔"

"پھولوں سے تو میں بھی محبت کرتی ہوں مگر مجھ سے اتنا خوب صورت گل دستہ نہیں بنتا۔"

"ابھی تم چھوٹی ہو نا' اس لئے۔ میں تمہیں سکھا دوں گی۔"

"اچھا آپی' کمرا کیوں صاف کر رہی ہیں آپ؟ کوئی آ رہا ہے؟"

"ہاں" آپی نے گل دان کارنس پر رکھتے ہوئے کہا۔ "سرمد بھائی آ رہے ہیں۔"

"واہ بڑا مزہ آئے گا۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ مگر فوراً ہی اداس ہو گئی۔

"سرمد بھائی تو فوراً ہی چلے جاتے ہیں آپی' مجھے بہت برا لگتا ہے ان کا جانا۔"

"اب نہیں جائیں گے' یہیں رہا کریں گے وہ۔"

وہ آپی سے لپٹ گئی۔ "یہ ٹھیک ہے ہم ان سے خوب کہانیاں سنا کریں گے۔"

اسے یہ فکر نہیں تھی کہ سرمد بھائی اب یہاں کیوں رہیں گے۔ وہ آم کھاتی تھی پیڑ گننے کی قائل نہیں تھی۔

"مونا' تم کپڑے بدلو۔ ہم کھانا لگاتے ہیں۔" انا بوا نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔

"ابھی بدلتی ہوں بوا!" اس نے آپی سے لپٹے لپٹے کہا۔

"تمہیں سرمد بھائی بہت اچھے لگتے ہیں گڑیا؟" آپی نے پوچھا۔

"بہت ---- بہت اچھے۔" اس نے بہت کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

"کتنے اچھے؟"

اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور پھر انہیں اوپر تک لے گئی۔ "اتنے اچھے ---- آسمان جتنے۔" اس نے کہا پھر بولی۔ "پتا ہے آپی' میں بتاؤں' ایک دن میں سرمد بھائی سے شادی کروں گی۔ ان کی دلہن بنوں گی میں۔"

آپی نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "پگلی نہ ہو تو۔ بڑی آئی ان کی دلہن بننے والی۔ ہماری رقیب بنے گی کیا؟"

"رقیب کیا ہوتی ہے آپی؟ کیا بہت بری ہوتی ہے؟"

آپی نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ "ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ تمہیں تو ابھی کچھ پتا ہی نہیں ہے لیکن سچ مچ تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا دوں۔ تم تو مجھے بہت ہی پیاری ہو۔ تم تو رقیب ہو جاؤ تو بھی میں بننے نہ دوں میری جان۔" اچانک ہی وہ اداس ہو گئیں۔ "اور ہمارا بھی کیا پتا۔ ہم تو آپ ہی آپ سوچتے رہتے ہیں۔ اکیلے سوچنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا' بس تم دعا کیا کرو ہمارے لئے۔"

"وہ تو میں ہر روز کرتی ہوں آپی۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "میں رات سوتے وقت اور صبح اٹھتے ہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ میاں' میری آپی کو فسٹ پاس کر دیں۔"

آپی کو ہنسی آ گئی۔ "تم تو بس پگلی ہو۔ پتا ہے نہیں کچھ اور عقل مند بنتی ہو۔"

"آ جاؤ بھئی' کھانا لگا دیا ہے۔" دور سے انا بوا کی آواز سنائی دی۔

"چلو جلدی سے کپڑے بدلو اور ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ ورنہ بوا بہت خفا ہوں گی۔"

اسی وقت ارشد بھائی بھی اسکول سے آ گئے۔ ان کی چھٹی اس کے مقابلے میں ذرا دیر سے ہوتی تھی۔

اس روز سرمد بھائی اپنا تھوڑا بہت سامان لے کر ان کے ہاں آ گئے۔ امی انہیں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ آپی نے ان کا سامان ان کے کمرے میں سلیقے سے رکھ دیا۔ سامان کیا' بس ان کے پاس کتابیں تھیں بہت ساری' تھوڑے سے کپڑے تھے' ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ تھا اور شیو کرنے کا سامان تھا۔

اس بار سرمد بھائی بہت چپ' بہت اداس اداس تھے۔ انہوں نے اس سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ ورنہ پہلے وہ آتے تو سب سے پہلے اس کی فراک کا دامن ٹافیوں سے بھر دیتے پھر پیار سے اس کی خیریت دریافت کرتے مگر اس روز ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی سوجی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور بہت دیر تک نہیں نکلے۔

میمونہ کو تشویش ہونے لگی۔ اس نے سوچا' شاید سرمد بھائی مجھ سے خفا ہیں۔ وہ ارشد بھائی کے پاس چلی گئی۔ "وہ تو شاید مجھ سے بھی ناراض ہیں۔" ارشد بھائی نے اس کی فریاد سننے کے بعد کہا۔ "مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی انہوں نے۔"

"لیکن کیوں؟"

ارشد بھائی کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ "پچھلی بار جو ہم آنگن میں کرکٹ کھیل رہے تھے' یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ سرمد بھائی آؤٹ ہی نہیں ہو رہے تھے۔" میمونہ نے یاد کرکے کہا۔

"اور وہ آؤٹ نہیں ہوئے تھے مگر میں نے زبردستی آؤٹ لے لیا تھا۔ یاد ہے نا' میں نے کہا تھا۔۔۔ آپ بولڈ ہوگئے سرمد بھائی۔"

"ہاں' یہ تو ہے مگر مجھ سے کیوں ناراض ہیں وہ؟" وہ فکرمند ہو گئی۔

"او باؤلی تم نے ہی تو گواہی دی تھی کہ وہ بولڈ ہوئے ہیں۔" ارشد بھائی جوش کے عالم میں ہمیشہ اسے باؤلی کہتے تھے۔

"اوہ۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ پھر اب کیا کریں؟ سوری کہیں چل کر؟"

"یوں تو بے ایمانی کا پول کھل جائے گا۔ آئندہ بے ایمانی بھی نہیں کر سکیں گے ہم۔"

"تو نہیں کریں گے بے ایمانی۔"

"نہیں کریں گے تو دن بھر پڑی لگے گی۔ سرمد بھائی کو آؤٹ کون کرے گا؟"

"ہم کرکٹ ہی نہیں کھیلیں گے۔" میمونہ نے کہا۔ اسے کرکٹ سے اتنی دلچسپی بھی نہیں تھی۔

"واہ۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ اس الجھن میں پڑے تھے کہ آپی اور امی آ گئیں۔ "یہ تم دونوں سرگوشیوں میں کیا اسکیم بنا رہے ہو؟" آپی نے پوچھا۔

اس نے ارشد بھائی کو اور ارشد بھائی نے اسے دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنا مسئلہ دونوں بڑوں کے سامنے رکھ دیا۔

آپی اداسی سے مسکرائیں۔ "سرمد بھائی تم لوگوں سے ناراض نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "وہ بہت دکھی ہو رہے ہیں۔ انہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ گے تو ان کا دل بہلے گا۔ جاؤ ان کے پاس۔ کوشش کرو کہ وہ باہر آ



جائیں۔"

"کیا ہوا ہے سرمد بھائی کو؟"

"ان کی امی اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔" آپی نے کہا۔ "اور وہ خود کو اکیلا سمجھ رہے ہیں۔"

"اسی لئے خالہ امی نہیں آئیں۔" ارشد بھائی نے کہا۔

"اب خالہ امی اللہ میاں کے پاس سے کب آئیں گی؟" میمونہ نے پوچھا۔

"بیٹا' اللہ میاں کے پاس جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔" امی نے کہا۔ "تم لوگ سرمد کے ساتھ زیادہ وقت گزارو گے تو وہ اپنا غم جلدی بھول جائے گا۔ اچھی اچھی باتیں' ضدیں اور فرمائشیں کیا کرو اس سے۔ یوں اسے اپنائیت کا احساس ہو گا۔ دیکھو' اسے یہ خیال کبھی نہ ہونے دینا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔" وہ آپی کی طرف مڑیں۔ "یہ بات میں تم سے بھی کہہ رہی ہو شہلا۔ دیکھو' وہ بہت حساس لڑکا ہے اور دکھ تو آدمی کو یوں بھی بہت زود رنج کر دیتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں امی' آپ اس طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔" آپی نے کہا' پھر ان دونوں سے بولیں۔ "تم لوگ جاؤ نا۔ اور یوں سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔"

وہ دونوں سرمد بھائی کے کمرے میں گئے۔ وہ اپنی کتابیں میز پر اور الماری میں ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ "آؤ بھئی مونا۔۔۔ ارشد۔"

"آپ ہم سے ناراض ہیں سرمد بھائی؟" ارشد نے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیسے خیال آیا؟"

"آج آپ نے ہم سے بات ہی نہیں کی۔" میمونہ نے شکایت کی۔

"ارے۔۔۔ مصروفیت تھی پھر میں اب تو یہاں رہوں گا ہی۔ میں نے سوچا' کتابیں سیٹ کر کے تم سے باتیں کروں گا۔" سرمد بھائی نے کہا۔ "تمہیں کیسے لگے گا میرا یہاں رہنا؟"

"بہت اچھا۔" میمونہ نے چہک کر کہا۔ "آپ ہمیں ہر شام پارک لے کر چلا کریں۔ رات کو سوتے وقت کہانیاں سنایا کریں' کتنا مزہ آئے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اچھا تم چلو' میں کتابیں ٹھیک سے رکھ کر آتا ہوں۔"
"وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ کمرے کے درو
پر ہونے والی دستک نے میمونہ کو چونکا دیا۔ اس نے بدمزگی سے دروازے کو
خوشیوں کا یہی ہوتا ہے اس نے تلخی سے سوچا۔ یہ اندر ہوتی ہیں اور باہر سے
کوئی مداخلت ہو جاتی ہے۔ جیسے جھیل کے پرسکون پانی میں کوئی کنکر پھینک دے۔
دستک دوبارہ ہوئی تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "کون ہے بھئی' آ جاؤ نا۔"
دروازہ کھلا تو اختر کا چہرہ نظر آیا۔۔۔



"کزن مونا' میں اندر آ سکتا ہوں۔"
"آ تو گئے ہو پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟" میمونہ نے بھنا کر کہا۔
"پوچھ تھوڑا ہی رہا ہوں۔ میں تو بتا رہا ہوں کہ میں اندر آ سکتا ہوں۔ دستک
میں تاثیر نہ رہے تو میں اس فضول رسم کے خلاف بغاوت بھی کر سکتا ہوں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ بغیر دستک کے بھی اندر آ سکتا ہوں۔"
"زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"
"چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ تمہیں فری ہونے کا مطلب بھی معلوم نہیں۔
کھانا کھلانے کا بندوبست کرو' بہت بھوک لگی ہے۔"
میمونہ جل کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ انا بوا آ گئیں۔ "کھانا کھا لو تم دونوں۔"
"ابھی تو بھوک نہیں ہے۔" میمونہ نے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد۔۔۔"
"میں البتہ ابھی کھا لوں گا بوا۔۔۔ آپ کے بے حد اسرار پر۔"
"تم تو کھا ہی لو گے۔" بوا نے اختر سے کہا۔ پھر وہ میمونہ کی طرف مڑیں۔
"بٹیا' پراٹھوں کا لطف اسی میں ہے کہ توے سے اترتے جائیں اور آپ کھاتے
جائیں۔ ہاٹ پاٹ میں گرم تو رہیں گے لیکن پسیج کر خراب ہو جائیں گے۔"
"پسیج کر؟" اختر نے حیرت سے کہا۔ "کیا پراٹھوں کو بھی پسینہ آتا ہے؟"



"ارے بیٹا' یہ ساون کا مہینہ ہے۔ اس میں تو شعلوں کو بھی پسینہ آ جاتا ہے۔"
"واہ بوا واہ۔۔۔ واہ وا وا" اختر سر دھننے لگا۔ "کیا شاعرانہ بات کہی ہے۔ واہ
تم تو بدذوقوں کی صحبت میں بھی نہ بگڑیں بوا۔" یہ آخری بات اس نے کن
ے میمونہ کو دیکھتے ہوئے کہی۔
"ٹھیک ہے بوا' لے آؤ کھانا۔" میمونہ نے بے زاری سے کہا۔
"ہم تو کہتے ہیں' باورچی خانے میں بیٹھ کر کھاؤ کھانا۔ بارش بھی ہو رہی ہے مزہ
گا قیمہ بھرے پراٹھوں گا۔"
یہ سنتے ہی اختر تیزی سے اٹھا اور اس نے بوا کے دونوں کندھے تھام لئے۔
ے لئے بوا' اب ایک لمحے کی تاخیر نہ کرنا" وہ گڑگڑایا "بس مجھے جلدی سے
خانے میں لے چلو ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ جلدی چلو۔۔۔ کہاں ہیں وہ
ے پراٹھے۔ وہ میرے منتظر ہوں گے۔" اس نے بوا کو گھما کر ان کا رخ
کی طرف کیا اور انہیں اس طرف دھکیلنے لگا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی میمونہ مسکرا دی۔ "اچھے خاصے مسخرے ہو۔ کسی دن کسی
کے ہتھے چڑھ گئے تو پکے کامیڈین بن جاؤ گے۔"
"کزن مونا' بننے کی بات نہیں۔ میں پیدائشی کامیڈین ہوں۔۔۔ اور وہ بھی

میں نے ہزار بار منع کیا ہے کہ مجھے اس طرح نہیں پکارا کرو۔"
تمہیں کس پر اعتراض ہے۔۔۔ کزن پر یا مونا پر؟" اختر نے پلٹتے ہوئے پوچھا۔
ا باہر نکل چکی تھی۔ انہوں نے پکارا۔ "تم لوگ لڑ لینا۔۔۔ مگر کھانے کے

ونہ بھی ان دونوں کے پیچھے کچن کی طرف چل دی۔
نے ٹھیک کہا تھا۔ کچن میں بیٹھ کر کھانے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ کچن کی
، بارش کا نظارہ بھی ہو رہا تھا اور رم جھم کی آواز توے پر گھی میں پڑنے
وں کی چھن چھن کے ساتھ مل کر سماں سا باندھ رہی تھی۔ پراٹھوں کے

ساتھ قیمہ بھی تھا، چٹنی بھی اور اچار بھی۔ وہ گرم گرم پراٹھے کھاتے گئے اور پتا بھی نہیں چلا کہ زیادہ کھا گئے ہیں۔

"بس بھئی بوا، نیت تو بھرے گی نہیں---" اختر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور پیٹ پھٹ جائے گا۔" میمونہ نے ٹکڑا لگایا۔ "تم ایسے ہی بدنیت ہو۔"

"بدنیت نہیں، خوش نیت کہو۔" اختر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "مجھے جو چیز اچھی لگے، اس میں برکت ہوتی ہے۔ وہ پھلتی پھولتی ہے، پھٹتی نہیں۔"

میمونہ جھینپ گئی۔ "بس اب اٹھ جاؤ ورنہ پراٹھے پھل پھول گئے تو تمہیں کئی دن تک بھگتنا پڑے گا۔"

اختر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تو پانی کی گنجائش بھی نہیں رہی، ٹہلنا پڑے گا بہت دیر تک۔" پھر اس نے چونک کر کہا۔ "ارے واہ، بارش رک گئی۔"

دونوں کچن سے نکلے اور گارڈن کی طرف چل دیئے۔ وہاں کچھ پانی جمع ہو چکا تھا مگر درمیان میں جو سیمنٹ کا بنا ہوا پختہ راستہ تھا، اس پر چلا جا سکتا تھا۔ فضا اتنی اندھیری تھی کہ گارڈن کی روشنیاں بھی روتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

وہ پختہ راستے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چلتے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ پھر اچانک اختر نے کہا۔ "ہاں تو کزن مونا، میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہیں کزن کہہ کر پکارے جانے پر اعتراض ہے یا مونا پر ہے؟"

"مجھ دونوں پر اعتراض ہے۔"

"حالانکہ ایک آفاقی سچائی ہے اور دوسری دنیاوی سچائی۔"

"ذرا وضاحت بھی کر دو۔" میمونہ نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، جب تم پیدا ہوئیں تو جیسے اپنے ابا جان اور امی کی بیٹی تھیں، ویسے ہی میری کزن بھی تھیں۔ یہ آفاقی سچائی ہی تو ہوئی نا۔"

"ٹھیک ہے، ہم کزن ہیں لیکن اس کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کے دو جواب ہیں۔ میں پہلا جواب دیتا ہوں اگر وہ تمہیں مطمئن نہ کر



سکا تو پھر دوسرا جواب دوں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم اپنے ابا جان اور امی کی بیٹی تھیں۔ اس کے باوجود وہ زیادہ تر تمہیں بیٹی کہہ کر پکارتے تھے۔ تم نے کبھی ان سے کہا کہ اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بہت بھونڈا جواب ہے تمہارا--- اور میری توقع کے عین مطابق۔" میمونہ نے جل کر کہا۔ "ان دونوں رشتوں کا موازنہ تمہی کر سکتے ہو۔"

"تو اب دوسرا جواب سن لو۔" اختر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لفظ--- رشتہ کزن، دونوں ہی بہت رومینٹک معلوم ہوتے ہیں۔"

"یہ محض ایک تصور ہے--- خام خیالی! ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ اب میرا اور تمہارا تعلق ہی لو۔" میمونہ نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ کسی زاویئے سے بھی رومینٹک نہیں ہے۔"

"تمہیں نہیں لگتا ہو گا۔ مجھے لگتا ہے اور ہاں، مونا تو میں تمہیں ضرور کہوں گا۔"

"کیوں کہو گے، میرا نام میمونہ ہے۔"

"میمونہ مجھے بہت بڑا لگتا ہے، حلق میں پھنسنے لگتا ہے۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرا نام بگاڑو۔" میمونہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسے بگاڑنا نہیں، سنوارنا کہتے ہیں۔" اختر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "مونا کتنا مختصر، رواں اور خوب صورت لگتا ہے۔"

"میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے اس طرح پکارے۔"

"مگر انا بوا پکارتی ہیں۔"

"ان کی اور بات ہے، انہیں میں روک نہیں سکتی۔"

"روک تو مجھے بھی نہیں سکتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن آئندہ اس طرح پکارو گے تو میں جواب ہی نہیں دوں گی اور تم سے کبھی بات بھی نہیں کروں گی۔"

اختر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔ "میمونہ، تم مجھ

سے چڑتی کیوں ہو؟"

"تم سے نہیں، تمہاری باتوں سے چڑتی ہوں میں۔"

"میں مسخرہ نہیں ہوں، ایک سنجیدہ آدمی ہوں۔" اختر کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ مجھے مسخرہ بننے کا شوق نہیں مگر میں تم سے جو باتیں کرنا چاہتا ہوں، کر نہیں سکتا۔ جانتا ہوں کہ تم انہیں سننا نہیں چاہتیں۔ مجبوراً مسخرہ بن جاتا ہوں۔ یہ اظہار کی ایک کچلی ہوئی شکل ہے میمونہ بیگم۔ تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ مسخرہ پن کرتے ہوئے کتنی اذیت ہوتی ہے مجھے۔"

میمونہ کو اس پر ترس آنے لگا۔ "جب معلوم ہے تو یہ سب کیوں کرتے ہو؟"

"معلوم نہیں ہے، محسوس کرتا ہوں جیسے تمہیں بھی کچھ معلوم نہیں، محسوس کرتی ہو اور اس کے مطابق ری ایکٹ کرتی ہو۔ یہ سب ان کہی باتوں کا فساد ہے۔"

"تو ختم کر دو یہ سب۔"

"اب میں یہ کہوں کہ نہیں کر سکتا، دل کے ہاتھوں مجبور ہوں تو یہ گھسا پٹا مکالمہ کہلائے گا۔ مگر یہ سچ ہے۔ میں بہت خوددار ہوں میمونہ بیگم اور خوددار آدمی کبھی کسی طلب کا اسیر ہو جائے تو بڑے عذاب اٹھاتا ہے۔ وہ دل کی بات کہنے کے بجائے اندازے لگانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ انکار سے ڈرتا ہے۔ امید سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔ ایسا خوف زدہ آدمی مسخرے پن کے سوا کیا کر سکتا ہے؟"

میمونہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اختر اس قدر حساس ہے۔

"مگر آج میں ہر خوف کو جھٹک کر تمہیں بتا رہا ہوں میمونہ بیگم کہ مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ ایسی اور اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں اور میں آج تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

میمونہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ سن ہو کر رہ گئی۔ ان میں سے کوئی بات بھی اس کے لئے انکشاف نہیں تھی۔ وہ پہلے سے جانتی تھی مگر اس سنجیدگی اور شدت کا اسے ندازہ نہیں تھا۔ پھر گفتگو نے اتنی تیزی سے رخ بدلا تھا اور بات اتنی اچانک ہوئی نی کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔



"جانتی ہو، میں تمہیں کزن مونا کیوں کہتا تھا؟"

میمونہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اب بھی گنگ تھی۔

"یہ دو لفظ میرا اظہار تھے۔ آئی لو یو میمونہ کا متبادل تھے میرے لئے۔ جذبوں کو پن سے بچاتے تھے۔ آج تم نے انہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ اب تو میں تم سے ں گا میمونہ بیگم کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم مجھ سے شادی کرو گی میمونہ بیگم؟ ب دو مجھے۔"

میمونہ کو جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر بت بنا دیا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہی اندر طوفان بھی اٹھ رہے تھے لیکن نہ وہ ہل سکتی تھی، نہ بول سکتی تھی۔

"جواب دو میمونہ بیگم۔ آج تو تم نے پنڈورا کا بکس کھول دیا ہے۔"

ٹھیک تو ہے، میمونہ نے سوچا۔ یہ تو واقعی پنڈورا کا بکس کھول دیا۔ وہ جانتی تھی ختر کیا چاہتا ہے، لیکن سننے سے بچی ہوئی تھی۔

"جواب دو نا میمونہ!"

"سوری اختر!" میمونہ نے بہت دھیرے سے کہا۔

اس سوری میں بہت کچھ تھا۔ ایک جہان معانی آباد تھا اس ایک لفظ میں۔ دکھ، معذرت۔۔۔

"یہ سوری کس سلسلے میں ہے؟" اختر سمجھ گیا تھا مگر آس کی ڈوری ہاتھ سے وڑنا چاہتا تھا۔

"میں تمہیں محبت سے نہیں روک سکتی لیکن تم سے شادی بھی نہیں کر

"کیوں؟"

"میں اس سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔" میمونہ نے خشک لہجے میں

"میں تم سے جواب طلبی نہیں کر رہا ہوں۔ میں بس جاننا چاہتا ہوں، مجھ میں نا، کوئی کمی ہے جو میں تمہیں اچھا نہیں لگتا، یا کوئی اور بات ہے؟"

"تو پھر مجھ سے پیچھا بھی نہیں چھوٹے گا۔" اختر نے کہا۔ "میں بچہ نہیں ہوں میمونہ مگر بہت کچھ ایسا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب یہ مونا والا معاملہ ہی لے لو' جس میں تم اتنی Touchy ہو۔ کون کہتا ہے تمہیں مونا؟ مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔ پھر تم میرے منہ سے یہ لفظ کیوں نہیں سننا چاہتیں۔ کوئی یاد آتا ہے یہ سن کر؟ مگر کون؟ کوئی اسکول میں ہے تمہارے؟ میرا خیال ہے' نہیں۔ اندازے سے پتا چلتا ہے کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو۔ مگر مجھے کوئی ایسا شخص تمہارے اردگرد نظر نہیں آتا۔ مگر یہ سچ ہے ورنہ تم مجھے مسترد نہ کرتیں۔ یہ میری خوش فہمی نہیں' حقیقت ہے کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں لیکن میں شادی نہیں کر سکتی تم سے۔"

"تم مجھے وجہ بتا دو' مجھے اس شخص کا نام بتا دو' جسے تم مجھ پر ترجیح دے رہی ہو۔ پھر میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔"

"بس تو میں تمہیں پرپوز کرتا رہوں گا۔" اختر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اور میں انکار کرتی رہوں گی۔" مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"مجھے تو پڑے گا۔ میں نسبتاً خوش رہوں گا۔" اختر نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا۔ اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔ میمونہ تاسف بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ اسے کیسے سمجھاتی---- کیا بتاتی۔ وہ خود بھی اتنی آسانی سے نہیں سمجھتی تھی۔

وہ وہیں بیٹھی رہی۔ آسمان پر تنی گھٹا کی چادر پھٹی اور پورے چاند نے چادر میں سے سر نکال کر دنیا کو دیکھا۔ دنیا روشن دیکھ کر دل کیسے خوشی سے بھر جاتا ہے۔ آدمی خوش نہ ہو تو بھولی بسری خوشیاں یاد آنے لگتی ہیں۔ کیسا جادو ہے چاند میں۔

ستارے بھی نکل آئے تھے۔ آسمان کی درہم برہم محفل پھر سج رہی تھی۔ گو عجیب بات تھی کہ آسمان بھی بھیگا بھیگا لگ رہا تھا' جیسے بارش آسمان پر بھی ہوئی ہو۔ چاندنی بھی ٹھٹھری اور بوجھل بوجھل تھی۔

میمونہ نے سر جھکایا اور گردوپیش کا جائزہ لیا۔ آدمی کو کتنا ہی کچھ مل جائے' وہ



اسے کبھی نہیں بھولتا' جو اس سے چھن گیا ہو۔ یہ بنگلا بہت بڑا تھا۔ ظاہر ہے اس میں اسکول بھی تھا۔ نیچے کے تین کمرے تھے جو اس نے اپنے استعمال کے لئے رکھے تھے۔ مگر کچھ بھی ہو' یہ وہ گھر نہیں تھا جو اس کی برسوں کی یادوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس بنگلے کا باغیچہ بہت بڑا تھا--- اور اس نے اسے اسی انداز میں ترتیب دینے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی یہ اس کے گھر کا چھوٹا سا باغیچہ نہیں تھا' جہاں محبت کی محفلیں سجتی تھیں۔ یہاں تو وہ اکیلی تھی--- اور اداس---وہ گھر اور وہ باغیچہ تو وقت نے اس سے چھین لیا تھا۔

وہ کھوئی کھوئی سی' کہیں پیچھے--- بہت پیچھے نکل گئی۔ وہ اسی گھر میں--- اسی باغیچے میں پہنچ گئی تھی۔



یہ وہی آنگن تھا جس میں چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ وہی باغیچہ جہاں کبھی درد کے پھول مہکے تھے۔ جہاں خوشیوں کی دھنک کا انتظار کیا جاتا تھا مگر وہ دھنک کبھی نہیں نکلی۔

شام ہوتی تو دھوپ آنگن سے ڈیرا اٹھاتی اور اندھیرے دھیرے دھیرے رینگتے آتے اور آنگن کو پرچھائیوں سے بھرنے لگتے۔ وہ بہت اداس کر دینے والا وقت ہوتا۔ ہاں کبھی سب لوگ مل بیٹھتے تو وہیں خوشیوں کا وقت بھی ہوتا مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ اصل میں سب کچھ سرمد بھائی سے مشروط تھا۔ اتنے ہی اہم تھے وہ کہ ہوتے تو در و دیوار پر خوشیاں ناچتیں' نہ ہوتے تو اداسی ہی اداسی ہوتی۔ بھرے پرے گھر کے لئے کوئی ایک شخص اتنا اہم بھی ہو سکتا ہے' یہ بات میمونہ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔

سرمد بھائی کی صبح بہت جلد ہوتی۔ کس وقت' یہ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ میمونہ کو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ اور ارشد بھائی اسکول کی تیاری کر رہے ہوتے تو سرمد بھائی گھر آتے۔ وہ سائیکل ایک طرف کھڑی کرتے' پیشانی سے پسینہ پونچھتے اور باتھ روم میں گھس جاتے۔

امی اور آپی میز پر ناشتا لگاتیں' امی پکارتیں "آ جاؤ بچو' ناشتا لگ گیا ہے۔"

نہ جانے کیوں میمونہ کو خوشی ہوتی کہ ابو ناشتا دیر سے کرتے ہیں کیونکہ وہ دفتر دیر سے جاتے تھے۔ ابو کی موجودگی میں فضا بوجھل سی رہتی۔ سرمد بھائی خاص طور پر ہمیشہ کھسیائے ہوئے رہتے تھے۔ ان سے ٹھیک سے کھایا بھی نہیں جاتا تھا۔ کھاتے تو وہ ویسے بھی بہت ہی کم تھے۔

میمونہ اور ارشد اپنی کرسیوں پر جا بیٹھتے۔ لیکن میمونہ کہتی "میں سرمد بھائی کے بغیر ناشتا نہیں کروں گی۔"

"بیٹا--- اسکول کو دیر ہو جائے گی۔" امی سمجھاتیں۔

"بس سرمد بھائی کو بلائیں۔"

"سرمد--- بھئی سرمد آ جاؤ۔" امی باتھ روم کی طرف رخ کر کے پکارتیں۔

سرمد بھائی گھبرائے ہوئے باہر آتے۔ "کیا بات ہے خالہ امی؟"

"بھئی یہ میمونہ ناشتا ہی نہیں کرتی تمہارے بغیر۔"

سرمد بھائی آکر بیٹھ جاتے۔ "مونا، تم ناشتا کر لیا کرو، مجھے دیر ہو جاتی ہے۔"

"میں نہیں کروں گی ناشتا آپ کے بغیر۔"

سرمد بھائی ناشتے پر بیٹھ جاتے۔ بے دلی سے کچھ ٹونگتے رہتے۔ آپی انہیں چپکے چپکے تکتی رہتیں۔ امی کہتیں "سرمد--- یہ بالائی لو نا۔"

"لی تو ہے خالہ امی۔"

"ارے اچھی طرح کھایا کرو۔ اس عمر میں تو بھوک بھی بہت لگتی ہے۔" سرمد بھائی مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ وہ اچھی طرح کھاتے ہی نہیں تھے کبھی۔

ایک دن میمونہ نے آپی سے پوچھا۔ "آپی--- سرمد بھائی صبح صبح کہاں جاتے ہیں؟"

"اپنے دماغ کا علاج کرانے۔" آپی نے اداسی سے کہا۔

"کیا سرمد بھائی کا دماغ خراب ہے؟"

"ہاں، خراب نہ ہوتا تو صبح سویرے دوسروں کے ہاں اخبار ڈالتے۔"

میمونہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اخبار ڈالنا کیا ہوتا ہے اور اس کا دماغ کی خرابی سے کیا تعلق ہے۔ "تو اخبار کیوں ڈالتے ہیں سرمد بھائی؟"



"پیسے کمانے کا شوق ہے۔ خوددار ہیں۔" آپی اور اداس ہو جاتیں۔

ایک دن امی بڑبڑا رہی تھیں۔ "عجیب ہے یہ لڑکا۔ غیریت برتتا ہے۔ اسکول کی فیس تک نہیں لیتا۔ ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاتا، کیا کروں؟"

میمونہ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آتی تھی مگر وہ یہ جانتی تھی کہ سرمد بھائی گھر میں ویسے نہیں رہتے، جیسے دوسرے رہتے ہیں۔ امی، آپی، ابو، ارشد بھائی اور وہ خود۔

رات کا کھانا سب ساتھ ہی کھاتے تھے۔ یہ وہ وقت ہوتا جب ابو بھی کھانے کی میز پر ہوتے۔ یہ بات میمونہ کی سمجھ میں بھی آتی کہ ابو کی موجودگی میں سرمد بھائی بہت زیادہ گھبراتے تھے۔ ان سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ جیسے تیسے چار چھ لقمے لے کر وہ ہاتھ کھینچ لیتے۔ کبھی ابو ہی انہیں ٹوک دیتے۔ "یہ کیا میاں--- تم نے تو کھانا کھایا ہی نہیں۔"

"نہیں خالو جان۔ اچھی طرح کھایا ہے۔ بھوک ہی اتنی تھی۔" سرمد بھائی کہتے۔

"ارے میاں، اس عمر میں تو بھوک بہت لگتی ہے، تم تکلف کرتے ہو۔"

"یہ بات نہیں خالو جان۔" سرمد بھائی گھبرا کے کہتے۔

ایک دن ابو نے سرمد بھائی کے میز سے اٹھنے کے بعد امی سے کہا۔ "صغیرہ--- سرمد کا خیال رکھا کرو۔ یہ تو نشوونما کی عمر ہوتی ہے۔ اس میں خوراک کی بڑی اہمیت ہے۔"

"سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ ڈھنگ سے کھاتا ہی نہیں--- خوددار بھی بہت ہے۔" یہ کہتے کہتے امی کے لہجے میں فخر در آتا۔ "کچھ یہ بھی ہے کہ ابھی مانوس نہیں ہوا ہے۔ مانوس ہو گا تو اسے اپنا گھر سمجھنے لگے گا۔"

رات کے کھانے کے بعد ابو ہمیشہ اپنے کمرے کا رخ کرتے۔ آپی کھانے کی میز پر سے برتن اٹھا کر کچن میں لے جاتیں۔ پھر واپس آکر میز صاف کرتیں۔ امی پھر کچن میں چلی جاتیں۔ سب کو معلوم ہوتا کہ اب وہ چائے بنائیں گی اور پھر چائے لے کر ابو کے کمرے میں جائیں گی، پھر وہ وہاں کچھ دیر بیٹھیں گی بھی۔

میمونہ چونکی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوند اس کے ہاتھ پر آ کر گری تھی۔ اس ن
چونک کر آسمان کو دیکھا تھا۔ کالی گھٹا نے پھر چاند کو نگل لیا تھا۔ موسم کے تیور بتار
تھے کہ بارش اور ہو گی۔ دیکھا جائے گا' بارش ہی اٹھائے تو اٹھوں گی' میمونہ ن
سوچا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میمونہ بے پروا بیٹھی تھی۔ وہ پھر یادوں
چلی گئی۔ اب وہ پھر اسی گھر میں تھی' جو اس سے چھن گیا تھا۔

"کیوں بھئی! آنگن میں نہیں چلو گے؟" آپی نے میز صاف کرنے کے بعد کہا
یہ دعوت کون مسترد کر سکتا تھا۔ "چلیں آپی!" میمونہ بولی۔

تینوں بہن بھائی آنگن میں چلے آئے۔ آنگن میں ہی چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ آ
ویسے بھی خوب صورت چیز ہوتا ہے مگر ان کے گھر کے آنگن کا ماحول بہت ہی
تھا۔ شاید باغیچے کی وجہ سے۔ بیلے اور چنبیلی کی ملی جلی خوشبو جادو سا کر رہی تھی۔

"سرمد بھائی کو بھی تو بلائیں۔" میمونہ نے کہا۔

"پھر وہی سرمد بھائی؟ تم لوگ مانتے نہیں۔" آپی نے ڈانٹا۔ یہ سلسلہ بہت
سے چل رہا تھا۔

"آپی؟"

"تم سے اتنے بڑے ہیں وہ اور تم لوگ نام لیتے ہو ان کا۔" آپی کو غصہ آ

"تو اور کیا کہیں آپی؟" ارشد نے کہا۔

"بھائی جان نہیں کہہ سکتے کیا؟"

"آپ بھی تو نہیں کہتیں بھائی جان۔ نام لیتی ہیں ان کا۔" میمونہ نے اعتر
اٹھایا۔

"ہم تو کچھ بھی نہیں کہتے انہیں۔" آپی گڑبڑا گئیں۔ "ویسے بھی وہ ہم
بڑے تھوڑا ہی ہیں۔"

"بھائی جان کہنا اچھا نہیں لگتا۔" ارشد بولا۔ "اتنا اچھا نام ہے سرمد بھائی کا"

"ہاں--- نام تو بہت پیارا ہے۔" آپی کھو سی گئیں۔ پھر انہیں دوبارہ غص
گیا۔ "تم لوگ یوں نہیں مانو گے۔ کسی دن وہ تم سے خفا ہو جائیں گے اس با



کہانیاں بھی نہیں سنائیں گے۔"

"سرمد بھائی ہم سے خفا ہو ہی نہیں سکتے۔" میمونہ نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے آج ہی لو۔" آپی نے دھمکی دی۔ "میرا وعدہ ہے کہ اب تم نے ان کا نام لیا تو انہیں کبھی تم سے بات بھی نہیں کرنے دوں گی۔"

"واہ--- آپ کا زور چلتا ہے کیا؟" ارشد نے کہا' مگر اس کا لہجہ کمزور تھا۔

"دیکھ لینا۔ پتا چل جائے گا۔"

"اچھا آپی' اب میں انہیں بھائی جان ہی کہوں گی۔" میمونہ گھبرا کر مان گئی۔

ارشد نے منہ بنا کر اسے دیکھا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے آپی۔"

آپی کہیں کھو گئیں۔ وہ تھیں بھی کم گو ہی۔ البتہ سرمد کی موجودگی میں ان کی آنکھیں خوب بولتی تھیں اور جب سرمد بھائی موجود نہ ہوتے تو وہ بڑی شدت سے خاموش رہتیں۔ میمونہ اور ارشد البتہ خوب بولتے۔ اس بولنے کے نتیجے میں زیادہ تر لڑائی ہی ہوتی تھی۔ آپی ان کی نوک جھونک سے بے خبر کچھ سوچتی رہتیں' کچھ دیکھتی رہتیں۔ ارشد اور میمونہ نے بارہا وہی کچھ دیکھنے کی کوشش کی جو آپی دیکھتی تھیں مگر ان دونوں کو کبھی کچھ نظر نہیں آیا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ آپی سوچتی رہیں اور ارشد اور میمونہ آپس میں الجھتے رہے۔ "دیکھیں آپی' اس میمونہ کی بچی کو۔ یہ مجھے الو کہہ رہی ہے۔" ارشد نے آپی کو ثالث بنانا چاہا۔

"تو آپی' یہ میرے بال کھینچ رہے ہیں۔" میمونہ نے صفائی پیش کی۔

آپی نے چونک کر پہلے انہیں اور پھر چاروں طرف حیرانی سے دیکھا۔ "کیا--- کیا ہوا؟"

"یہ آپی' مجھے الو---"

"یہ میرے بال کھینچ---"

"چلو' اب اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔" آپی نے مقدمے کا اور ہی طرح کا فیصلہ سنایا۔

"مگر ابھی تو ہم آئے ہیں آپی۔ دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔" ارشد نے احتجاج کیا۔

"کہا نا بس اب جا کر سو جاؤ۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔" آپی کا لہجہ نر
تھا۔

ارشد اور میمونہ جانے کے لئے اٹھے۔ "آپ بھی چلیں نا آپی!"

"تم لوگ چلو میں آ جاؤں گی۔"

"ہمیں ڈر لگے گا آپی۔"

"لو' اپنے گھر میں بھی کوئی ڈرتا ہے؟" آپی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"رات کے وقت بھوت اور چڑیلیں دندناتے پھرتے ہیں۔" ارشد نے شان سے کہا۔

"ہمارے گھر میں بھوت اور چڑیل کا کیا کام۔ ہاں' ہمارے ہاں پریاں ہیں۔" آپی بولیں۔

"پھر بھی آپی ڈر لگتا ہے۔" میمونہ منمنائی۔

وہ دونوں آپی کے کمرے میں ان کے ساتھ ہی سوتے تھے اور یہ ڈرنے کا بس بہانہ ہی تھا۔ وہ تو بہت نڈر اور شرارتی بچے تھے۔

کبھی آپی بھی اٹھ جاتیں۔ "اچھا چلو" وہ جھنجلا کر کہتیں۔ "یہاں ذرا دیر بھی نہیں سکتے ہم۔" اور کبھی وہ بیٹھی رہتیں "کہا نا' تم لوگ جاؤ۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔" وہ زور دے کر کہتیں۔ ان دونوں کو اٹھنا پڑ جاتا۔

وہ اندر جاتے جاتے رکتے' ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر پلٹ کر واپس آتے اور چھپ کر آپی کو دیکھتے۔ آپی عموماً سر جھکائے خاموش بیٹھی ہوتیں مگر ان کے چہرے کے تاثرات پل پل بدلتے رہتے۔

مگر ہر روز یہی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ کسی روز معاملہ مختلف ہو جاتا۔

وہ تینوں آنگن میں بیٹھے ہوتے۔ بھائی جان کمرے میں ہوتے۔ آپی حسب معمول سوچ رہی ہوتیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑنے میں اور آپی کو ناراض بنانے کی کوششوں میں مصروف ہوتے۔ سوچتے سوچتے اور کچھ دیکھتے دیکھتے اچانک آپی کے ہونٹ خودبخود تھرکتے اور پھر چپکے سے ایک مسکراہٹ کی کلی ان پر کھل جاتی اور چند لمحوں میں جیسے چٹک کر پھول بننے لگتی۔



میمونہ اب بھی اس مسکراہٹ کو یاد کر کے اداس ہو جاتی تھی۔ اتنے برس ہو گئے مگر اس نے ایسی جادو بھری مسکراہٹ کبھی کسی اور کے ہونٹوں پر نہیں دیکھی تھی۔ وہ مسکراہٹ تو ہمیشہ سماں ہی بدل دیتی تھی۔

اس مسکراہٹ کے پھول بنتے بنتے آپی کے ہونٹ دھیرے سے کھلتے "ارے بھئی۔ تم لوگ کہانی نہیں سنو گے آج؟" وہ بہت آہستہ سے کہتیں۔

"تو سنایئے نا۔" ارشد نے جلدی سے کہا۔

"نہیں ارشد بھائی۔ مجھے نہیں سننی کہانی۔" میمونہ نے جھٹ اختلاف کا حق استعمال کیا۔

"تم چپ رہو جی۔" ارشد بھائی بڑا ہونے کے ناتے اس پر رعب جھاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

"کیوں چپ رہوں؟" لڑاکا میمونہ فوراً لڑنے کے لئے تیار ہو گئی۔ "آپی اچھی کہانی نہیں سناتیں۔"

"تو تم نہیں سنو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔"

آپی مسکرائیں۔ "نہیں بھئی ارشد' کہتی تو مونا ٹھیک ہی ہے۔ ہمیں واقعی کہانی سنانی آتی ہی نہیں۔"

"تو پھر؟" ارشد بھائی پریشان ہو گئے۔

"تو کہانی سننا ضروری ہے کیا۔" آپی نے انہیں چڑھانے کے لئے کہا۔ "دنیا میں کروڑوں انسان کہانی سنے بغیر بھی جی رہے ہیں۔"

"جینے دیں انہیں۔ ہمیں تو بس کہانی سننی ہے۔" ارشد بھائی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"واقعی آپی' مزہ ہی نہیں آتا کہانی کے بغیر۔" میمونہ بھی تائید کرنے پر مجبور تھی۔ "کتنے دن ہو گئے کہانی سنے۔"

"اب بھئی یہ تمہارا مسئلہ ہے تمہی حل کرو۔" آپی نے بے نیازی سے کہا۔

ارشد اور میمونہ سعادت مندی سے سوچنے لگے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے۔ "بھائی جان تو اپنے کمرے میں ہیں۔" ارشد بڑبڑایا۔

"آپی' یہ بھائی جان اپنے کمرے میں کیا کرتے رہتے ہیں؟" میمونہ نے نکتہ اٹھایا۔

"پڑھتے ہیں۔"

"اور دن میں تین بار گھر سے باہر بھی جاتے ہیں۔" میمونہ بہت جرح کرنے والی تھی۔ "وہ بھی پڑھنے کے لئے؟"

"تین بار تو اسکول نہیں جاتے۔ ایک ہی بار تو جاتے ہیں۔" آپی نے کہا۔

"اچھا چلیں' صبح کو اخبار ڈالنے جاتے ہیں تو پھر شام کو کہاں جاتے ہیں؟"

"شام کو پڑھانے جاتے ہیں۔ تم وکیل بنو گی بڑی ہو کر۔" آپی بھنا گئیں۔

یہ مونا کے ارتکاز کا کمال تھا کہ وہ ضمنی باتوں میں نہیں الجھتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ وکیل کیا ہوتا ہے۔ وہ اصل بات کبھی نہیں بھولتی تھی۔ "جب خود پڑھ رہے ہیں تو پڑھاتے کیسے ہیں۔" اس نے کہا۔ "پڑھانے والے تو سر کہلاتے ہیں۔ بہت بڑے ہوتے ہیں وہ۔"

"ارے دن میں جو پڑھتے ہوں گے' شام کو وہی پڑھاتے ہوں گے۔" ارشد بھائی نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں بھئی' جو پچھلے سال پڑھا تھا' وہ اس سال پڑھاتے ہیں۔" آپی نے وضاحت کی۔

"کیوں؟"

"تاکہ پچھلا پڑھا ہوا بھول نہ جائیں۔" آپی نے جھنجلا کر کہا۔ "توبہ ہے۔ دماغ چاٹ لیتے ہو تم لوگ۔"

"تو آپی' اگر بھائی جان شام کو پڑھانے کے بجائے پچھلے سال کا سبق گھر پر یاد کر لیا کریں تو کہانی سنانے کا وقت بھی مل سکتا ہے۔" میمونہ نے خوب سوچ سمجھ کر کہا۔

"آدھے پاگل ہیں تمہارے بھائی جان۔ کسی کو اپنا سمجھتے ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے آپی کا لہجہ بہت پیارا ہو گیا۔ "وہ کسی کا احسان لیتے ہی نہیں۔"

میمونہ آپی کے چہرے کو' ان کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ آپی کی آنکھیں ایسے



انداز میں چمک رہی تھیں جیسے ارشد بھائی کی آنکھیں اس وقت چمکتی تھیں جب وہ کوئی تتلی پکڑ کر لاتے اور دیر تک اتراتے۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کہانی کیسے سنیں؟" ارشد بھائی کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔" آپی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" میمونہ اور ارشد بھائی بیک آواز بولے۔

"وعدہ کرو کہ ہمارا نام نہیں لو گے تو بتائیں۔"

"وعدہ پکا وعدہ۔" ان دونوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو یوں کرو کہ جا کر بھائی جان کو بلا لاؤ۔"

"لیکن وہ پڑھ رہے ہوں گے۔" میمونہ نے اعتراض کیا۔

"تو انہیں سمجھاؤ کہ ہر وقت پڑھتے رہنے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔"

"واہ--- بھائی جان کی آنکھیں کیوں خراب ہوں۔ اتنی تو پیاری ہیں ان کی آنکھیں۔ ہے نا آپی؟" میمونہ نے لہک کر کہا۔

"ہاں' بہت پیاری ہیں۔" آپی کی نظریں جھک گئیں۔ "اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ انہیں بہت زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے۔"

"میمونہ سوچنے لگی۔ "یہ تو ٹھیک کہتی ہیں آپ--- لیکن وہ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ انکار تو نہیں کریں گے؟"

"ارے--- انہیں انکار کرنا آتا ہی کب ہے اور ناراض ہونے والے بھی نہیں وہ---" آپی نے اسے یقین دلایا۔

"آپ بہت مطلبی ہیں آپی۔ ویسے تو ہمیشہ ڈراتی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو' بھائی جان خفا ہو جائیں گے' وہ نہ کرو بھائی جان ناراض ہو جائیں گے اور اب کہہ رہی ہیں کہ وہ ناراض ہوتے ہی نہیں اور انکار بھی نہیں کرتے۔"

"اچھا' زیادہ علامہ نہ بنو اب۔ کہانی سننی ہے تو جاؤ۔ لیکن پھر کہہ رہے ہیں' ہمارا نام نہ لینا۔" آپی نے جھنجلا کر کہا۔ "کہانی تمہیں سننی ہے' ہمیں نہیں۔"

وہ دونوں بھائی جان کے کمرے میں چلے گئے۔ بھائی جان کو پتا بھی نہیں چلا کہ

وہ آئے ہیں۔ پڑھتے ہوئے ان کا انہماک ایسا ہی ہوتا تھا۔

"بس کریں بھائی جان۔ اتنا نہ پڑھا کریں۔" ارشد نے کہا۔

بھائی جان نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "کیوں بھئی؟ پڑھنا تو بہت ضروری ہے۔"

"لیکن اتنا زیادہ نہیں۔" میمونہ بولی۔ "اتنی پیاری آنکھیں ہیں آپ کی۔ خراب ہو جائیں گی۔"

"اوہو--- تو مونا مکھن لگا رہی ہے ہمیں۔"

"جی نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا--- تو نہیں پڑھتے۔" بھائی جان نے کتاب بند کر دی۔ "اب کیا کریں؟"

"ہمارے ساتھ آنگن میں چلیں۔" ارشد بولا۔

"چلو---" بھائی جان اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اے مون--- کیا چاہتی ہو تم؟ صبح کر دو گی یہیں۔" انا بوا نے پکارا۔

میمونہ نے چونک کر انہیں دیکھا مگر نہیں دیکھا۔ وہ ابھی تک اپنی اسی دنیا میں تھی۔ ہاں انا بوا کی آواز اسے آ رہی تھی۔

"ارے کب سے بھیگ رہی ہو۔ بیمار پڑنا ہے کیا؟" انابوا نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

اس بار میمونہ کو احساس ہوا کہ وہ واقعی بھیگ رہی ہے۔ بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر کب سے وہ پھوار میں بیٹھی بھیگ رہی تھی۔ کپڑے تر ہو چکے تھے۔ وہ اٹھی تو اسے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا۔

"پتا نہیں خبط الحواسی میں کس پر پڑی ہو تم؟" بوا کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

"اپنے آپ پر پڑی ہوں بوا۔" میمونہ نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔



وہ جھیل سیف الملوک کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ کبھی جھک کر نازک سا کوئی پھول توڑتی اور کبھی کوئی رنگین پتھر اٹھا لیتی۔ وہاں پتھر ایسے بھی تھے کہ نگینے



لگتے تھے۔ پیالہ نما جھیل کا سکوت خوف کا احساس دلاتا تھا۔

اچانک جلترنگ جیسی موسیقی شروع ہو گئی۔ یوں جیسے پس منظر موسیقی ہو۔ اس کے قدم اس موسیقی سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ خود کار انداز میں۔ ذرا دیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک کرخت آواز ابھری "اٹھ بھی جاؤ نا بیٹا۔ اے مون اٹھ جاؤ۔"

سیف الملوک کے کنارے چلتی ہوئی میمونہ کو جھٹکا لگا۔ وہ سنبھل نہ سکی۔ گلیشیر پر سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ جھیل کی طرف لڑھکنے لگی۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ موت یقینی تھی۔ البتہ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ مرے گی کس طرح--- ڈوب کر یا برف جیسے ٹھنڈے پانی میں ٹھٹھر کر---

وہ جھیل میں گرنے ہی والی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے انا بوا نظر آئیں جو دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جنگجویانہ انداز میں کھڑی تھیں۔ "اچھا ہی کیا جو اٹھ گئیں۔ ورنہ ہم تمہیں بڈباتھ دے دیتے۔" وہ بولیں۔

میمونہ ابھی پوری طرح نہیں جاگی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ بڈ باتھ کیا ہوتا ہے بوا؟"

"اتنی انگریزی بھی نہیں سمجھتیں۔" بوا نے کہا۔ "بڈٹی تو خوب سمجھتی ہو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

"بڈباتھ تو میں اب بھی نہیں سمجھی۔" میمونہ نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"بستر پر چائے مل سکتی ہے تو کیا غسل نہیں مل سکتا۔"

میمونہ کو ہنسی آ گئی۔ "تو اب تم ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دوسرے میں ٹھنڈے پانی کی بالٹی لے کر مجھے جگانے آیا کرو گی۔ ویسے بوا' یہ بیڈ باتھ کا آئیڈیا اچھا ہے۔"

"اے ہمیں کیا پتا تھا تمہارے ساتھ رہ کر انگریزی کی گٹ پٹ بھی آ گئی۔" بوا نے بھنا کر کہا۔ "اور اب یہ منحوس الارم بند کرو۔"

اب میمونہ کو الارم کا خیال آیا۔ سرہانے رکھی ہوئی ٹائم پیس چلائے جا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کر دیا۔ ”بوا‘ ویسے تو تمہاری بڑی پیاری آواز ہے۔“ اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لے کر کہا۔ ”لیکن صبح سویرے اتنی کرخت لگتی ہے۔ ایسا کیوں؟“

”ہم جان بوجھ کر کرخت بناتے ہیں ورنہ تم اٹھنے کے بجائے ہماری پکار کو لوری سمجھ کر اور گہری نیند سو جاؤ۔“ بوا بولیں۔ ”اور یہ تمہارا الارم۔۔۔“ ان کے لہجے میں حقارت در آئی۔ ”یہ کسی سوتے کو اٹھا سکتا ہے بھلا؟“

”یہ تو بوا بیک گراؤنڈ میوزک کے لئے ہے۔ خواب کو فلم بنا دیتا ہے۔“

”ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس سے اٹھتی نہیں ہو تو اسے لگاتی کیوں ہو؟“

”تمہارے لئے لگاتی ہوں بوا۔ تاکہ تم الارم کی آواز سنو اور مجھے اٹھا دو۔“

”تو الارم لگانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں ویسے ہی جگا دیں گے۔“

”نہیں بوا۔ تم تو سوتی ہی نہیں ہو۔ ہمیں آدھی رات کو جگا دیا کرو گی۔“

”اچھا اب اٹھ جاؤ۔“ ہم ناشتا لگا رہے ہیں۔ اسکول کا وقت ہونے والا ہے۔“ بوا نے چائے کی خالی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

میمونہ اٹھی اور باتھ روم کی طرف لپکی۔ پانچ منٹ باتوں میں ضائع ہو گئے تھے۔





اسکول کیا تھا‘ وہ میمونہ کا خواب تھا۔

وہ پرائمری اسکول تھا۔ نرسری اور کے جی کلاسز میمونہ نے اپنے ذمے لی تھیں۔ ان میں بہت چھوٹے بچے تھے۔ ان کلاسز میں بوا اس کی مدد کرتی تھیں۔ بوا کے تو مزے آگئے تھے۔ اب انہیں ان کے کھوئے ہوئے بچے ہر سال ملتے تھے۔ کسی بچے کو حاجت ہوتی تو وہ لپک کر اس کی مدد کرتیں۔ کوئی روتا تو اسے گود میں لے کر ٹہلتیں۔

نرسری کے بچوں کے لئے بہت خوب صورت پلے روم تھا۔ کھیلوں کے ذریعے بچوں کو تعلیم سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ کے جی میں بھی پڑھائی بس واجبی سی تھی۔

میمونہ کو یاد تھا کہ پہلے ہی سال ایک خاتون شکایت لے کر اس کے پاس آگئی تھیں۔ ”مس میمونہ‘ میرے بچے کو آپ کے اسکول میں تین ماہ ہو گئے۔ ابھی تک اسے دس سے آگے گنتی نہیں آتی۔“

”کون سی کلاس میں ہے آپ کا بچہ؟“ میمونہ نے پوچھا تھا۔

”کے جی ون میں ہے۔“

”اور اسے دس تک گنتی آتی ہے۔“

وہ خاتون اس کی حیرانی پر حیران ہوئیں۔ ”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے یہ بہت بڑی بات ہو۔“

”ہے ہی بڑی بات۔“ میمونہ نے کہا۔ ”ہم نے ابھی دس تک گنتی بھی نہیں پڑھائی ہے کے جی ون میں۔“

”تو آپ اتنی بھاری فیس کس بات کی لے رہی ہیں۔“ خاتون تلخ ہونے لگیں۔

”میں بتاؤں؟ میں انہیں خواب دے رہی ہوں۔ انہیں یہ باور کرانے کی

کوشش کر رہی ہوں کہ زندگی میں حسن بھی ہے، نزاکت بھی۔ وہ بڑی دلچسپ ہے اور آدمی کو زندگی سے محبت کرنی چاہیے--- اپنی زندگی سے بھی اور دوسروں کی زندگی سے بھی۔"

خاتون نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "میں نے اپنے بچے کو پڑھائی کیلئے اسکول میں داخل کرایا ہے۔"

"تو پھر کلاس ون میں داخل کرا دیں۔" میمونہ نے اطمینان سے کہا۔ "وہاں سے ہم پڑھائی شروع کراتے ہیں مگر وہ بھی بچوں پر لادی نہیں جاتی۔ علوم کی بنیاد یعنی Basics کو ان کے ذہنوں میں رچایا جاتا ہے۔ آپ اپنے بچے کو علامہ بنانا چاہتی ہیں تو کسی اور اسکول میں داخل کرا دیں۔ ایسے اسکول بہت ہیں۔"

"لیکن مس میمونہ---"

میمونہ نے انہیں بات پوری نہیں کرنے دی۔ "پہلے میری بات سن لیں۔ کے جی مخفف ہے کنڈر گارٹن کا۔ یہ فرانسیسی لفظ ہے، جس کا مطلب ہے بچوں کا باغ۔ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔ ان پر محبت آتی ہے اسی لئے میں نے یہ اسکول کھولا ہے۔ یہاں سچ مچ باغ ہے۔ چھوٹا سا ہی سہی مگر اس میں ہر پھول ہے۔ میں ان چھوٹے بچوں کو پھول دکھاتی ہوں۔ ان کے متعلق بتاتی ہوں۔ انہیں پھول توڑنے سے گریز سکھاتی ہوں۔ پھولوں کی نزاکت کا احترام کرنا سکھاتی ہوں۔ پھر میں نے پرندے پالے ہوئے ہیں۔ میں انہیں ان کے متعلق بتاتی ہوں۔ کے جی میں ہم بچوں کو صرف فطرت سے متعارف کراتے ہیں۔ میرے وسائل محدود ہیں ورنہ میں تو ان کے لئے ڈزنی لینڈ بناتی پھر بھی جو کچھ میرے بس میں نہیں، وہ تصویروں میں دکھاتی ہوں۔ میں انہیں فلمیں دکھاتی ہیں۔ ابھی ان کی اسی طرح سیکھنے کی عمر ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "اور آپ دس تک کی گنتی کو کیا سمجھتی ہیں پتا بھی ہے، کتنی چیزوں کا انحصار ہے اس گنتی پر۔ پورا علم ریاضی اس پر Base کرتا ہے اور جب ہم بچے کو یہ گنتی زندگی میں Apply کرنا سکھاتے ہیں تو یہ معاشیات کا آغاز ہے۔ یہ گنتی تو تمام علوم کی بنیاد ہے۔ ہم بچوں پر بھاری بستے لاد کر ان کی کمر تباہ نہیں کرنا چاہتی۔ ہم انہیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتے ہیں۔ پیاری پیاری نظمیں سناتے ہیں۔ تصویریں بنانا سکھاتے ہیں۔ ان



کی آواز کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ گائیں، ترانے--- نظمیں گائیں۔ ہم انہیں معاشرتی علوم نہیں پڑھاتے۔ سائنس نہیں پڑھاتے۔ دینیات بھی نہیں پڑھاتے۔ ہاں بنیادی باتیں بتاتے ہیں۔ کلمہ سکھاتے ہیں۔"

یہ سب کچھ وہ نظریں جھکائے جھکائے بولتی چلی گئی۔ "آپ بچے پر کتابیں لادنا چاہیں تو کلرک کے پاس جا کر ٹی سی بنوا لیں۔ میں نے یہ اسکول بچوں سے بچپن کا حسن چھین کر انہیں علم سے بوجھل اور نڈھال کرنے کے لئے نہیں کھولا ہے۔ یہ میرا خواب ہے۔ مجھے افسوس نہیں کہ میں نے آپ کو مایوس کیا---" یہ کہہ کر اس نے نظریں اٹھائیں اور خاتون کو دیکھا۔ دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ خاتون کی آنکھوں میں خواب تھے۔ اس خلاف توقع دید پر وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔

"ہائے--- یہ سب بھی ہو سکتا ہے۔" خاتون نے حسرت سے کہا۔ "ہمیں تو نہیں ملا۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں ملا۔ اسی لئے تو دوسروں کو دینے کا خیال آیا۔"

"سوری مس میمونہ۔ آج میں مطمئن ہو گئی کہ میرا بچہ بہت اچھی جگہ ہے۔ آج افسوس ہو رہا ہے کہ ہمیں تو خواب ملے ہی نہیں۔"

"مجھے تو ملے۔ دیئے گئے۔ بہت پیارے لوگوں نے خواب دیئے تھے مجھے۔ انہی کے سہارے تو زندگی کے خارزار میں چلے جا رہی ہوں۔" میمونہ نے بے حد اداسی سے سوچا۔

تو یہ ایک خواب تھا--- اس کا اسکول۔ ورنہ زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ جینے کا کوئی جواز نہ جیئے جانے کی خواہش۔ میمونہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے عکس کو تنقیدی نظروں سے دیکھا پھر اس نے عینک لگائی اور ایک دم سے اپنی عمر سے دس سال بڑی لگنے لگی۔ یہ بات ہوئی نا!

یہ اس کا دفاعی سسٹم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خوب صورت اور پرکشش ہے۔ اس کے نتیجے میں مرد اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ سر پر کوئی تھا نہیں۔ بات ڈائریکٹ اس تک آتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ انکار کے مضمون میں وہ کمزور ہو۔ الٹا طاق تھی وہ اس مضمون میں مگر خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں۔ انکار کے باوجود لوگ پیچھے

پڑے رہتے تھے۔ چنانچہ رفع شر کے لئے اس نے خود کو بے کشش بنانے کے سلسلے میں اہتمام شروع کر دیا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ Effect بہت زوردار بنتا تھا لیکن بدذوقی اسے گوارا نہیں تھی۔ رنگوں کی وہ شیدائی تھی۔ اچھا خاصا کام نکل جاتا پھر اسے عینک کا آئیڈیا سوجھا۔ نظر اس کی کمزور نہیں تھی مگر وہ زیرو کا چشمہ تو لگا سکتی تھی۔ کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ فریم اس نے بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کیا۔ صرف چشمہ ہی اسے اپنی عمر سے بڑا اور بے کشش بنانے کے لئے کافی تھا۔

ایک روز کے جی کی کلاس میں اس نے تمام بچوں سے ایک سوال کیا۔ "آپ کو سب سے خوب صورت کون لگتا ہے؟" سب بچے باری باری جواب دے رہے تھے۔ اور وہ حیران ہو رہی تھی۔ کچھ بچوں نے امی ضرور کہا تھا مگر بیشتر بچوں نے اسے سب سے خوب صورت کہا تھا اور جنہوں نے اپنی امی کو خوبصورت کہا تھا انہوں نے بھی اس کے ساتھ اس کے نام کو منسلک کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ بچے صرف سطح پر نہیں، اندر تک دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ سطحی نظر رکھنے والے مردوں کو دھوکا دے سکتی تھی، بچوں کو نہیں۔

وہ تیار ہو کر نیچے آئی۔ بچوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ فضا ننھے منے اور بچے قہقہوں سے معمور ہو رہی تھی۔ یہ زندگی---- اور اس کی خوب صورتی ہے۔ اس نے خوشی سے سوچا۔

نرسری اور کے جی کلاسز میں اپنی مدد کے لئے اس نے اسسٹنٹ ٹیچرز رکھی تھیں۔ ان کی تربیت اس نے خود کی تھی تاکہ اس کی کمی محسوس نہ کی جائے۔ نرسری کے بچوں کو پلے روم میں اسسٹنٹ ٹیچر کے پاس چھوڑ کر وہ کے جی کلاس میں آئی پھر وہ انہیں شاپنگ روم میں لے گئی۔ وہاں سب کچھ پہلے ہی سیٹ کیا جا چکا تھا۔ دیواروں کے ساتھ میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر بچوں کے مطلب کی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ سب برائے فروخت تھیں۔ ہر چیز کے ساتھ پرائس ٹیگ اور انگریزی کا ایک حرف لگا تھا۔ A-Apple کے لئے--- قیمت دو روپے B --- Fly Butter کے لئے قیمت ایک روپیہ۔ C for Cake Piece قیمت تین روپے۔ بے شمار چیزیں تھیں۔ بچوں کی تعداد تیس تھی۔ اس نے تمام بچوں کو دس دس روپے



دیئے۔ بیس بچوں کو دس دس کا ایک نوٹ۔ یہ خریدار تھے۔ دس بچوں کو ایک ایک کے دس دس نوٹ۔ وہ سب دکان دار تھے۔ فہرستیں موجود تھیں۔

"اب آپ سب لوگ بازار میں ہیں۔ آپ کے پاس دس روپے ہیں۔ اس سے آپ اپنی مرضی کی خریداری کر سکتے ہیں۔" اس نے بچوں سے کہا۔ "دکان دار اپنے اپنے اسٹال پر چلے جائیں۔ میں گھنٹی بجاؤں تو خریداری کا کھیل شروع۔" وہ بولی۔ "اور دوسری گھنٹی پر کھیل ختم پھر اپنا اپنا حساب دینا ہو گا۔"

اس نے گھنٹی بجائی اور کھیل شروع ہو گیا۔ دکان دار بچے میزوں کے پیچھے اپنے اپنے اسٹال پر جا کر کھڑے ہوئے۔ خریدار بچوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر اسٹالز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کچھ بچے بے صبرے تھے۔ جلدی جلدی خرید رہے تھے مگر زیادہ تر کے انداز میں اعتماد تھا۔

وہاں ایک کاؤنٹر بھی تھا۔ وہ خود کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس کے پاس آدھا گھنٹا تھا۔ اس آدھے گھنٹے میں اسے بچوں کو اور آگے بڑھانے کے متعلق سوچنا تھا۔ وہ اس شاپنگ کے پیریڈ کے اگلے مرحلے کے بارے میں جزئیات سوچتی اور طے کرتی رہی۔

آدھا گھنٹا ہو گیا تو اس نے گھنٹی بجا دی۔ بچوں کا کاروبار ایک دم موقوف ہو گیا۔ وہ وقت کی اہمیت کو سمجھنے لگے تھے۔ پھر انہوں نے خود ہی قطار بھی لگا لی۔ ہر ایک کو اپنی جگہ کے متعلق علم تھا۔

"جی نعمان، آپ آیئے۔" میمونہ نے سب سے آگے کھڑے ہوئے بچے کو پکارا۔

نعمان آگے بڑھا۔ اس نے اپنی خریدی ہوئی چیزیں کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ "یس مس؟"

"آپ نے کون کون سے آئٹم خریدے؟"

"آئٹم اے، ڈی اور ای۔" نعمان نے بتایا۔

"پورے نام بتایئے۔"

"ایپل، ڈول اینڈ ایگ۔"

"ایپل کتنے کا ہے؟"

"Two Rupees Miss"

"اور Doll؟"

"پانچ روپے کی ہے مس۔"

اور EGG؟"

"دو روپے کا ہے مس۔"

"آپ کے پاس کتنے روپے تھے؟"

"تین مس۔"

"نوٹ کتنے تھے؟"

"ون مس۔ ون ٹین۔"

"اب کیا بچا ہے؟"

"ون--- ون یونٹ۔"

"ویری گڈ۔ بہت اچھی شاپنگ کی آپ نے جایئے۔"

یہ اس کا ٹیسٹ لینے کا طریقہ تھا۔ وہ ایک ایک بچے کو بلا کر پوچھتی رہی۔ تین بچوں کے پاس گڑبڑ تھی۔ بچے ہوئے پیسے کم تھے۔ "آپ کے دو روپے کم ہیں مدثر۔" وہ کہتی۔ "اب یہ آپ کو ادا کرنے ہیں۔ کل لے آیئے گا۔ او کے؟"

"یس مس۔"

"اور آپ اپنے پیسے احتیاط سے' حساب کتاب سے خرچ نہیں کریں گے تو آپ کے پپا کے پیسے ضائع ہوں گے۔ یہ نقصان ہے آئندہ احتیاط کیجئے گا۔"

"یس مس۔"

"اور ثوبیہ' آپ نے کیا خریدا؟"

"کچھ نہیں مس۔"

"کچھ نہیں! وہ کیوں؟"

"یہاں چیزیں مہنگی ہیں مس۔ میں باہر کے بازار سے خریدوں گی۔"

"اور کوئی وجہ؟"



"اس وقت مجھے ضرورت بھی نہیں تھی مس۔"

"گڈ۔ آپ کے پاس کیا بچا ہے؟"

"One ... Tens"

"یہ کیا ہے؟"

"سیونگ مس۔"

"اور سیونگ کا کیا کرتے ہیں؟"

"بینک میں جمع کراتے ہیں۔"

"تو بینک میں جمع کرا دیجئے۔"

"یہ لیجئے مس--- And Pleas give me receipt.

"او یس۔" میمونہ نے رسید اس کی طرف بڑھائی۔ "آپ بینک کا حساب رکھتی ہیں؟"

"یس مس!"

"آپ کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟"

"Three tens and two ones"

"گڈ--- ویری گڈ۔"

تمام خریداروں کا حساب چیک کرنے کے بعد وہ دکان داروں کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ہر اسٹال پر چیکنگ کے لئے گئی۔ "یاسر' آپ کا اسٹال تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔"

"It was a bad day صرف ایک سیب بکا۔"

"کتنے روپے ہیں آپ کے پاس؟"

"One tens and three ones"

"مجھے میرے دس روپے واپس دیں۔" میمونہ نے روپے لینے کے بعد کہا۔ "آپ نے دو روپے کا سیب بیچا مگر آپ کے پاس تین روپے ہیں۔ اس کا مطلب ہے' آپ نے خریدار کو ایک روپیہ کم دیا۔ کل جرمانے کے دو روپے لے آیئے گا۔"

اسسٹنٹ ٹیچر نتائج نوٹ کرتی رہی۔ وہ چیک اینڈ بیلنس کا سسٹم تھا۔ غلطی کبھی

ایک بچے سے نہیں ہوتی تھی اور یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ کن دو کے درمیان ل
دین میں گڑبڑ ہوئی ہے۔ شاپنگ کا یہ پیریڈ ہفتے میں ایک بار ہوتا تھا۔ یہ پیسے فیس
شامل ہوتے تھے۔ اس کے بعد بچوں کو ایکویریم دکھایا گیا پھر Pets world کی با
آئی اور اس کے بعد گارڈن۔

"اب مس کہانی سنائیں گی نا؟"

"ضرور--- کیوں نہیں۔" میمونہ نے کہا۔ پھر اس نے کہانی شروع کی۔ "بہ
پرانے زمانے میں ایک سرزمین ہوتی تھی--- کوہ قاف۔ وہاں دیو اور پریاں رہ
تھے---"

"اب نہیں ہوتے مس؟" ایک بچے نے پوچھا۔

"ہوتے ہوں گے مگر اب اس طرف نہیں آتے۔"

"کیوں مس؟"

"ہم نے--- انسانوں نے ان کا روپ بدل کر انہیں استعمال کرنا شروع ک
تھا لہٰذا وہ ڈر گئے۔"

"کیسے مس؟"

"ہم ان پر سواری کرتے تھے۔ ہم نے ان کے نام رکھے۔ مزدا پری' ڈا
پری' سوزوکی پری---"

"یہ تو کاروں کے نام ہیں مس۔ ہمارے پاپا کے پاس سوزوکی ہے۔"

"ہاں' اب ہم انہیں کار ہی کہتے ہیں مگر یہ پرانے زمانے کی پریاں ہیں۔"

"لیکن وہ اڑتی تو نہیں ہیں مس۔"

"اب وہ زمین پر اڑتی ہیں۔"

"سچ مچ کیوں نہیں اڑتیں مس؟"

"زیادہ بوجھ کی وجہ سے ان کے پر ٹوٹ گئے۔ جن کے پر مضبوط تھے وہ ا
بھی اڑتی ہیں۔ تم نے بوئنگ پری' جمبو پری وغیرہ کے نام نہیں سنے۔"

"وہ تو جہاز ہیں مس۔"

"ہاں اب وہ جہاز ہی کہلاتے ہیں۔"



"اور دیووں کا کیا ہوا مس؟"

"انہیں ہم نے بار برداری پر لگا دیا۔"

"بار برداری کیا ہوتی ہے مس؟"

"سامان لادنا۔ تم نے بیڈ فورڈ دیو' لی لینڈ دیو اور این ایل سی ٹرالر دیو نہیں دیکھے؟"

"دیکھے ہیں مس۔ اب وہ ٹرک کہلاتے ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک۔"

"دیو تو بہت خطرناک ہوتے تھے مس۔"

"اب بھی خطرناک ہوتے ہیں مگر جب تک آدمی انہیں ٹھیک طور پر استعمال کرتا ہے' وہ خطرناک نہیں رہتے۔ ذرا سی بے پروائی کی اور وہ قابو سے نکلے تو بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔"

ایسی کہانیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں۔ ان کے ذریعے وہ بچوں کو جدید دور کی آگہی دیتی تھی۔ ویسے زیادہ تر وہ پرانی ہی کہانیاں بہت خوب صورت انداز میں سناتی مگر یہ کہانیاں جدید دور کی اسے اداس کر دیتیں۔ اس پورے دن حال سے اس کا ناتا ٹوٹ جاتا اور وہ ماضی میں جیتی--- بھیگی بھیگی اداسی میں شرابور---



"چلیں نا بھائی جان' آنگن میں۔" میمونہ نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ "ہر وقت کمرے میں گھسے پڑھتے رہتے ہیں۔"

"پڑھنا بہت ضروری ہے مونا۔"

"مگر ہر وقت تو نہیں' چل کر دیکھیں تو' کتنی خوب صورت شام ہے۔" میمونہ آپی کے الفاظ دہراتی۔

"تمہیں بھی پتا ہے کہ شام خوب صورت ہوتی ہے۔" بھائی جان نے حیرت سے کہا۔

"مجھے سب پتا ہے۔ بس اب چلئے۔"

"سب پتا ہے! تب تو تم بڑی خطرناک ہو چلو بھئی۔"

بھائی جان آنگن میں نہ ہوتے تو ہر چیز سوئی سوئی سی' اداس اداس سی ر تھی۔ یہی حال آپی کا بھی ہوتا اور وہ باہر آ جاتے تو جیسے ہر چیز انگڑائی لے کر ا اٹھتی اور ہر چیز پر تازگی اور نکھار آ جاتا۔ اس وقت میمونہ کو نہیں معلوم تھا کہ اور مزاج تو آدمی کے اندر ہوتے ہیں۔ باہر کی چیزیں تو بس ان کا عکس لیتی ہیں۔ شعر تو اس نے بہت--- بہت بعد میں پڑھا تھا۔

ہے میرے دل سے تعلق تمام عالم کا
فضا اداس بہت' چاندنی نراش بہت

تو بھائی جان کے باہر آتے ہی سب کچھ بدل جاتا' جیسے کسی جادوگر نے جادو چھڑی گھما دی ہو۔ بیلا اور چنبیلی خوب بولتے' باتیں کرنے لگتے۔ چاندنی گنگناتی خوشبوئیں اٹھا کر ناچتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپی کی آنکھیں بولنے لگتیں۔

بھائی جان بھی عجیب آدمی تھے۔ ان کا موڈ کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔ ہا اداس ضرور ہو جاتے تھے۔ وہ اداس نہ ہوتے تو بہت اچھے موڈ میں ہوتے۔ ہر با ماننے کو تیار۔

"اب کیا کریں بھئی۔ یہاں تو بوریت ہی بوریت ہے۔" بھائی جان نے کہ "سب تو چپ بیٹھے ہیں۔" انہوں نے چپکے سے آپی کو دیکھا۔

"اس لئے چپ ہیں کہ کہانی سنی ہے۔" میمونہ بولی۔

"کہانی---! ابھی لو۔" بھائی جان نے چہک کر کہا۔ "بہت کم عرصہ پہلے کی ہے کہ ایک شہزادی تھی--- معصوم سی--- بے حد پیاری۔"

میمونہ نے آپی کو دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں اور بے حد معصوم' بہت پیا لگ رہی تھیں۔ "شہزادی آپی جیسی ہو گی--- ہے نا بھائی جان؟" وہ بے ساختہ بو

"نہیں بھئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہاں یہ کہاں وہ۔ کہاں راجا بھوج' ک گنگو تیلی۔" بھائی جان' آپی کی طرف ہاتھ اٹھا کر بڑی حقارت سے کہتے۔

"دیکھئے بھائی جان' یہ آپ غلط بات کر رہے ہیں۔ اتنی پیاری سی ہیں آپ میمونہ برا مان گئی۔



"نہیں بھئی' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" بھائی جان نے اصرار کیا۔ "شملا کے سامنے وہ شہزادی ایسی تھی کہ جیسے چاند کے سامنے ستارہ۔"

میمونہ خوش ہو کر ہنسی۔ اسی لمحے جیسے چاند نے بادلوں کا گھیرا توڑا۔ آپی کے چہرے پر چاندنی پھیل گئی۔ اور پھر نجانے کیسے چاندنی کا رنگ گلابی ہو گیا۔

ارشد اس دوران کسی گہری سوچ میں تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "یہ گنگو تیلی کون تھا بھائی جان؟"

"ایک تو تم اوندھے سیدھے سوالوں سے بہت پریشان کرتے ہو۔ کہانی کیا سنائیں۔" بھائی جان نے چڑ کر کہا۔

"ارشد بھائی آپ بیٹھ جائیں چپ کر کے۔" میمونہ نے ارشد سے کہا۔ "کہانی سننے دیں۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نارتھ ناظم آباد کے ایچ بلاک میں ایک شہزادی رہتی تھی بہت معصوم' بڑی پیاری سی---"

"بھائی جان' ہم بھی تو ایچ بلاک میں ہی رہتے ہیں۔" میمونہ نے کہا۔

"ہاں آں---"

"تو ہم اسے دیکھ بھی سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ آنکھیں ہیں تو تم دیکھ بھی سکتی ہو۔" بھائی جان بولے۔

"یہ نہیں--- میں کہہ رہی ہوں' آپ مجھے اس سے ملوایئے۔ آپ کو تو پتا ہو گا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟"

"ہاں آں--- پتا تو ہے پر میرا خیال ہے' تم اسے دیکھتی ہی رہتی ہو--- ہر روز---"

اس پر آپی بہت زور سے کھنکھاریں۔ فوراً ہی انہوں نے میمونہ کو ڈپٹا۔ "تم لوگوں کو نہیں سنی کہانی۔ اتنی تفتیش کرتے ہو---" وہ بھائی جان کو تیکھی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"مجھے تو بھئی بوریت ہو رہی ہے۔" ارشد نے کہا۔ "مجھے ڈاٹسن پری کی کہانی سنائیں۔"

"ٹھیک ہے بھئی۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔" بھائی جان نے فوراً ڈاٹسن پر کی کہانی شروع کر دی۔

بھائی جان کی کہانیوں میں پریاں ہوتیں' کچھ اڑنے والی' کچھ دوڑنے والی۔ کچھ دو انجن والی' کچھ چار انجن والی اور کچھ بے چاری ایک انجن والی۔ یہ پریاں ناشتے ا کھانے میں پٹرول پیتیں۔ ایک وقت کا کھانا نہ ملتا تو معذور ہو جاتیں۔ مختلف پریوں خوراک مختلف ہوتی۔ کوئی ایک گیلن میں چالیس میل دوڑتی تو کوئی تیس میل۔ کبھ بھائی جان حساب کتاب میں جان بوجھ کر غلطی کرتے تو میمونہ اور ارشد اسے درس کر دیتے---

ڈاٹسن پری کی کہانی بھی پوری نہیں ہو سکی۔ میمونہ نے کہا۔ "مزہ نہیں آ ہے بھائی جان۔ بہادر شہزادے والی کہانی سنایئے۔"

"ارے تم لوگ مجھے کہانی سنانے کی مشین سمجھتے ہو۔" بھائی جان نے جھنجلا کی اداکاری کی۔ "خیر--- تم بھی کیا یاد کرو گی مونا بیگم۔ لو سنو۔"

یہ کہانیوں کی تیسری قسم تھی۔ بہادر شہزادہ دردمند بھی ہوتا تھا۔ کسی کو تکلی میں دیکھتا تو تڑپ جاتا۔ ہر مصیبت زدہ کے لئے جان کی بازی لگا دیتا۔ وہ جوڈو' کراٹے کنگ فو' غرض تمام مارشل آرٹس کا ماہر ہوتا۔ دوسری طرف ظالم اور طاقت ور بہت بھاری بھرکم اور صرف اکھاڑے والی کشتی کا ماہر ہوتا۔ نتیجتاً" شہزادے کے ہاتھوں بری طرح پٹتا اور انجام کار ظلم سے توبہ کرتا۔

"بھائی جان' دیو جوڈو کیوں نہیں سیکھ لیتا؟" پوری کہانی سننے کے بعد میمونہ کہا۔

"ارے مونا--- منی--- یہ جو دیو حضرات ہوتے ہیں نا' یہ لکیر کے فقیر ہو ہیں۔"

میمونہ کی سمجھ میں لکیر کے فقیر نہیں آیا مگر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ پوچھا نہیں گیا۔ ارشد بھائی اتنے میں سو چکے تھے۔

میمونہ غنودگی کے عالم میں شہزادی کی کہانی کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ کہا سناتے سناتے بھائی جان اچانک آپی کو دیکھنے لگتے۔ ان کی آنکھوں سے شرارت ا



محبت رم جھم برسنے لگتی۔ کیوں؟

اچانک امی کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ "بہت رات ہو گئی۔ سونا نہیں تم لوگوں کو۔" انہوں نے دھیرے سے پکارا۔

بھائی جان نے ارشد کو اٹھایا اور کمرے کی طرف چل دیئے۔ میمونہ بھی آپی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اے مون' تم تو بغیر کتاب کے بھی داستانیں پڑھتی معلوم ہوتی ہو۔" انا بوا کی آواز میمونہ کو ماضی سے کھینچ لائی۔ "کھانا نہیں کھاؤ گی جینے کے لئے؟"

"آتی ہوں بوا۔"



بوا اس روز دوپہر کو کھانے کے بعد حسب معمول قیلولے کے لئے لیٹیں تو بہت اداس تھیں۔

بوا اپنے لئے کبھی اداس نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں کبھی اس کی کمی کا---- بلکہ اس امر کا احساس تک نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے زندگی گزار دی مگر کبھی اپنے لئے اداس اور پریشان نہیں ہوئیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وقت نے انہیں اس کی مہلت ہی نہیں دی۔ چنانچہ انہیں بس اپنی خوشیاں یاد تھیں۔ ہاں' وہ خوش رہیں۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ اسے بہت تھوڑا عرصہ جانتا لیکن بوا کو بہت زیاہ لگتا تھا وہ---

ان کی شادی ہوئی تو تھوڑے ہی عرصے بعد ان کے ماں باپ چل بسے۔ تب وہ اپنی چھوٹی بہن کے لئے اداس ہوئیں۔ شوہر ان کا بہت اچھا تھا۔ زیادہ نہیں کماتا تھا مگر دل کا بہت اچھا تھا۔ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ بہن کو گھر لے آئیں تو وہ اسے باپ کی شفقت دینے کی کوشش کرتا رہا کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کی بیوی نے ماں کی جگہ سنبھال لی ہے۔ وہ صابرہ کا بہت خیال رکھتا۔ اکثر وہ کہتا "ہاجرہ بی بی' میں تم سے بہت شرمندہ رہتا ہوں۔ تم اتنی اچھی ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ پورے کا پورا بازار تمام کی تمام دنیا تمہارے سامنے لا کر ڈال دوں مگر میں تمہیں کچھ دے ہی نہیں سکتا۔"

اور ہاجرہ ہنس کر کہتی۔ "سب کچھ تو ہے ہمارے پاس۔ پوری دنیا ہے۔"

پھر ہاجرہ بوا کے اپنے بچے ہوئے۔ صابرہ جس نے ماں باپ کو کھو کر بہن اور بہنوئی سے ممتا اور شفقت پائی تھی اس نے بہن کے بچوں کو سب کچھ دیا۔ پیار' محبت' دیکھ بھال۔ تھوڑا عرصہ گزرا کہ ہاجرہ بوا بیوہ ہو گئیں۔ اس موقع پر بھی وہ اپنے لئے اداس نہیں ہوئیں۔ مہلت ہی نہیں ملی۔ انہیں تو بچے پالنے کی فکر پڑ گئی۔ دن بھر محنت مشقت کرتیں۔ بچوں کی فکر کرتیں کہ کیا ہو رہا ہو گا۔ صابرہ خود بچی ہی ہے۔ کیسے سنبھالے گی انہیں۔ تھکی ہاری گھر واپس آتیں تو بہن اور بچوں کو وہ محبت اور قربت دینے کی کوشش کرتیں' جو دن بھر نہیں دے سکی تھیں۔ اسی عالم میں سو جاتیں۔ صبح زندگی کی چکی پھر چل پڑتی اور انہیں پیسنا شروع کر دیتی۔

پھر بچے بھی چلے گئے--- صابرہ کے ساتھ۔ تب بھی انہیں اپنے لئے اداس ہونے کا وقت نہیں ملا۔ صغیرہ باجی کو ان کی ضرورت تھی۔ پھر وہ باجی کے بچوں میں کھو گئیں۔ کچھ برس خیریت سے گزرے پھر وہ گھر بھی بکھر گیا۔ شہلا گئی' پھر باجی' پھر صاحب۔ ہاجرہ بوا ان سب کے لئے اداس ہوتی رہیں۔ آخر میں بس میمونہ رہ گئی۔

اور اب وہ میمونہ کے لئے اداس رہتی تھیں۔

"ہمارے تو نصیب ہی اچھے نہیں۔" انہوں نے چھت کے پنکھے کو مطلع کیا اور پھر اس سے منہ پھیر کر کروٹ بدل لی۔ "جس مکان میں گھر بنایا' وہ اجڑ گیا۔" انہوں نے کھڑکی کے پردے سے کہا۔ "اب زندگی کی شام ہو گئی۔ سورج غروب ہو جائے گا کسی بھی وقت۔ اس سے پہلے اپنی مونا بٹیا کو خوش دیکھ لیں۔ مگر ہمارے نصیب ایسے کہاں؟"

وہ ایک دم' جوش سے اٹھ بیٹھیں۔ "کچھ تو کرنا ہی پڑے گا مگر کیا کریں؟" انہوں نے دیواری گھڑی سے کہا۔ "سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا۔ ہم مون بٹیا کو نہیں سمجھا سکتے تو اور کون سمجھائے گا۔ پھر پتا بھی تو نہیں چلتا کہ بات کیا ہے۔ کوئی ایسا بھی نہیں' جس سے ہمیں اس معاملے میں مدد ملے--- ہاں' ایک تھا۔ پر نجانے کہاں چلا گیا۔ ایسا گیا کہ کبھی پلٹ کر دیکھا نہ پوچھا' نہ اپنا پتا دیا۔ خیر ٹھیک ہی کیا اس نے۔" وہ کلاک کو چھوڑ' دیوار سے مخاطب ہو گئیں۔ "اس کے ساتھ سلوک ہی ایسا ہوا۔ تھا



بہت اچھا۔ ہمیں تو بہت ہی اپنا لگتا تھا۔ ہماری طرح اس نے بھی سب کچھ کھو دیا اور آخر میں جس سے لو لگائی وہ بھی چھن گیا--- آہ--- آہ---"

بوا بیٹھے بیٹھے سرد آہیں بھرنے لگیں۔ سرمد یاد آتا تو ان کا موسم ہمیشہ ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ وہ موجود تھا' تب وہ اسے دیکھتیں تو لگتا کہ اپنے محرومی کے آئینے میں دیکھ رہی ہیں۔ اسی لئے تو وہ اپنا اپنا لگتا تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ سرمد انہیں یاد آئے اور وہ ماضی میں نہ چلی جائیں۔ اس کی یاد ان کی انگلی تھام کر انہیں زبردستی لے جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔



سرمد کو انہوں نے پہلی بار دیکھا تو وہ سات سال کا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ انہیں بھا گیا۔ اپنا اپنا لگنے لگا۔ اس وقت وہ باپ سے محروم ہو چکا تھا۔ ماں کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔

سرمد کی ماں صغیرہ باجی کی سگی بہن تھیں۔ شوہر کی موت کے بعد وہ بیٹے کی پرورش کے لئے سلائی کرنے لگیں۔ صغیرہ باجی نے بارہا ان کی مدد کرنا چاہی لیکن انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ صغیرہ باجی کے گھر آتیں تو ایسے وقت کہ دسترخوان نہ بچھے اور کھانے کے وقت سے پہلے رخصت ہو جاتیں۔

سرمد بہت اچھا اور نیک لڑکا تھا۔ اسے ماں باپ کی تمام خوبیاں ملی تھیں۔ وہ ماں سے بھی زیادہ خوددار تھا۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا اسے۔ کچھ بننا چاہتا تھا لیکن کسی کا احسان لے کر نہیں۔ اسی لئے باپ کی موت کے بعد اس کے دو تعلیمی سال ضائع ہو گئے۔

انا بوا کو دیکھتے ہی دیکھتے سرمد سے محبت ہو گئی۔ اس کے اور ان کے درمیان دکھ کا رشتہ تھا۔ جب سرمد کی ماں کا انتقال ہوا تو بوا نے جان لیا کہ ان کی طرح سرمد بھی قسمت کا منتخبہ انسان ہے۔ قسمت اس پر بھی تاک کر وار کر رہی تھی بلکہ اس کا دکھ بڑا تھا۔ بوا کو جب دکھوں نے گھیرا تو وہ جوان ہو چکی تھیں جبکہ سرمد کو بچپن اور لڑکپن کے درمیانی عرصے میں ہی قسمت نے لوٹ لیا تھا۔

بوا کو معلوم تھا کہ بہن کی موت کے بعد صغیرہ باجی کو سرمد کو اپنے گھر لانے کے لئے کتنی بحث کرنی پڑی۔ اس کی طبیعت میں بڑوں کا ادب اور لحاظ اور مروت نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ آتا بلکہ وہ تو گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر کا فرد کبھی نہ بن سکا۔ اس نے ہمیشہ خود کو گھر پر بوجھ سمجھا۔ کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی اپنی تعلیم کے سلسلے میں کوئی مدد قبول نہیں کی۔ تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لئے صبح گھروں میں اخبارات ڈالتا اور شام کو محلے کے بچوں کو پڑھاتا۔ یہ اس کی آمدنی کی دوہری سبیل تھی۔

صغیرہ باجی اور ان کے تینوں بچے سرمد پر جان چھڑکتے تھے۔ خالہ تو ویسے بھی آدھی ماں ہوتی ہے لیکن صغیرہ باجی تو اس کے لئے پوری ماں تھیں۔ تینوں بچے ان پر جان دیتے تھے۔ بس صاحب مرحوم ذرا سخت آدمی تھے۔ پھر بھی وہ اپنے انداز میں اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کی فکر کرتے تھے۔

یہ سب یک طرفہ بھی نہیں تھا۔ سرمد بھی ان سب سے بہت محبت کرتا تھا۔ بس خودداری راستے کی دیوار تھی--- اور ٹھیک ہی تھی۔

سرمد، شہلا سے دو سال بڑا تھا۔ وہ خالہ کے گھر رہنے کے لئے آیا تو شہلا سولہ سال کی تھی۔ بوا کو وہ پہلے ہی سے اچھا لگتا تھا مگر اب ماں کو کھونے کے بعد وہ انہیں اور عزیز ہو گیا تھا۔ بوا عورت تھیں۔ انہوں نے شہلا کو سرمد کیلئے کمرا ٹھیک کرتے دیکھا تو بہت کچھ سمجھ گئیں۔ محبت کوئی چھپتی ہے انہیں اندازہ ہو گیا کہ شہلا، سرمد کو چاہتی ہے۔ انہیں بہت خوشی ہوئی۔ کیسا پیارا جوڑا ہے۔ انہوں نے خوش ہو کر سوچا۔ برسوں کے بعد وہ خوش ہوئی تھیں۔

لیکن سرمد کی طرف سے انہیں تشویش تھی۔ وہ دعا کرتی رہیں کہ اللہ یہ جوڑی بنا دے۔ وہ جانتی تھیں کہ شہلا کے لئے اب سرمد کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ خاموش طبع، فرماں بردار اور نازک لڑکی آنکھوں میں گہرے رنگوں کے خواب سجائے بیٹھی تھی۔ ایسے خواب جو کبھی پھیکے نہیں پڑتے۔

پھر ایک دن بوا کی خوشی مکمل ہو گئی۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ ان کا گمان تھا۔ خیر گمان ہی سہی، خوشی تو اپنی جگہ سچی تھی۔ اس روز شام کے بعد وہ الگنی پر پھیلے



ہوئے کپڑے اتارنے آنگن میں گئیں۔ بچے شہلا اور سرمد کے ساتھ باغیچے میں بیٹھے تھے۔ سرمد، مونا اور ارشد کو کہانی سنا رہا تھا لیکن اس کی نظریں شہلا پر جمی ہوئی تھیں، جو سر جھکائے شرمائی شرمائی بیٹھی تھی۔

بوا کا دل خوش ہو گیا۔ بات یک طرفہ نہیں تھی اور سرمد جن نظروں سے شہلا کو دیکھ رہا تھا، بوا ان نظروں کو خوب پہچانتی تھیں۔ ان کا شوہر انہیں ایسے ہی دیکھتا تھا اور وہ انجان بنی رہتی تھیں مگر وہ نظریں گدگدی کرتی رہتیں۔ آخر وہ کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔ ان کا شوہر ہنسی کا سبب پوچھتا تو وہ کہتیں--- یونہی ایک بات یاد آ گئی تھی ہمیں۔

بوا کو سرمد میں اپنا صابر نظر آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات پر کڑھتیں کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتا۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے کر اس کے کمرے میں جاتیں۔ "انا بوا میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔" وہ کہتا۔

"معلوم ہے ہمیں لیکن یہ ہم تمہارے لئے لائے ہیں۔ کھا لو۔"

"لیکن انا بوا---"

"بس کھا لو۔" وہ حکمیہ کہتیں۔

"بوا، اتنا خیال کیوں کرتی ہو میرا؟"

"تم ہمارے صابر ہو، جو چار سال کے بچھڑ گئے تھے۔ اب ملے ہو۔"

اس پر سرمد انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھتا۔ پھر ان کے لحاظ میں وہ تھوڑا بہت کھا لیتا۔

ایک دن سرمد نے بہت اداس ہو کر کہا۔ "انا بوا اللہ میاں کسی سے اس کا سب کچھ کیوں لے لیتے ہیں؟"

"ایسی باتیں نہیں کرتے سرمد میاں۔"

"دیکھیں نا، پہلے ابو گئے، پھر امی۔ میرے پاس بچا ہی کیا؟"

"سوچیں ٹھیک رکھنا ضروری ہوتا ہے سرمد میاں۔" بوا نے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس بہت کچھ بچا ہے۔ ماں جیسی محبت کرنے والی خالہ، بھائی بہنوں سے بڑھ کر محبت کرنے والے چھوٹے بہن بھائی اور ایک بھرا پرا گھر---"

"یہ میرا کب ہے یہ تو خالو جان کا ہے۔"

"صاحب کی سختی اوپر کی ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ اندر سے بہت نرم ہیں نجانے کیوں خود کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ خیر' چھوڑو اس بات کو۔ خود پر ترس آنا تمہیں' یہ اچھی بات نہیں۔ اپنے سے زیادہ دکھی لوگوں کو دیکھو تو شکر ادا کرو گے گا۔"

"کون ہے مجھ سے زیادہ دکھی؟"

"ہم ہیں۔" بوا نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ "پہلے اماں گئیں' پھر ابا گئے۔ اس بعد اللہ بخشے ہمارے میاں کو' وہ چل دیئے۔ پھر بہن گئی' تین پھول سے بچے گئے۔ ہمارے جگر کے ٹکڑے۔ بتاؤ ہمارے پاس کیا بچا؟ اپنا آپ! اپنا آپ ان نہیں ہوتا کہ آدمی جئے مگر ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں۔ مرجانا چاہیے۔ ہم نے باجی سے' ان کے بچوں سے دل لگا لیا اور تم جو کہتے ہو گھر تمہارا کب ہے تو پھر یہ گھر ہمارا کیسے ہوگیا۔ کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں مگر ہم سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ کوئی دم نہیں مارتا ہمارے سامنے۔ جب یہاں ہم ہ کر ایسے رہتے ہیں تو تم تو باجی کا خون ہو۔ بس غلط سوچنے کی بات ہے۔"

بوا نے نظریں اٹھا کر سرمد کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ت

"ارے--- رو رہے ہو تم؟"

"ہاں انا بوا' آپ کے دکھ پر رو رہا ہوں۔ واقعی آپ کے دکھوں کے سا میرے دکھ کچھ بھی نہیں۔ اب میں ٹھیک طور سے سوچوں گا لیکن بوا' آپ کا اور معاملہ مختلف ہے۔ میں مرد ہوں۔ میں اپنا گھر بناؤں تو ساری دنیا میری ہو گی ورنہ بھی نہیں۔ اس کے بغیر میں خوش نہیں رہ سکتا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" بوا نے تسلی دی۔ "مگر اچھی طرح کھایا پیا کرو۔ جا گی تو حالات سے لڑو گے نا۔"

اس گفتگو کا سرمد پر اچھا اثر ہوا تھا۔ طبعاً" وہ بہت زندہ دل اور خوش مزا تھا۔ خوب صورتی سے پیار کرنے والا مگر اچانک بیٹھے بیٹھے اداس ہو جاتا تھا۔ د بہت تھا مگر اصل میں خودداری اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔



انا بوا نے دیکھا کہ صغیرہ باجی پر سرمد اور شہلا کی محبت کھل گئی ہے--- وہ بہت خوش نظر آنے لگیں۔ بوا کو بھی اطمینان ہوا۔ بس مسئلہ صاحب کا رہ گیا تھا۔

مگر سرمد عجیب تھا۔ دوسرے لڑکوں سے مختلف۔ وہ اب بھی بچوں اور شہلا کے ساتھ بہت کم وقت گزارتا تھا۔ گھر میں ہوتا تو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتا۔ اور وہاں وہ تمام وقت کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ بہت موٹی موٹی کتابیں تھیں اس کے پاس۔ ایسے میں بوا اس کا بہت خیال رکھتیں۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے جاتیں اس کے لئے۔ چائے کا خاص خیال رکھتیں۔

ایک دن وہ چائے لے کر گئیں تو اسے عجیب عالم میں دیکھا۔ سامنے کھلی کتاب تھی مگر وہ دونوں ہاتھوں میں تھوڑی رکھ کر نجانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ اسے نہ بوا کی آمد کا پتا چلا نہ اس بات کا کہ انہوں نے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھ دی ہے۔

"سرمد میاں---" بوا نے پکارا۔

سرمد بری طرح چونکا۔ "ارے بوا---"

"ایک بات بتاؤ میاں۔ اس وقت کہاں کھوئے ہوئے تھے تم؟"

"کہیں بھی نہیں بوا۔"

"پھر بھی؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے نظریں اٹھا کر بوا کو دیکھا۔ "میں خواب دیکھ رہا تھا بوا۔ بہت خوب صورت خواب۔"

بوا ہنسنے لگیں۔ "لو بھلا کوئی جاگتے میں خواب دیکھ سکتا ہے۔ ہم تو سونے کے بعد خواب دیکھتے ہیں۔"

"دیکھیں انا بوا' جو خواب سوتے میں دیکھے جائیں ان پر اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ سونے کے بعد اپنی مرضی کا خواب تو نہیں دیکھ سکتیں نا؟"

"یہ تو ہے۔" بوا نے سر ہلایا۔ "لیکن ہوتا تو یونہی ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ میں جاگتے میں اپنی مرضی کے خواب دیکھتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

سرمد اداس ہو گیا۔ "خوابوں کے سوا میرے پاس ہے ہی کیا؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ ہاں خوب صورت خواب دے سکتا ہوں۔"

بوا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "مگر خوابوں سے کیا ہوتا ہے؟"

"خواب انسان کی بنیادی ضرورت ہیں بوا۔" اس بار سرمد کے لہجے میں اصرار تھا۔ "خواب آدمی کو نرمی دیتے ہیں۔ نازک خیالی دیتے ہیں۔ گردوپیش کو رنگین کر دیتے ہیں۔ آدمی کو سختی سے بچاتے ہیں۔ دوسروں کا احساس کرنا سکھاتے ہیں۔"

"مگر فائدہ کیا ہے خوابوں کا؟"

"ان سے امید پیدا ہوتی ہے۔"

"مگر جو خوابوں میں گم ہو جائے' وہ عملی زندگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔" بوا نے اعتراض کیا۔

"انا بوا' تعبیر کی خواہش آدمی کو جدوجہد بھی سکھاتی ہے۔ خوابوں سے محروم آدمی بے آب و گیاہ صحرا کی طرح ہوتا ہے۔ سنگلاخ زمین کی طرح ہوتا ہے اور جہاں پورا معاشرہ خوابوں سے محروم ہو تو وہ دردمندی سے عاری' سخت اور خود غرض معاشرہ ہوتا ہے۔"

"اے میاں' ہم اتنے پڑھے لکھے نہیں کہ یہ سب سوچیں۔ یہ باتیں تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ آدمی کی عظمت خدمت میں ہے اور محبت میں ہے۔"

"اور محبت خواب ہے۔" سرمد بولا۔ "خواب محبت سکھاتے ہیں۔ دل کو گداز دیتے ہیں۔ بوا' محبت بغیر گداز کے کہاں ہوتی ہے۔"

اسی وقت آواز ابھری۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ بوا نے بھنا کر کلاک کو دیکھا۔ "ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم بے وقت بولتے ہو کیونکہ بولتے تم وقت پر ہی ہو۔" انہوں نے کلاک کو جھاڑا۔ "مگر بے تکا بولتے ہو۔ بے جا مداخلت کرتے ہو۔"

پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "اب چائے بنائیں گے جا کر۔" انہوں نے مسہری کو بتایا۔ "پھر مون کو کتاب کی نیند سے بھی جگانا ہے۔"





میمونہ بیٹھی کے جی کے اگلے سبق پر کام کر رہی تھی۔ جب وہ ایسا کوئی کام کرتی تو اس میں مستغرق ہو جاتی۔ اسے بوا کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

بوا نے دوچار بار اسے پکارا۔ پھر قریب جا کر بہت زور سے بولیں۔ "جاگ جاؤ بٹیا۔"

میمونہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "میں سوئی کب ہوں؟" اس نے احتجاج کیا۔

"ہمارے نزدیک یہ سونا ہی ہے۔ جاگتی ہوتیں تو پہلی آواز نہ سن لیتیں۔"

"بات کیا ہے بوا؟"

"ہم چائے لگا رہے ہیں۔ تم باغیچے میں آ جاؤ۔"

"اچھا۔۔۔ آ رہی ہوں۔"

"آ جانا۔ ورنہ ہمیں دوبارہ آنا پڑے گا بلانے کے لئے۔"

میمونہ نے اگلے پانچ منٹ میں کچھ اہم پوائنٹس نوٹ کئے اور پھر لان کی طرف چل دی۔ وہاں بوا چائے کی میز لگائے بیٹھی تھیں۔ میز پر تین پیالیاں دیکھ کر میمونہ چونکی۔ "بوا' کیا کوئی مہمان آنے والا ہے؟"

"ارے احتیاطاً" ایک پیالی زیادہ لے آئے ہیں۔" بوا نے کہا۔ "سوچا' اختر میاں کی بات کریں اور وہ آ جائیں تو دوبارہ اٹھنا پڑے گا۔"

"بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔ تم تو نام بھی نہ لو اختر میاں کا۔" میمونہ نے چڑ کر کہا۔

"ہمیں بات کرنی ہے۔" بوا بولیں "کب تک لٹکائے رکھو گی اسے؟"

"اللہ نہ کرے بوا۔ میں کسی کو کیوں لٹکاؤں گی؟"

"دیکھو مون بٹیا' کوئی کسی کا ایک حد سے آگے انتظار نہیں کرتا۔ بوا کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ اختر میاں بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ انتظار کہاں سے آ گیا بیچ میں۔۔۔ اور اگر کوئی کر بھی رہا ہے تو مجھ سے کیا۔"

"مون بٹیا' ہم نوکر ہی سہی پیدا ہوتے ہی پہلے ہماری گود میں آئی تھیں ہمارے ہاتھوں میں پلی ہو۔"

"نوکروں والی بات کیوں کرتی ہو بوا——" میمونہ تڑپ گئی۔

"جانتی ہو کہ تمہارا کیا مقام ہے۔ اب تو تم—— ہی میری فیملی ہو۔"

"ہیں تو بات کیوں نہیں مانتیں ہماری؟"

"کیا بات مانوں؟"

"اختر میاں سے شادی کر لو۔"

"خواہ مخواہ مجھے نہیں کرنی شادی۔"

"برائی کیا ہے اختر میاں میں؟"

"میں کب برا کہتی ہوں اسے—— بس شادی نہیں کر سکتی میں۔"

"کیوں؟"

"بوا' سرمد بھائی کا جانا یاد ہے تمہیں؟" میمونہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "آپی کو شادی نے نہیں برباد کیا۔ وہ اسی دن برباد ہو گئی تھیں جب سرمد گئے تھے۔"

انا بوا سناٹے میں آ گئیں۔ "کون بھول سکتا ہے۔" انہوں نے آہ بھر کے

"مگر اس سے تمہارا——"

"تم چاہتی ہو کہ میرا حشر بھی آپی کا سا ہو۔" میمونہ نے ان کی بات کاٹ

بوا دہل گئیں۔ "اللہ نہ کرے اور ضروری بھی نہیں۔ سب کے اپنے نصیب ہوتے ہیں۔"

"نہیں بوا۔ میں ایک بہت بڑے المیے کی عینی شاہد ہی نہیں' وہ المیہ میرا بھی ہے۔ اس کے بعد ہی تو سب کچھ چھن گیا مجھ سے۔ میں مجبور ہوں کہ وہ وشیوں کا باعث بنے تو بنے ورنہ خوشیاں مجھے قبول ہی نہیں۔ میں تو کفارہ ہوں زیادتی کا۔ اور صبر کا انعام بننا چاہتی ہوں۔ اب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔" بوا نے بے بسی سے کہا درحقیقت وہ ہل کر رہ گئی تھیں۔ یہ تو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مونا



لے کا اتنا اثر قبول کیا ہو گا۔ سرمد جب اس گھر سے رخصت ہوا تو وہ صرف نو سال کی تھی۔

"بس بوا—— تم اختر کو سمجھا دو کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔ میں اسے دکھ دینا نہیں چاہتی۔"

"کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔ یہ بھی اپنے نصیب کی بات ہے۔" بوا بڑبڑائیں۔ "آج وہ آیا بھی نہیں۔"



اختر بخار میں پھنک رہا تھا۔

بہت سے عوامل یکجا ہوئے تھے جنہوں نے اسے بیمار کیا تھا۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر قیمہ بھرے پراٹھے اچار سے کھائے۔ پھر میمونہ سے بحث ہوئی جس میں وہ جذباتی ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس گفتگو کے دوران ہی اسے اپنی طبیعت خراب ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ پھر وہ بھیگا بھی۔ وہ میمونہ سے خفا ہو کر جس جذباتی خلفشار کے ساتھ اس کے گھر سے چلا تھا' وہ عجیب کیفیت تھی۔ چنانچہ دیر تک—— دور تک وہ پیدل چلتا چلا گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ گھر پہنچنے تک وہ بری طرح بھیگ گیا۔

صبح اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس سے اٹھا بھی نہیں گیا۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ قمر آپا نے اسے آ کر دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ "ارے' تمہیں تو بہت شدید بخار ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تھرمامیٹر لگا کر دیکھا تو پتا چلا کہ ٹمپریچر ایک سو چار ہے۔

اماں بھی آ گئیں۔ اماں اور قمر آپا ٹھنڈی پٹیاں اس کی پیشانی پر رکھتی رہیں مگر بخار کم ہی نہیں ہوا۔ شام کو اماں ڈاکٹر باسط کو لے آئیں۔ وہ دوا دے کر چلے گئے۔ "دیکھئے کل تک بخار اتر جائے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ خدانخواستہ یہ ٹائی فائیڈ ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد قمر آپا نے بگڑ کر کہا۔ "خوب بے اعتدالیاں کرتے

پھرو۔ نہ اپنا خیال ہے نہ دوسروں کا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" اختر کے لئے بولنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

"رات کے وقت آئے تھے؟"

"ہاں ـــ دیر ہو گئی تھی۔" اختر نے شرمندگی سے کہا۔

"گئے کہاں تھے؟"

"اے جانا کہاں ہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔" اماں نے آہ بھر کر کہا۔ "وہ ہو گا میمونہ کی طرف۔"

اس پر اختر نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں۔" قمر آپا نے منہ بنا کر کہا۔ "گھر آیا تو کپڑ تھے۔ میمونہ کے گھر کیا بارش میں بھیگتا رہا ہو گا۔"

اختر نے شکر گزاری سے بہن کو دیکھا۔ اماں کو تو میمونہ سے خدا واسطے تھا۔ قمر آپا ہی ہمیشہ اس کا دفاع کرتی تھیں۔ "پیدل چلنے کو جی چاہ رہا تھا آپا۔ بس ٹہلتا رہا۔ بارش تو ہو نہیں رہی تھی کہ ڈرتا بلکہ پھوار میں لطف آ رہا تھا۔ بس بن گیا۔"

"پیدل کوئی یونہی نہیں چلتا۔" اماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اس نے بات کی ہو گی ایسی۔" اماں کا وجدان عجیب تھا۔ اندھا دھند بھی تیر چلاتیں تو نشا بیٹھتا۔

"ہونے والی بات تھی اماں۔ بس دعا کریں آپ تو میمونہ کے پیچھے پڑ ہیں۔" قمر آپا نے کہا۔

"میمونہ آپ کو بالکل اچھی نہیں لگتی اماں؟" اختر نے مظلومیت سے پوچھا۔

"اچھی تو بہت لگتی ہے۔ اتنی کہ بہو بن جائے تو اسے تنکے کا بوجھ بھی نہ ا دوں۔" اماں بولیں۔ "اور لگتی کیا ہے۔ وہ ہے ہی اچھی مگر جانتی ہوں کہ دنیا سے ادھر ہو جائے' وہ اختر کو قبول نہیں کرے گی۔"

"کیوں اماں ـــ ایسی کیا بات ہے؟" قمر آپا نے پوچھا۔

"ارے' بتانے کو کیا ہے۔" اماں کھو سی گئیں۔ "امجد بھائی کی بڑی بیٹی



شہلا۔ وہ اپنے خالہ زاد بھائی کو پسند کرتی تھیں۔ صغیرہ کو بھی لڑکا بہت پسند تھا۔ بہن کی اولاد کسے اچھی نہیں لگتی۔ صغیرہ کی بہن بیوہ ہو گئیں۔ تھیں بہت خوددار۔ پلے کچھ بھی نہیں تھا۔ کرائے کا مکان تھا۔ گزر بسر کے لئے سلائی کرنے لگیں۔ سرمد اٹھارہ کا ہوا تو وہ بھی چل بسیں۔ صغیرہ سرمد کو اپنے گھر لے آئیں۔ امجد بھائی کو اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ لڑکا شہلا سے محبت کرنے لگا۔ صغیرہ اللہ بخشے' اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ ایک دن اس موضوع پر بات ہوئی۔ امجد بھائی نے کھل کر کہا کہ مستقبل بناؤ تو یہ ممکن ہے ورنہ نہیں۔ سرمد چلا گیا۔ امجد بھائی نے تین سال گزرنے پر شہلا کی شادی کر دی لیکن شہلا خوش نہیں تھی۔ دو سال کے اندر گھل گھل کر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد تو پورا گھرانا بکھر کر رہ گیا۔ صغیرہ گئیں' پھر امجد بھائی بھی چلے گئے۔ ارشد کینیڈا چلا گیا۔"

"مگر اس میں ہمارا ـــ اختر کا کیا قصور ہے؟" قمر آپا نے پوچھا۔

"اے ہے' تم لوگ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔" اماں جھنجلا گئیں۔ "امجد بھائی نے خالہ کے بیٹے کو ٹھکرایا تھا۔ میمونہ چچا کے بیٹے کو ٹھکرا رہی ہے۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم؟"

"تو اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ اختر میں کیا کمی ہے۔"

"یہ میمونہ' سرمد پر جان دیتی تھی۔ میں تو کہتی ہوں' وہ ددھیال سے بدلہ لے رہی ہے۔"

"ربش۔" اختر نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ "ایسے کون سوچتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں غلط ہوں تو جیت کر دکھاؤ میمونہ کو۔" اماں نے چیلنج کیا۔

"میں بات کروں گی میمونہ سے؟" قمر آپا بولیں۔

"نہیں آپا' پلیز۔" اختر گڑگڑایا۔ "یہ معاملہ آپ مجھ پر ہی چھوڑ دیں۔"

قمر آپا کڑھ کر رہ گئیں۔ وہ دیر تک سوچتی رہیں کہ یہ سب کیا ہے۔ کچھ افتاد ہے اس خاندان پر۔ بھرے پرے گھر تباہ ہو گئے۔ امجد چچا کے گھر کی مثال سامنے تھی۔ خود اپنے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ کون خوش ہے ـــ کسے ملیں خوشیاں؟

قمر آپا کی شادی ہوئی تھی مگر دس برس گزرنے کے باوجود اولاد نہیں ہوئی۔ دس

برس بعد ان کے شوہر نے انہیں طلاق دے کر دوسری شادی کر لی مگر یہ نہیں کہ وہ دس برس اچھے گزرے ہوں۔ ان کی ساس کو پوتے کی بڑی آرزو تھی۔ انہوں نے ایک سال میں ہی ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ زندگی عذاب ہو کر رہ گئی۔ ساس کیا' نندیں کیا اور دیور کیا۔ سب نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ وہ گھر میں استعمال کی ناکارہ چیز کی طرح پڑی رہتیں۔ بات کرنا یا کسی بات کا جواب دینا تو دور کی بات ہے' کوئی انہیں دیکھتا تک نہیں تھا۔ شوہر اچھے تھے۔ اس لئے دس سال گاڑی گھسٹ گئی مگر شوہر کا کام ایسا تھا کہ گھر میں ٹکنا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ تو شہر شہر پھرتے تھے۔ پندرہ دن بعد گھر آتے' دو دن آرام کرتے اور پھر سفر۔ وہ جانتی تھی کہ تنہائی--- اور وہ بھی بھرے گھر کی تنہائی کتنی عذاب ناک ہوتی ہے۔ طلاق ہوئی تو انہوں نے سکون کی سانس لی۔ جو ہونا تھا' ہو گیا--- وہ کم از کم ہر روز' ہر پل مرنے سے تو بچ گئیں مگر انہیں ایک خلش تھی۔ شوہر کے ہاں دوسری بیوی سے بھی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ آٹھ سال ہو چکے تھے۔

خیر قمر گھر آ گئیں۔ اکلوتی تھیں۔ تینوں بھائی ان پر جان دیتے تھے۔ ابا اور اماں کا بھی یہی حال تھا مگر پھر یہ گھر بھی اجڑ گیا۔ دونوں بڑے بھائی موٹر سائیکل کے حادثے میں ختم ہو گئے۔ ان کے غم نے ابا کو مار دیا۔ اب اختر اور اماں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

قمر کو اٹھائیس سال کی عمر میں طلاق ہوئی تھی۔ وہ جوان تھیں۔ خوبصورت تھیں۔ رشتے آئے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ اب شادی نہیں کریں گی۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی تاکہ بوجھ نہ بنیں۔ اب وہ 36 سال کی تھیں۔ رشتے اب بھی آتے تھے مگر وہ اپنے فیصلے میں اور پختہ ہو چکی تھیں۔

"اماں--- سرمد بھائی کا کیا بنا؟ کہاں ہیں وہ؟" انہوں نے اماں سے پوچھا۔

"کسی کو بھی نہیں معلوم۔ اسے آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی۔"

قمر آپا اداس ہو گئیں۔ اک ہماری ہی نہیں ہر کہانی دکھ کی کہانی ہے۔ انہوں نے سوچا۔ سب اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے چل رہے ہیں۔





اس روز کے جی ون کی کلاس گانے کی کلاس بن گئی۔ اس پیریڈ کا کوئی دن مقرر نہیں تھا لیکن مہینے میں دو تین بار یہ آتا ضرور تھا۔ اس کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ اس سے شرمیلے بچوں کی جھجک دور کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اس پیریڈ میں کوئی کچھ بھی سنا سکتا تھا۔ بس سنانا ضروری تھا۔

کچھ بچوں نے مشہور نعتیں پڑھیں کچھ نے قومی نغمے سنائے اور کچھ نے بچوں کی نظمیں۔ آخر میں ایک بچے نے میمونہ سے کہا۔ "مس آپ بھی کچھ سنائیں۔"

"میں---؟ مجھے تو گانا ہی نہیں آتا۔" میمونہ گڑبڑا گئی۔

"نہیں۔ آج تو آپ کو گانا ہی پڑے گا۔" مزید دو بچے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بھئی--- میں نے کبھی گایا ہی نہیں۔" میمونہ نے بے بسی سے کہا۔

"آپ ہی تو کہتی ہیں کہ گاؤ گے تو گانا آئے گا۔"

"مجھے گانا نہیں آتا تھا۔ آپ نے زبردستی سنا تھا مجھ سے۔" ایک اور بچہ بولا۔

پوری کلاس اصرار کر رہی تھی۔ بچت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ جھنجلانے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔ اس نے ایک اصول بنایا تھا۔ وہ بچوں سے سختی سے بات کبھی نہیں کرتی تھیں۔ کسی بات سے روکنا ہوتا تو بھی نرمی سے کام لیتی اور دلیل سے بات کرتی۔ یہاں کوئی دلیل تھی ہی نہیں اس کے پاس۔ الٹا بچوں کے پاس دلائل کا انبار تھا۔ شرمیلے بچوں کو قائل کرنے کے لئے جو دلیلیں وہ دیتی رہی تھیں' وہ اب اسے سننا پڑتیں۔

اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے کے بعد اس نے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے گانا ہی پڑے گا مگر کیا گائے؟ اس نے کبھی گانا نہیں سنایا تھا۔ اچانک روشنی سی چمکی۔ وہ اور کچھ سنا ہی نہیں سکتی تھی۔ یہی کچھ تو آتا تھا اسے۔ سب سے زیادہ سنا بھی یہی تھا۔

"ٹھیک ہے بچو۔" اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں سناتی ہوں۔"

"کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ بچے اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے۔ بہرحال

سبھی اس کی طرف متوجہ تھے۔

اس نے دھیمی آواز میں سیکڑوں--- بلکہ ہزاروں بار سنی ہوئی ساغر صدیق غزل شروع کی۔ مطلع پڑھتے ہوئے اسے احساس تھا کہ اس کی آواز لرز رہی ہے کلاس کی خاموشی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے مخصوص دھن میں مطلع گ

چراغ طور جلاؤ' بڑا اندھیرا ہے

نقاب رخ سے ہٹاؤ' بڑا اندھیرا ہے

بڑا اندھیر ہے--- گاتے گاتے وہ کہیں دور--- بہت دور--- وقت ک دائرے میں بہت پیچھے چلی گئی۔ گردوپیش کا احساس ہی نہیں رہا۔ اسے یہ بھی پ چلا کہ اس کی لرزتی آواز میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ بچے ح زدہ سے سن رہے ہیں۔ اگرچہ ان کی سمجھ میں ایک مصرع بھی نہیں آیا ہے۔ وہ وہا تھی ہی نہیں---



بھائی جان اس رات بہت اداس تھے۔

بھائی جان اکثر اداس ہوتے رہتے تھے۔ میمونہ کو ان کی اداسی کے بعد کے معمولات ازبر ہو گئے تھے۔ یہ بھی تھا کہ بھائی جان کی اداسی کا تعلق چاند سے تھا۔ یوں کہا جائے کہ چاند کے نہ ہونے سے تھا۔ جن راتوں میں چاند نہیں نکلتا' وہ ان ک لئے اداسی کی راتیں ہوتی تھیں۔ ایسے میں وہ کہانی نہیں سناتے تھے۔ کہانی کیا' وہ ک سے بات بھی نہیں کرتے' بس کچھ گنگناتے رہتے تھے۔ اس کیفیت میں وہ ایک غز بڑے موڈ میں گنگناتے تھے۔ میمونہ کی سمجھ میں اس وقت اس کے بول تو نہیں آ تھے لیکن بھائی جان کی اداسی میں بھیگی ہوئی آواز بہت اچھی لگتی تھی۔

مگر اس رات وہ گنگنا بھی نہیں رہے تھے۔ "بھائی جان پلیز' کوئی کہا سنائیں۔" میمونہ نے فرمائش کی۔

بھائی جان تک اس کی آواز پہنچی ہی نہیں مگر آپی نے اسے اشارہ کیا کہ اصرار کرے۔



میمونہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ "بھائی جان کہانی سنائیں نا پلیز۔"

بھائی جان اس وقت آسمان پر نجانے کیا دیکھ رہے تھے۔ شاید وہی کچھ جو آپی اس وقت دیوار پر' آسمان پر یا کسی بھی چیز کے پار دیکھنے کی کوشش کرتی تھیں' جب بھائی جان موجود نہیں ہوتے تھے ہاتھ پکڑ کر ہلانے پر بھائی جان نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے مونا؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کہانی سنایئے بھائی جان۔"

"اس وقت تو نہیں سنا سکتا گڑیا۔"

"کیوں نہیں سنا سکتے؟" اس نے جرح کی۔

"ہر چیز کا ایک موسم ہوتا ہے مونا۔" بھائی جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اور یہ کہانی کا موسم نہیں ہے۔ کہانی تو سوچنی پڑتی ہے۔ اس وقت ہم سوچنے کے قابل نہیں ہیں۔"

"موسم کا کیسے پتا چلتا ہے بھائی جان؟" میمونہ نے پوچھا اور کن انکھیوں سے آپی کو دیکھا۔ وہ بھائی جان کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"بس خودبخود پتہ چل جاتا ہے۔ کہانی کا موسم ہو تو دل میں کوئی خیال آتا ہے۔ وہ جھٹکنے پر بھی نہیں ہٹتا اور کہانی بنتی رہتی ہے۔" وہ پھر آسمان کو دیکھنے لگے۔ میمونہ نے رہنمائی کے لئے آپی کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور طرف تک رہی تھیں۔

"بھائی جان' آپ کے ابو اور امی اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔" میمونہ نے پوچھا۔ اس پر آپی نجانے کیوں کھنکھاریں۔ میمونہ نے انہیں دیکھا وہ دائیں بائیں سرہلا رہی تھیں' جیسے اسے کسی بات سے منع کر رہی ہوں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اتنی دیر میں بھائی جان اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں مونا۔" انہوں نے کہا۔

آپی اب بھی سرہلا رہی تھیں۔ بات میمونہ کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہی تھی۔ مگر تجسس ایسا تھا کہ وہ رک نہیں سکتی تھی "جو اللہ میاں کے پاس چلے جائیں' وہ کہاں رہتے ہیں بھائی جان؟" اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"آسمان پر۔" بھائی جان نے بلا جھجک کہا۔

"آپ اس وقت انہیں دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں مونا۔"

"مجھے بھی دکھائیں نا۔"

بھائی جان نے آسمان پر سب سے روشن دو ستاروں کی طرف اشارہ کیا "وہ ہماری امی ہیں--- اور وہ ابو۔"

"وہ تو ستارے ہیں بھائی جان۔"

"اچھے لوگ اللہ میاں کے پاس جائیں تو وہ انہیں ستارہ ہی بناتے ہیں جو جتنا اچھا ہو گا' وہ اتنا روشن ستارہ بنے گا۔"

"اللہ میاں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آپ ان کے بغیر اکیلے اور اداس ہو جائیں گے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے مونا گڑیا۔ اللہ میاں تو آدمی کے لئے بہتر ہی سوچتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی آدمی کو وہ بہتری نظر نہیں آتی۔ وہ زیادہ جانتا جو نہیں ہے۔"

میمونہ نے آپی کو دیکھا۔ وہ اب اور شدت سے انکار میں سر ہلا رہی تھیں مگر اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ "ہم تو اپنے امی ابو کے ساتھ رہتے ہیں آپ کیوں نہیں رہتے بھائی جان؟"

"امی ابو بہت اچھے تھے اللہ میاں نے انہیں ستارہ بنا دیا۔" وہ بولے۔ "ہم اتنے اچھے نہیں تھے اس لئے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔"

اچانک آپی کا ہاتھ بڑھا اور اس نے بڑی مضبوطی سے بھائی جان کا ہاتھ تھام لیا "کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" انہوں نے گنگناتی آواز میں کہا۔

ہاتھوں کی یہ آنکھ مچولی اکثر ہوتی تھی۔ میمونہ چپکے چپکے انہیں دیکھتی رہتی۔ آپی کا ہاتھ بہت چھوٹا سا' نازک سا لیکن بے حد شریر تھا اور بھائی جان کے ہاتھ بڑے بڑے' بھاری اور بے حد خوب صورت تھے۔ آپی کا نازک سا شریر ہاتھ بھائی جان کے ہاتھوں میں بہت بھلا لگتا۔ میمونہ کا جی چاہتا کہ آپی کا ہاتھ ہمیشہ بھائی جان کے ہاتھوں میں رہے۔ بھائی جان جب بھی اداس ہو کر گنگناتے تو آپی کا ہاتھ حرکت میں آ جاتا اور ان کا آنچل لہرانے لگتا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا آنچل سنبھالتیں۔ ایسے میں وہ بھائی



جان کا ہاتھ ایسے یقین سے تھامتیں' جیسے ابو کبھی راستے میں پانی یا کیچڑ آ جانے پر میمونہ کا ہاتھ تھام کر پار اتارتے۔ آپی کا وہ چھوٹا سا' نازک سا اور شریر سا ہاتھ اس لمحے میمونہ کو بہت بڑا اور مضبوط نظر آتا۔ لگتا وہ بھائی جان کو سہارا دے رہا ہے۔ بھائی جان کا بڑا سا ہاتھ اس لمحے بہت نازک لگنے لگتا۔

"بھائی جان' کچھ تو سنایئے نا۔" ارشد نے ضد کی۔

"ہاں بھائی جان۔" میمونہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

بھائی جان نے باری باری ان دونوں کو بہت غور سے دیکھا پھر بولے۔ "چلو' بے سوچے سمجھے جو سنا سکتا ہوں' سنا دیتا ہوں۔"

میمونہ اور ارشد چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ آپی بھائی جان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ چند لمحے بعد بھائی جان نے غزل شروع کی-- چراغ طور جلاؤ' بڑا اندھیرا ہے--- اور لگا کہ سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ زمین کی گردش' ہوا کی گنگناہٹ' پتوں کی سرگوشیاں--- سب ساکت ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف بھائی جان کی آواز اور دلاسے دینے والے ہاتھ کی حرکت--- کہیں اور کچھ نہیں تھا۔

بھائی جان دھیمی آواز میں گاتے رہے---

جسے زبان خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ' بڑا اندھیرا ہے
مجھے تمہاری نگاہوں پہ اعتبار نہیں
مرے قریب نہ آؤ' بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ' بڑا اندھیرا ہے
کوئی ستارہ نہ آ جائے پاؤں کے نیچے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ' بڑا اندھیرا ہے

پوری غزل کے دوران آپی کا نازک ہاتھ شرارتیں بھول کر بھائی جان کے ہاتھ کو تھپکتا رہا۔ نجانے کب غزل ختم ہوئی' پتا بھی نہیں چلا۔ جیسے فضا پر سحر طاری ہو گیا تھا۔ خاموشی سی خاموشی تھی۔ پھر اچانک آپی نے دھیرے سے کہا۔ "آپ یہ غزل نہ

گایا کیجئے۔"

بھائی جان چند لمحے آپی کو دیکھتے رہے پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ اچانک چاند نکل آیا۔ سب کچھ روشن روشن لگنے لگا۔ خاموشی ختم ہوئی اور چاندنی گنگنا کر آپی کے چہرے کو چومنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے گلابی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد امی نے آواز دی۔ "آ جاؤ بھئی' سونا نہیں ہے کیا۔ کل اسکول بھی جانا ہے۔"

آپی کا ایک عجیب معمول تھا۔ بھائی جان صبح کالج چلے جاتے تو آپی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں۔ میمونہ کو اس کا علم اسکول کی چھٹیوں میں ہوا۔ اسے بڑا تجسس تھا کہ آپی کمرا بند کر کے کیا کرتی ہیں۔ وہ روز ان کے کمرے کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی لیکن اندر کا حال نہ کھلتا۔

اس روز شاید آپی دروازہ بند کرنا بھول گئیں۔ میمونہ دروازے سے ٹکی تو وہ کھل گیا لیکن آپی ایسی محو تھیں کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے دیکھا کہ آپی اپنی میز پر کہنیاں رکھے اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرے کو بھرے بیٹھی ہیں۔ ان کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور بھائی جان بہت--- بہت دھیمی آواز میں وہی غزل گا رہے تھے--- چراغ طور جلاؤ--- میمونہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہوں--- تو یہ بھائی جان کالج جانے کے بجائے آپی کے کمرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپی کو غزل سناتے ہیں۔ اس نے سوچا مگر پورا کمرا دیکھنے پر بھی اسے بھائی جان نظر نہیں آئے۔ البتہ آپی چونک گئیں۔ "میمونہ--- تم اندر کیسے آئیں؟"

"دروازے سے۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ "دروازہ کھلا تھا اور بھائی جان کی آواز آ رہی تھی۔ اس لئے آ گئی۔"

آپی نے ذرا برہمی سے کہا۔ "اب جاؤ---"

"چلی جاؤں گی--- مگر بھائی جان کو لے کر۔"

اس پر آپی ہنس دیں۔ "ارے پگلی' وہ یہاں کہاں۔ وہ ہاتھ کب آتے ہیں۔ میں نے تو ان کی آواز کو قید کر رکھا ہے بس۔ لو' یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر انہوں نے میز کے نیچے رکھے ٹیپ ریکارڈر کو آف کر دیا۔ آواز خاموش ہو گئی۔



"آپ بھی عجیب ہیں۔ بھائی جان کو منع کرتی ہیں کہ یہ غزل نہ گایا کریں اور خود کمرہ بند کر کے یہ غزل سنتی ہیں۔" میمونہ نے کہا۔

"چپ--- کسی سے بھی نہ کہنا یہ بات۔" آپی بولیں۔

"بھائی جان سے بھی نہیں؟"

"ہاں۔ ان سے بھی نہیں۔" آپی نے کہا۔ "اچھا آؤ--- یہاں میرے پاس بیٹھو۔ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے آج۔"

اس روز آپی نے اسے لپٹا کر خوب ساری باتیں کیں۔ میمونہ کی سمجھ میں زیادہ تر باتیں نہیں آئیں مگر اسے وہ سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آپی مسلسل بھائی جان کی باتیں کئے جا رہی تھیں۔

اب میمونہ کی سمجھ میں وہ سب کچھ آ چکا تھا۔ اب وہ ماضی کی ہر بات سمجھ سکتی تھی۔



اگلے ہی لمحے یہ خوش گمانی کلاس کے ایک چھوٹے سے بچے نے دور کر دی۔

اس نے غزل ختم کی تو دیر تک خاموشی رہی' جیسے اس رات رہی تھی۔ پھر کلاس روم بچوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ میمونہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بیس بائیس سال پہلے کا جادو آج بھی ویسا ہی موثر تھا--- سر چڑھ کر بولتا تھا۔

خاموشی ہونے میں کچھ دیر لگی۔ پھر میمونہ نے پوچھا "یہ غزل بہت پسند آئی تمہیں؟"

"جی مس--- بہت اچھی تھی۔"

"آپ کی آواز بہت اچھی ہے مس۔"

"آپ بہت اچھا گاتی ہیں مس۔"

تعریف و توصیف کے ان جملوں کے بعد اچانک ایک بچے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ "مس اندھیرے میں بھی ستارہ تو پاؤں کے نیچے نہیں آ سکتا۔"

اس نے بچے کو دیکھا۔ اس لمحے اس اعتراض کی معنویت اس پر نہیں کھلی

تھی۔ "کیوں بھئی---؟" مگر یہ کہتے کہتے اسے احساس ہوا کہ بچے کا اعتراض درست رکھتا ہے۔ اگلے چند لمحوں میں جواب ٹٹولنے کے دوران اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کم از کم اس کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" اس نے بچے سے کہا۔ "کم از کم میں اس […] جواب نہیں دے سکتی اور جن کا یہ شعر ہے' وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ ہاں' ا[…] شخص ایسا ہے' جو اس کا جواب دے سکتا ہے۔ دعا کرو کہ وہ آ جائے۔ میرا وعدہ […] کہ وہ آ گیا تو اس سے پوچھ کر تمہیں بھی بتاؤں گی۔"

"اور میمونہ بیگم' یہ سمجھنے کا گمان نہ کیا کرو۔" اس نے خود سے کہا۔ "بہت […] تو آدمی عمر بھر نہیں سمجھ پاتا---"



دوپہر کے کھانے کے بعد میمونہ نے بوا سے کہا۔ "بوا' میں ذرا سوؤں گی۔ […] سے پہلے مجھے جگانا نہیں۔"

"ارے' ہم جاگ رہے ہوں گے تو جگائیں گے نا۔ ہم خود سو جاتے ہیں کھا[…] کے بعد۔"

اپنے کمرے میں آنے کے بعد میمونہ نے دروازہ بند کر لیا پھر اس نے ڈری[…] ٹیبل کی نچلی دراز چابی لگا کر کھولی۔ اس میں یادوں کا خزانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈریسنگ ٹیبل کی واحد دراز تھی جو مقفل رہتی تھی۔

دراز میں پریوں کی کہانیوں کی ایک باتصویر رنگین کتاب تھی۔ وہ بھائی جان […] اسے دی تھی۔ اس نے ورق گردانی کی۔ جا بجا چنبیلی--- پھول خاک ہو گئے تھے […] صفحات میں ان کی مہک اب بھی تھی۔ اگرچہ اب وہ باسی باسی لگتی تھی اور صفحوں […] پھولوں نے داغ بھی چھوڑ دیئے تھے۔

میمونہ کے ذہن میں دو اشعار گڈمڈ ہونے لگے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں



"میرے ایسے نصیب کہاں!" وہ بڑبڑائی۔ "خوابوں میں بھی تو نہیں ملتے۔"

پھر اس نے دوسرا شعر دہرایا۔

ہم پھول ہیں اوروں کے لئے لائے ہیں خوشبو
اپنے لئے لے دے کے بس اک داغ بچا ہے

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔ "یہ تو سرمد بھائی کی زندگی کی تفسیر لگتا ہے۔"

اس نے مزید ورق الٹے۔ ایک جگہ وہ رک گئی۔ دو صفحات کے درمیان کچھ بال رکھے ہوئے تھے۔ ایک لائٹ براؤن چھوٹا بال اور کچھ گہرے سیاہ' بے حد لمبے بال۔ سرمد بھائی اور آپی کے بال۔ وہ دونوں مل نہیں سکے تھے مگر اپنی پریوں کی کہانیوں والی کتاب میں اس نے ان دونوں کے بالوں کو ملا دیا تھا۔

سرمد بھائی جب گھر چھوڑ کر گئے تو وہ نو سال کی تھی۔ وہ جانے لگے تو اس نے پوچھا۔ "آپ کب آئیں گے؟"

"دیکھو' کیا کہہ سکتے ہیں۔ دنیا اتنی بڑی ہے اور راستہ بھولتے دیر نہیں لگتی۔"

وہ اداس ہو گئی۔ "میرا دل نہیں لگے گا آپ کے بغیر۔"

"دل لگانا بھی نہیں مونا۔ یہ دل بڑا دکھی کر دیتا ہے۔"

"میں بہت اداس رہوں گی۔"

"ہم سے زیادہ؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم ہمیں بھول جاؤ گی کچھ عرصے کے بعد۔ پھر اداسی بھی مٹ جائے گی مگر ہمارا تو اب انت ہی یہی ہے۔"

وہ روہانسی ہو گئی۔ "آیئے گا ضرور بھائی جان۔"

وہ مسکرائے "آئیں گے--- مگر بلانے پر۔"

"آپ کا پتا ہے آپی کے پاس؟"

"ہمارا پتا ہمارے اپنے پاس ہی نہیں ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسے پھر اپنے سر سے ایک بال توڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔ "ہمیں بلانا ہو تو یہ بال جلا دینا۔ آ جائیں گے۔"

ان کے جانے کے بعد وہ ان کے کمرے میں گئی تو ان کے تکیے پر اور بھی بال بکھرے نظر آئے۔ ان دونوں بال کچھ گر بھی رہے تھے ان کے۔ اس نے وہ سب سمیٹ لیے کہ اس طرح زیادہ بار بلا سکے گی انہیں۔ آپی کے بال اس نے بعد میں بھی کئے تھے' جب ان کی شادی ہو رہی تھی--- چپکے چپکے کئی بار اس نے بال جلائے مگر کوئی حاضر نہیں ہوا۔ اب سرمد بھائی کا بس ایک ہی بال رہ گیا تھا اور آپی وہاں تھیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اب وہ بال بس یادگار تھے آپی کی۔

کتاب کے دو صفحوں کے درمیان ٹافیوں کے کچھ ریپر رکھے تھے۔ پھر ایک جگہ تہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ وہ اس کاغذ کو خوب پہچانتی تھی۔ یہ کاغذ اس نے بھائی جان کے پاس سے چرایا تھا مگر انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ان کے پاس ایسے بہت سے کاغذ تھے۔

اس نے کاغذ کی تہ کھولی اوپر تاریخ لکھی تھی-- 22 نومبر 1974ء نیچے ہونٹ تھے--- آپی کے ہونٹ۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ آپی نے لپ اسٹک لگائی ہے اور اس کے بعد کاغذ پر اپنے ہونٹ چپکا دیئے ہیں۔ وہ بھی نہ مٹنے والا نقش تھا۔ وہ کاغذ سیکڑوں' ہزاروں--- بلکہ شاید لاکھوں بوسوں کا امین تھا۔

وہ چند لمحے اس کاغذ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بڑے احترام سے ہونٹوں کے اس نقش پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کے چہرے پر ایسا تقدس تھا کہ خود پر بھی پیار آنے لگا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں صرف ایک پل اپنے عکس کو دیکھا پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔

اس کاغذ نے ہی اسے پہلی بار بتایا تھا کہ بین السطور کیا ہوتا ہے۔ لکھے ہوئے ایک جملے میں چھپی ہوئی باتیں ہزار جملوں پر محیط بھی ہو سکتی ہیں۔ کچھ تو نظر آ رہا ہوتا ہے مگر وہ بھی ہوتا ہے جو ہوتا ہے اور نظر نہیں آ رہا ہوتا ہے۔

وہ ہونٹوں کے اس سرخ' سلگتے ہوئے زندہ عکس کو برسوں سے چوم رہی تھی--- 22 برسوں سے مگر نو سال پہلے ایک موقع پر ان ہونٹوں پر ہونٹ رکھے رکھے اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور سینے میں دل دھڑ دھڑانے لگا۔ اس نے ایسے ہی نظریں اٹھا کر آئینے میں دیکھا اور حیران رہ گئی۔ بند کمرے میں



دوپہر کے وقت اس کے چہرے پر ویسی ہی چاندنی اتر آئی تھی' جیسی آپی کے چہرے پر اتری تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی کا رنگ گلابی ہو گیا۔ اس لمحے وہ خود کو ایسی حسین لگی کہ اس نے ہونٹ ہونٹوں پر سے ہٹائے اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

بات صرف اتنی تھی کہ ہونٹوں کے اس عکس کو چومتے وقت اچانک اس کے ذہن میں ایک سوال' ایک خیال نے سر اٹھایا تھا۔ یہ کاغذ--- اور ایسے اور کاغذ سرمد بھائی نے کیوں سنبھال کر رکھے تھے؟ کیا کرتے تھے وہ ان کا؟

اس سوال کا جواب اس کے شعور تک پہنچ بھی نہیں سکا تھا کہ وہ لجا کر رہ گئی۔ اسے خود سے بھی حیا آنے لگی تھی۔

پھر جواب بھی شعور تک پہنچ گیا۔ سرمد بھائی بھی وہی کچھ کرتے تھے' جو وہ تیرہ برس سے کرتی آ رہی تھی۔ انہوں نے بھی سیکڑوں بار اس کاغذ کو چوما ہو گا۔

اس نے کاغذ سامنے پھیلا کر دیکھنا چاہا لیکن حیا سے جھکی ہوئی پلکیں نہیں اٹھیں۔ اس نے سوچا' وہ جو دیکھنا چاہتی ہے' اس سے کیسے دیکھا جائے گا۔ وہ جو پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا' جانتی تھی کہ آج نظر آئے گا--- مرئی عکس کے اوپر غیر مرئی عکس جو مرئی عکس سے زیادہ روشن تھا' اب غیر مرئی نہیں رہے گا۔

وہ حیا کے بوجھ سے لرزنے لگی۔ آپی کے ہونٹوں کا لمس سرخ' دہکتا ہوا اور پوری طرح نمایاں تھا مگر اس لمس کے اوپر سیکڑوں غیر نمایاں اور بے رنگ لمس سرمد بھائی کے ہونٹوں کے تھے' جنہیں صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ تو وہ اب تک جو آپی کے ہونٹوں کو چومتی رہی تھی' درحقیقت اس کے ہونٹ ہر بار سرمد بھائی کے ہونٹوں کے چھوڑے ہوئے غیر مرئی لمس سے متصل ہوتے رہے تھے۔

وہ آگہی کا لمحہ تھا۔ اس احساس کے بعد اس کے اندر ناپسندیدگی نہیں' خود پسندگی ابھری تھی۔ اس نے جان لیا کہ وہ سرمد سے محبت کرتی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ بس ایک سال پہلے محرومی اور حسرتوں کا کفن اوڑھ کر موت کی آغوش میں اترنے والی بہن کا ترکہ تھا۔ وہ محبت تو آپی نے اسے سونپی تھی--- تاکید کے ساتھ--- وصیت کر کے--- ہاں' یہ ضرور تھا کہ سرمد اس کے لیے نہایت پسندیدہ

تھا' لہٰذا اس نے مرنے والی عزیز بہن کی تاکید کو حرز جاں بنا لیا تھا۔

مگر اس لمحے اس نے جان لیا کہ سرمد کی محبت تو بچپن سے اس کے اندر تھی--- بلکہ ممکن ہے' قدرت نے وہ اسے وجود کے ساتھ ہی ودیعت کی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے پوری سپردگی کے ساتھ اس احساس کے تحت ہونٹوں کے عکس کو چوما کہ اس پر سرمد کے ہونٹوں کا لمس ہے۔ یہ الگ بات کہ اس نے آنکھوں کے ساتھ ایسا کیا تھا اور یہ روایت آج تک قائم تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے' اس کاغذ کی امانت کو چومتی تھی۔

حال کے اس لمحے میں اس نے اس کاغذ کو بہت غور سے دیکھا۔ اسے اس پر ہونٹ ہی ہونٹ جگمگاتے نظر آئے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کاغذ کے اس م... آفریں گلاب پر اپنے دہکتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

اس نے کاغذ کو تہ کر کے کتاب میں رکھا اور کتاب کو بڑی نرمی' نزاکت احترام سے بند کر دیا۔ کتاب ہاتھ میں لیے لیے اس نے دراز میں جھانکا۔ کچھ تصو... تھیں--- یادگاریں--- آپی کی' سرمد بھائی کی' ارشد بھائی کی' ابو اور امی کی اور اس کی اپنی۔ ان دنوں سرمد بھائی کو فوٹوگرافی کا شوق ہوا تھا۔

ان تصویروں کو وہ کبھی نہیں دیکھتی تھی۔ ضرورت ہی نہیں تھی دیکھنے کی۔ ا... جب چاہتی' لمحے زندہ اور متحرک ہو جاتے۔ ایسے میں ساکت تصویروں کی کیا اہمی... جاتی ہے۔ اس نے تصویریں ایک طرف ہٹائیں اور ایک ڈیسک نکال لی۔ پھر دراز میں رکھ کر اس نے دراز بند کی لیکن اسے مقفل نہیں کیا۔ وہ اپنے سی ڈی... کی طرف بڑھ گئی۔ اگلے ہی لمحے سرمد بھائی کی آواز ابھری--- چراغ طور جلاؤ

کرسی پر بیٹھ کر اس نے جڑے ہوئے ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ... اور--- اس کا پورا وجود' رواں رواں سماعت بن گیا۔

یہ کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ اندر کیا کر رہی ہے؟ آپی کی روایت دہرا... ہے؟ نہیں--- آپی کی نہیں' یہ اس کی اپنی روایت ہے۔ آپی تو جا چکیں لیکن جاتے انہوں نے اپنی روایت' اپنا وجود' اپنی ہر قیمتی چیز اسے سونپ دی تھی۔

وہ محسوس کرتی تھی--- نہیں' جانتی تھی کہ وہ آپی کے مقابلے میں



زیادہ--- بہت زیادہ محبت کرتی ہے سرمد بھائی سے۔ کیوں نہ ہو۔ آپی نے سرمد بھائی کی پوری کی پوری--- بے پایاں محبت اس کے دل کی جھولی میں ڈال دی تھی--- یہ سمجھے اور جانے بغیر کہ وہ کوئی خالی جھولی نہیں' وہ تو پہلے ہی سرمد بھائی کی محبت سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی محبت آپی کی محبت سے بڑی اور طاقتور تھی۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے اس کے لاشعور کے نہاں خانے میں پل رہی تھی۔ اور لاشعور میں پلنے والے جذبے بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ آپی نے تو اسے دو آتشہ کر دیا تھا۔

اور پھر وہ خود سے سرمد بھائی کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ جیسے ایک بار وہ آپی کے کمرے میں چلی گئی تھی اور آپی نے اس سے سرمد بھائی کے متعلق باتیں کی تھیں۔ اب وہ پرانے حوالوں سے انہیں سمجھنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

وہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گئی۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے سوچا--- میں سرمد بھائی کے ساتھ کیسی لگوں گی۔ اگلے ہی لمحے سرمد کا عکس اس کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے چھوٹا لگ رہا تھا--- تھا بھی۔ اس لیے کہ وہ اب 27 برس کی تھی اور سرمد بھائی کو اس نے آخری بار اس وقت دیکھا تھا' جب وہ 23 سال کے تھے۔ وہ انہیں اس سے بڑا دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ ان کی شخصیت پر غور کرنے لگی۔

سرمد بھائی کی ایک بات ہمیشہ اسے تنگ کرتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ بہت مشکل باتیں کرتے تھے--- بہت بڑی باتیں۔ اس سے بھی اور ارشد بھائی سے بھی' جب کہ وہ ان باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ تو بے وقوفی ہوئی نا! اکثر وہ سوچتی کیوں کرتے تھے وہ ایسا؟

مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی۔

سرمد بھائی آئیڈیلسٹ تھے۔ سوچنے والے تھے۔ خوب صورتی ان کی کمزوری تھی۔ نازک خیالی ان کی طاقت تھی اور وہ کم عمری میں ہی بڑے ہو گئے تھے۔ وہ کہانیاں بھی لکھتے تھے۔ ان کی سوچ اپنی عمر سے بڑی تھی۔ باتیں وہ کم کرتے لیکن جب کرتے تو اندر کی گھٹن نکالتے۔ ایسے میں انہیں نظر نہیں آتا کہ سامع چھوٹا ہے یا بڑا۔ ان کی بات سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ان کا کچا پن تھا۔ اب میمونہ سمجھ سکتی

تھی۔ وقت سے پہلے بڑے ہو جانے والوں کا کچا پن تو پوری طرح دور نہیں ہوتا۔

نجانے اب وہ کہاں ہوں--- کس حال میں ہوں۔

وہ چونکی-- سرمد بھائی کی آواز اب وہی شعر سنا رہی تھی' جس پر ایک اعتراض کیا تھا۔ کوئی ستارہ نہ آجائے پاؤں کے نیچے۔ وہ بے بسی محسوس کرنے



"اے مون' یہ اختر میاں نہیں آئے کئی دن سے۔" بوا نے اچانک کہا۔

میمونہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "واقعی بوا۔ مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"تمہیں کب خیال آتا ہے کسی کا۔ تمہیں تو اپنا خیال بھی نہیں آتا۔" بولیں۔ "ہمیں تو تشویش ہو رہی ہے۔ تم سے کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

"کیا مطلب؟" میمونہ بھڑک گئی۔

"کوئی لڑائی وڑائی؟ ناراض تو نہیں ہو گئے وہ؟"

میمونہ خود انہی خطوط پر سوچ رہی تھی۔ ہوا تو ایسا ہی تھا۔ اسے اختر گفتگو یاد آنے لگی۔ پورا منظر پھر گیا مگر اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "مجھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم نے ہی اسے خفا کیا ہو گا بوا۔"

"نہیں' ہم سے تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" بوا نے کہا۔ "کہیں بیمار تو ہو گئے اختر میاں۔"

میمونہ بھی پریشان ہو گئی۔ اختر آخری بار گیا تو غصے ہی میں تھا۔ عجیب تھی اس کی۔ خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا اس نے لیکن جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ "میں تمہیں پروپوز کرتا رہوں گا---" یہ ناراضی نہیں تھی--- تھی ایسی نہیں کہ وہ نہ آئے بلکہ اس کا آنا اور ضروری ہو گیا تھا۔ پھر تو طبیعت ہی ہو گی اس کی۔ ورنہ یوں وہ رکنے والا نہیں۔ "ہو سکتا ہے انا بوا۔" وہ بولی۔ " ہے' بیمار ہی ہو۔"

"ارے تو فون ہی کر لو۔ معلوم تو کرو۔"

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو بوا؟"



"پریشان کیوں نہ ہوں۔ تقریباً روز ہی آتا تھا بچہ۔"

"تو تم ہی فون کر لو۔"

"یہ فون تمہیں ہی کرنا ہو گا مون۔" انا بوا نے کڑے لہجے میں کہا۔ "وہ تمہارے چچا کا بیٹا ہے۔"

"ٹھیک ہے بوا' ابھی کرتی ہوں۔ چائے تو پی لوں۔"

چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میمونہ فکر مندی سے سوچتی رہی۔ اسے اختر سے بہت انسیت تھی۔ سچ یہ ہے کہ وہ اسے برا نہیں لگتا تھا۔ لگتا کیا' وہ برا تھا ہی نہیں۔ وہ بہت اچھا تھا۔ اگر روگ نہ لگا ہوتا تو اختر کو وہ بڑے فخر اور محبت سے اپناتی۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اختر جو مانگتا تھا وہ دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے اختر کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف قمر آپا تھیں۔ قمر آپا سے اس کا ملنا کم ہی ہوتا تھا لیکن وہ انہیں پسند کرتی تھی۔ "آپا--- اختر بھائی کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اختر کی طبیعت بہت خراب ہے۔" قمر آپا نے بتایا۔

"خیریت تو ہے؟ کیا ہوا؟"

"ٹائی فائیڈ ہے۔" آپا نے کہا۔ "وہ سو رہا ہے ورنہ تم سے بات کراتی۔"

"کوئی بات نہیں آپا۔ کل چھٹی ہے میں آؤں گی۔"

"ضرور آنا۔" آپا کے لہجے میں خوشی تھی۔ "اور--- تم کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے---"

"اور انا بوا---"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ کل انہیں بھی لاؤں گی۔ اچھا آپا۔ کل ملاقات ہو گی انشاء اللہ۔"

ریسیور رکھ کر وہ بوا کی طرف پلٹی' جو قریب ہی کھڑی تھیں۔ "اختر کو ٹائی فائیڈ ہو گیا ہے بوا۔ کل چلیں گے اسے دیکھنے۔"

بوا سر ہلا کر رہ گئیں۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھیں۔

قمر آپا صبح سے گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ آخر میں اختر کے کمرے کی باری آئی۔ کمرے کی صفائی سے نمٹنے کے بعد وہ دھلی ہوئی چادریں اور تکیے کے غلاف لائیں۔ "ذرا سی دیر ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا بستر ٹھیک کر دوں۔" انہوں نے اختر سے کہا۔

اختر کو کمزوری بہت ہو گئی تھی۔ چڑچڑا پن الگ تھا۔ "کیا مصیبت ہے آپا۔ آرام بھی نہیں کرنے دیں گی مجھے۔"

"دو منٹ لگیں گے۔" آپا نے چمکارا۔ "چادر بدلنی ہے۔ بعد میں تکیوں کے غلاف بدل دوں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ مجھ سے اٹھا نہیں جائے گا۔"

"بہت میلا ہو رہا ہے بستر۔"

"کوئی آ رہا ہے کیا؟" اختر نے جھنجلا کر پوچھا۔ "کوئی گورنر جنرل ہے؟"

"اس سے بھی بڑا۔" آپا نے ہنس کر کہا۔ "وی وی آئی پی ہے بس اب اٹھ جاؤ۔"

"پہلے بتائیں، کون آ رہا ہے۔"

"کس کے لیے اتنا اہتمام ہو سکتا ہے اس گھر میں؟ کس کے لیے اس بیماری میں تمہیں زحمت دی جا سکتی ہے؟ غور کر لو تو سمجھ جاؤ گے۔"

اختر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے انداز میں نقاہت تھی مگر ابھی چند لمحوں میں اس کے چہرے پر بحالی نظر آنے لگی تھی۔ قمر آپا نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ "تم نے پوچھا نہیں کہ کون آ رہا ہے؟"

"ضرورت نہیں۔" اختر نے ناہموار آواز میں کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔"

قمر آپا کو اس پر ترس آنے لگا۔ بستر سے اٹھ کر ذرا دور آنے میں اس کی سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ آواز سے بھی نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ "بہت یقین ہے تمہیں۔۔۔ بہت بھروسا ہے اپنی سمجھ پر۔"

"جی نہیں۔ ہم نے بہت لوگوں سے ایسے تعلقات ہی نہیں پالے۔"

"اور یہ غلط فہمی ثابت ہوئی تو؟"



"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بس تم خوش رہو۔"

تکیوں کے غلاف بدلتے ہوئے آپا اسے بہت غور سے دیکھتی رہیں۔ اس کی کمزوری اپنی جگہ مگر میمونہ کے آنے کی امید سے اس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا تھا۔ بحال نظر آنے لگی تھی۔ تو اتنی اہم ہے اس کے لیے میمونہ! آپا نے سوچا۔ پھر افسردہ ہو گئیں۔ اے اللہ میمونہ کے دل میں بھی اس کی محبت ڈال دے۔ ان کے دل سے دعا نکلی۔

شام کو میمونہ انا بوا کے ساتھ آئی تو اختر بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ چہرے سے اتنا بیمار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میمونہ بہت سنجیدگی سے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟ بہت مایوس لگ رہی ہو۔" اختر نے اسے چھیڑا۔

"مایوسی کی بات تو ہے۔" میمونہ بولی۔ "میں تمہاری عیادت کے لیے آئی تھی۔"

"تو کرو نا عیادت۔"

"کیا کروں تم بیمار ہی نہیں لگ رہے ہو۔"

"بدل کر مریضوں کا ہم بھیس اختر۔ تماشائے اہل ستم دیکھتے ہیں۔"

"سچ مچ بہت بڑے اداکار ہو۔" میمونہ نے جل کر کہا۔

انا بوا نے جلدی سے مداخلت کی۔ "پھر شروع ہو گئیں تم۔ تمہیں عیادت کرنا بھی نہیں آتا۔" انہوں نے میمونہ کو ڈانٹا۔ "دیکھتی نہیں ہو، کیسی ہلدی جیسی رنگت ہو رہی ہے اختر میاں کی۔ جسم میں جیسے خون ہی نہیں رہا ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بوا۔۔۔ تم جہاں بیٹھی ہو، وہاں سے شیڈ پڑ رہا ہے۔"

"اچھا، تم چپ ہو جاؤ۔" بوا نے اسے پھر ڈانٹا۔ پھر وہ اختر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "کیا ہوا اختر میاں؟"

"بس کیا بتاؤں بوا۔" اختر نے آہ بھر کر کہا۔ "سچی بات کسی کو نہیں بتا سکتا۔ کون یقین کرے گا۔"

"بتاؤ تو۔" بوا تجسس سے لبالب بھر گئیں۔

"بڑی پراسرار اور خوفناک بات ہے۔" اختر نے سرگوشی میں کہا۔ "معلو
کوئی یقین ہی نہیں کرے گا۔ پھر کیا فائدہ بتانے کا۔"

"ہمیں بتاؤ' ہم یقین کریں گے۔" بوا نے خم ٹھونک کر کہا۔ "پچاسیوں نا
یقین چیزیں دیکھ چکے ہیں۔"

"چلیں' آپ کو بتا دیتا ہوں۔ ہوا یہ بوا کہ اس رات میں حیران تھا کہ انسان اتنے قیمہ بھرے پراٹھے کیسے کھا سکتا ہے' جتنے میں نے کھائے تھے۔ پیٹ ت
گیا تھا میرا۔ چنانچہ میں نے خوب چہل قدمی کی مگر پیٹ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔"

"اتنے پراٹھے تو نہیں کھائے تھے تم نے۔" بوا نے اعتراض کیا۔

"اور کیا صرف چودہ تک گن سکی تھی میں۔" میمونہ نے لقمہ دیا۔ "زیادہ
زیادہ سات آٹھ اور کھا لئے ہوں گے۔ بائیس پراٹھوں سے کیا بنتا ہے پیٹوؤں کا۔"

"تم چپ رہو مون۔" بوا نے اسے ڈپٹا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں بوا۔ میں نے پورے بائیس پراٹھے کھائے تھے اور
حیران تھا اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے معدے میں۔"

"دل بھی تو بھر گیا ہوگا پراٹھوں سے۔"

"جی نہیں۔ دل پہلے سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی گھسا رہتا ہے ہر وقت۔"

"ارے تم وہ بات بتاؤ اختر میاں۔" بوا نے اس بار اختر کو ڈپٹا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ خوب ٹہلنے کے باوجود پیٹ کا بھاری پن کم نہیں ہوا۔ پریشانی کی بات تھی۔ اسی پریشانی میں میں آپ کے گھر سے نکلا اور یہ سوچ کر چلنا شروع کیا کہ شاید طبیعت ہلکی ہو جائے۔ اسی وقت پراسرار واقعات کا
ہوا۔۔۔" اختر نے لہجہ پراسرار اور خوفناک بنایا۔

"کیا ہوا میاں۔ جلدی سے بتاؤ۔" بوا نے گھبرا کر کہا۔

"چلتے چلتے اچانک مجھے احساس ہوا کہ پیٹ میں موجود تمام پراٹھے ایک
غائب ہو گئے ہیں۔ پیٹ یوں خالی ہو گیا جیسے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ الٹا بھوک لگنے
جیسے دن بھر کا بھوکا ہوں۔ میں پریشان ہو گیا۔ اس عالم میں چند قدم ہی چلا ہوں گا
وہ اچانک چھم سے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔۔۔"



بوا دہل گئیں۔ "کون میاں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اور یہ اچانک کا کیا مطلب ہوا۔" میمونہ نے اعتراض کیا۔ "زمین سے اگی تھی یا آسمان سے اتری تھی؟"

"تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے معلوم ہوتا تو حیران کیوں ہوتا میں۔ ہوا یوں کہ میرے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ گلی سنسان تھی۔ مگر اگلے ہی پل وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور بوا آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ بڑی حسین لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ بیس کے لگ بھگ ہوگی قدم ایسا کہ سرو کو شرمندہ کرے' نقوش ایسے کہ سنگ تراش اسے تراشنے کی آرزو کرے۔ ہونٹ ایسے سرخ کہ درجہ اول کا یاقوت بھی شرما جائے۔"

"پھر کیا ہوا؟" بوا نے بولائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہونا کیا تھا بوا۔ میں کھڑا اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بولی نوجوان' مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟" میں نے بڑی خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"اس نے جھٹ اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا پیالہ تھا' جیسا دودھ اور لسی والے اپنی دکان میں رکھتے ہیں۔اس کے نازک' خوب صورت اور حنائی ہاتھوں میں وہ پیالہ مجھے بہت بے ڈھب اور بے جوڑ لگا۔

وہ بولی "مجھے پیالہ بھر خون چاہیے۔"

یہ سن کر بوا کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ "میرے اللہ!"

اختر کی داستان جاری تھی۔ "میں نے کہا' اے حسن بے مثال' تو کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے' تجھے خون جیسی غیر رومانی چیز کی کیا ضرورت پڑ گئی' یہ سن کر وہ بولی۔ "پیوں گی۔"

"یہ کہا اس نے!" بوا تھر تھر کانپنے لگیں۔

"یہ سن کر میں تو گھبرا گیا۔ میں نے کہا اتنی حسین ہو کر خون پیتی ہو تم؟" وہ کہنے لگی۔ "اسی لیے تو اتنی حسین ہوں۔ تمہیں کیا پتا خون کی تاثیر کا۔ بات دراصل

یہ ہے کہ کوئی لال شربت مجھے بھاتا ہی نہیں اور شربت لال نہ ہو تو مزہ آتا ہی نہیں۔ سو میں تین حصے شربت نیلوفر' دو حصے عرق لیموں اور ایک حصہ عرق گلاب میں پیالہ لہو ملا کر پیتی ہوں۔ بے حد فرحت بخش ہوتا ہے۔ کبھی تم بھی ٹرائی کر کے دیکھو۔"

"مجھے یہ سن کر بہت غصہ آیا کہ بالشت بھر کی چھوکری مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ میں نے غصے میں کہا "کوئی اور گھر دیکھو بی بی۔ نہ تو میں خون کا سپلائر ہوں نہ کمیلے کا کنٹریکٹر۔"

بوا اب منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھیں۔ شاید آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"یہ سن کر وہ مسکرائی۔ اس کے دانت بے حد چمک دار' سفید اور نکیلے تھے۔" اختر اپنی کہتا رہا۔ "اس کے دانتوں کو دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا۔ تھرتھری چھڑ گئی۔۔ شاید اس لئے کہ میں بہت دیر سے پھوار میں بھیگ رہا تھا۔

"بہرحال اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ دراصل میرا انار کا درخت سوکھ رہا ہے۔ اسے خون کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کھاد ڈالو اس میں۔"

"کھاد سے بات نہیں بنے گی۔ اسے خون ہی چاہیے۔"

"تو کسی مرغی والے یا کسی قسائی سے بات کرو۔"

"مجھے جانوروں کا نہیں' انسان کا خون چاہیے۔ یہ ملے تو دل کو سکون اور کلیجے کو ٹھنڈک ملے۔ ورنہ میرا انار' میرا گھر جل جائے گا۔"

"انار۔۔۔ کلیجا۔۔۔" بوا نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ "وہ یقیناً ڈائن ہو گی۔"

"مجھے تو بعد میں پتا چلا بوا۔ اس وقت سمجھ میں تھوڑا ہی آیا تھا۔" اختر نے کہا۔ "خیر یہ سن کر میں ڈر گیا پھر مجھے غصہ آیا کہ اتنی سی چھوکری سے ڈر رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ جا بی بی' کام کر اپنا۔ میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔"

وہ بولی "ہنسی خوشی دے دو تو اچھا ہے ورنہ مل تو جائے گا ہی مجھے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھی۔ "بس اب یہاں کر دو۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "خبردار جو میری



طرف ایک قدم بھی بڑھایا۔ میں عورت ہونے کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ مرمت کر دوں گا تمہاری۔" "بس بوا یہ سنتے ہی اس کی تو جون بدل گئی۔ اب جو میں نے اسے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اسے دیکھ کر۔ وہ کم عمر بھی نہیں رہی۔ بلکہ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی پرانی ہے پھر یہ کہ کہاں وہ خوب صورت لگ رہی تھی اور خوف ناک لگنے لگی۔ نہایت بدصورت اور مکروہ۔ اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں' جن میں شیطانی چمک تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ اور نکیلے دانت جو اب باہر نکل کر ہونٹوں پر چڑھ آئے تھے۔ اب جو وہ بولی تو اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ وہ ناک میں خنخنا رہی تھی۔۔۔ "منجھیں خون دیں دوں۔۔۔ پیائلہ بھر خون۔۔۔" مجھ سے بولا نہیں گیا بس میں نفی میں سر ہلاتا رہا۔ زور زور سے ایسے میں میری نظر اس کے پیروں پر پڑی تو میرا دم نکل گیا۔"

"کیوں؟ ایسا کیا تھا؟" میمونہ بولی۔ اب وہ بھی بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھی۔ بوا بھی دہلی ہوئی تھیں۔

"وہ۔۔۔ وہ پچھل پیری تھی۔"

میمونہ بے یقینی سے ہنسنے لگی۔ "بے وقوف بنا رہے ہو۔"

"وہ واقعی پچھل پیری تھی۔" اختر نے زور دے کر کہا۔

"میں نہیں مانتی۔"

"تمہارے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ پچھل پیریاں بھی ہوتی ہیں دنیا میں۔۔۔ اور ڈائنیں بھی۔" بوا نے بگڑ کر کہا۔

"ارے بوا۔۔۔ یہ بوقوف بنا رہے ہیں ہمیں۔"

"حشر اس کا دیکھو کیا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو ٹائی فائیڈ کی وجہ سے۔۔۔"

"بس تم چپ رہو۔ تم یقین کر ہی نہیں سکتیں۔" بوا نے میمونہ کو ڈپٹا۔ پھر وہ اختر کی طرف مڑیں۔ "انہیں چھوڑو اختر میاں۔ تم بتاؤ کہ پھر کیا ہوا؟"

"چھوڑ ہی تو نہیں سکتے بوا۔ انہیں تو یقین دلانا ہی پڑے گا۔" اختر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "دیکھیں بوا' آپ جانتی ہیں کہ مجھے قسم کھانا اچھا نہیں لگتا مگر میں خدا کی

قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کی ایڑیاں پیچھے تھیں اور پنجے آگے تھے۔"

میمونہ گڑبڑا گئی۔ اختر واقعی قسم نہیں کھاتا تھا۔ "قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہمیں یقین ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" بوا نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بوا۔ میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کے پنجے آگے اور ایڑیاں پیچھے تھیں۔" اختر نے دہرایا۔

اس بار اختر نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔ بات میمونہ کی سمجھ میں آگئی اس کے ساتھ ہی اسے ہنسی آگئی۔ وہ سچ تو کہہ رہا تھا۔ قسم بھی جھوٹی نہیں تھی۔

"اب ہنس رہی ہو۔" بوا نے چڑ کر کہا۔ "تم کیسی لڑکی ہو مون۔"

"بوا--- تم نے غور سے نہیں سنی اختر کی قسم۔"

"پھر سن لیں بوا۔" اختر نے کہا اور وہی جملہ پھر ادا کیا۔

"اب تم خود بتاؤ کہ ایڑیاں پیچھے اور پنجے آگے کس کے ہوتے ہیں۔" میمونہ نے بوا سے کہا۔

"تمہارے۔" اختر نے کھٹ سے کہا۔

"تم تو بال کی کھال نکالتی ہو مون۔" بوا نے میمونہ سے کہا۔ پھر اختر سے بولیں۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا--- میری اچھی بوا کہ اچانک میرے دیکھتے ہی دیکھتے چپکلی پیری کے پیالے میں دھیرے دھیرے خون بھرنے لگا اور ساتھ ہی مجھے احساس ہوا' جیسے میرے جسم میں روشنی کی کمی ہو رہی ہے--- وولٹیج کی کمی کی وجہ سے---"

"میرے اللہ' وہ تمہارا خون تھا--- اس کے پیالے میں۔" بوا نے دہل کر کہا۔

میمونہ اب ہنستے ہنستے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بوا نے اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے غصے سے کہا۔ "تم جاؤ یہاں سے۔"

میمونہ کمرے سے نکل آئی۔ اس نے چچی جان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کیں۔ چچی جان کا رویہ اسے ہمیشہ عجیب سا لگتا تھا۔ وہ اس سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں لیکن وہ اسے واری صدقے ہو جانے والی نظروں سے بھی تھیں۔ یہ تضاد کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔



"آپا--- آپ میرے اسکول میں آ جائیں نا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح ان سے ضد کی۔ "سچ کہتی ہوں' آپ خوش ہو جائیں گی میرا اسکول دیکھ کر۔"

"اچھا' کسی دن آؤں گی۔ اچھا لگا تو جوائن بھی کر لوں گی۔" آپا نے بھی ہمیشہ والا جواب دیا۔

میمونہ' اختر کے کمرے میں واپس آئی تو وہاں بوا اختر کی جھاڑ پھونک میں مصروف تھیں۔ "سورہ طارق سے تو بڑے بڑے آسیب بھاگ جاتے ہیں۔" وہ فخریہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ہاں اختر میاں' تمہارے سر میں درد ہے؟"

"جی ہاں بوا۔"

بوا دم کرنے لگیں۔ پھر اچانک بولیں۔ "پپوٹے بھی بھاری ہو رہے ہیں اے میاں' تمہیں نظر بھی لگی ہے بڑی سخت۔"

"جی ہاں--- بڑی سخت۔" اختر نے میمونہ کو تاکتے ہوئے کہا۔ "نیند کی کمی سے بھاری ہو رہے ہوں گے پپوٹے۔" میمونہ نے چڑ کر کہا۔

"ہم تمہاری نہیں' اختر میاں کی بات کر رہے ہیں۔" بوا نہایت اطمینان سے بولیں۔ پھر وہ اختر کی نظر بھی اتارنے لگیں۔ اس طرح کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہم ذرا بیگم صاحبہ سے بھی مل لیں۔"

"کر چکے سب ڈرامے۔" بوا کے جانے کے بعد میمونہ نے کہا۔

"ہاں۔" اختر نے سر ہلاتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

میمونہ کو اس کی آواز کی نقاہت کا احساس ہوا۔ "تھک گئے بہت؟" اس نے پوچھا۔

"کمزوری بہت ہو گئی ہے۔"

"تو اتنا بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" میمونہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"خوشی میں اور کیا کرے بندہ عاجز۔ اسے زیادہ حقوق بھی تو حاصل نہیں۔"

میمونہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اسے پگھلا دینے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ گڑبڑا جاتی تھی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے وہ دونوں چیزیں نکالیں' جو وہ اختر کے لیے لائی تھی۔ "لو--- یہ

تمہارے لیے لائی ہوں۔"

ایک اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا گلاب کا پھول تھا۔۔۔ ٹہنی اور چار پتوں پر دوسرا Get well کارڈ تھا۔ "میرے حصے میں یہ کاغذ کا پھول ہی کیوں ہے؟" اخ شکایت کی۔

"کاغذ کا نہیں کپڑے کا ہے۔" میمونہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور یہ بڑی سے بنتا ہے۔"

"محنت اور محبت میں بڑا فرق ہے حالانکہ بات صرف نقطہ اوپر نیچے ہو ہے۔" اختر نے آہ بھر کے کہا۔ "اور کچھ بھی کہو' پھول ہے تو مصنوعی ہی۔۔۔"

"اسی لیے تو کانٹا نہیں ہے اس کے ساتھ۔" میمونہ نے سنجیدگی سے "تمہیں تکلیف سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں میں۔"

"گمان ہے تمہارا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں تکلیف اور بڑھ جاتی ہے۔ میں تو مخمل کے بے خار پھول سے بھی زخمی ہو ہوں۔"

"چھوڑو ان تکلیف دہ باتوں کو۔"

اختر نے بہت آہستگی سے پھول کو سرہانے رکھا اور کارڈ کا جائزہ لیا۔ "خو صورت کارڈ ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔ "مگر یہ کوئی تعریف نہیں اس لیے کہ تم ذوق ہے ہی بہت اچھا۔ مگر تم یہاں Get well کے نیچے کچھ لکھنا بھول گئی ہو۔"

"کیا؟ میں سمجھی نہیں۔"

"تمہیں لکھنا چاہیے تھا "So that I hurt you"

"کتنے اذیت پسند ہو تم۔" میمونہ نے جل کر کہا۔

"شاید۔ ہاں یہ ممکن ہے۔" اختر نے سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ " تمہاری اذیت رسانی کی تسکین کے لئے میں نے غیر شعوری طور پر خود کو اذیت پسند لیا ہے۔ جبھی تو کام چل رہا ہے تم بھی خوش' میں بھی خوش۔"

میمونہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اختر نے کبھی اس سے اس طرح بات نہ کی تھی۔ اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے آنکھوں کو چھلکنے سے روکا۔ "



روز تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"اب بھی کہہ رہا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا۔ یہ میری کائنات کا سب سے بڑا سچ ہے۔"

"جتنا برا تم مجھے سمجھتے ہو' اس کے بعد تم مجھ سے محبت نہیں' صرف نفرت کر سکتے ہو۔۔۔ اور وہ بھی شدید ترین نفرت۔"

اختر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو میمونہ۔۔۔"

"میں وہی سمجھ رہی ہوں جو تم نے کہا ہے اور جو تم نے کہا ہے' اس کا دوسرا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔"

"وہ تو بات سے نکلنے والی بات تھی۔" اختر نے صفائی پیش کی۔

"اندر کی سچائی ایسی ہی باتوں میں' ایسے ہی Unguarded لمحوں میں سامنے آتی ہے۔"

"تم تو بات پکڑ کر بیٹھ گئیں۔" اختر کے لہجے میں بے بسی در آئی۔ "یہ بھی عجیب بات ہے کہ زخمی بھی ہوں اور معذرت بھی مجھے ہی کرنی ہے۔"

"میں کب چاہتی ہوں کہ تم معذرت کرو لیکن یہ بھی غلط ہے کہ تم مجھے مجرم قرار دے کر طعنہ زنی کرتے ہو۔ صرف اس لیے کہ جو جذبہ تمہارے دل میں میرے لیے ہے' وہ میرے دل میں تمہارے لیے نہیں ہے۔ یہ باتیں اختیاری کب ہوتی ہیں۔"

"مگر بے اختیاری کے باوجود تکلیف تو تکلیف ہی ہے اور تکلیف ہو گی تو چیخ بھی نکلے گی۔"

"ضروری نہیں۔ میں تو اس انداز میں سوچتی ہوں کہ جب وجہ تکلیف پر میرا اختیار نہیں' اور اس کا مداوا بھی میرے بس میں نہیں تو چیخنے کا فائدہ! آدمی چیخے تو جب کہ مداوا کر سکتا ہو' مگر نہ کر پائے۔"

"میں اپنی تکلیف پر نہیں' بے اختیاری پر چیختا ہوں مگر تم کیسے سمجھو گی' کنارے سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا۔ تمہیں بے اختیاری' بے فیض محبت ملی ہو تو جانو۔ بغیر تجربے کے نصیحت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" میمونہ نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔ "جہاں سے میری یادداشت شروع ہوتی ہے' میں تو وہیں سے بے اختیاری کے عذاب میں مبتلا ہوں اور مجھے تم سے اختلاف ہے۔ محبت بے فیض کبھی نہیں ہوتی اس سے زیادہ فیض رساں تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ میں نے تو بھئی بہت فیض اٹھایا ہے اس سے۔"

اختر کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ "تو تمہیں بھی محبت ہے کسی سے؟"

میمونہ نے سر اٹھا کے ایک پل اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ "ہاں" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں اور تم کیا' ہر انسان اپنی بے اختیاری کے کنوئیں میں قید' کنوئیں کی دیواروں سے سر ٹکرانے پر مجبور ہے۔ جو عقل مند ہے' وہ سمجھ لیتا ہے کہ دیوار سے سر ٹکرانے سے اختیار نہیں ملے گا۔ سو وہ اپنا سر بچا لیتا ہے--- میری طرح۔ میرے صاف بتا تو دیا تھا کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔"

"تمہیں اپنی بے اختیاری پر غصہ نہیں آتا؟"

"نہیں۔ اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ دینے والے نے مجھے جو کچھ دیا' میرے لئے بہترین ہے۔ میں اپنی بے اختیاری پر کیسے کڑھوں۔ جبکہ پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ مجھے اختیار دیا جاتا' تب بھی اپنے لئے وہی کچھ چنتی جو بے اختیار بنا کر مجھ پر تھوپا گیا ہے۔ پھر شکایت کس بات کی۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ اس نے اختر کو بہت غور سے دیکھا۔ "ایک بات بتاؤ۔ ابھی تمہیں اختیار مل جائے تو تم کیا کرو گے--- اپنی---" وہ جھجکی۔ لفظ محبت وہ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "اپنی اذیت سے پیچھا چھڑا لو گے؟"

"نہیں۔ شاید میں بھی یہی کچھ منتخب کروں گا اپنے لئے---"

"شاید؟"

"احتیاطاً" شاید کہہ رہا ہوں ورنہ یقیناً کہتا۔"

"تو پھر شکایت کس بات کی ہے تمہیں؟"

"بے اختیاری کی۔" اختر نے بے ساختہ کہا۔ "تم جیسے علامہ لوگ اپنے فلسفے کے حصار میں خوش رہ سکتے ہیں' میں نہیں رہ سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب محبت ایک



برقی رو کی طرح ہے تو اس کو آن آف کرنے کے لیے سوئچ کیوں نہیں دیا گیا مجھے۔ کوئی زبردستی ہے کہ میں اندھیرے میں سونا چاہوں مگر میرے سر پر ہزار واٹ کا بلب ٹکا رہے۔ اس سے تکلیف ہوتی ہے مجھے۔"

"مگر کیوں۔ تم کہہ چکے ہو کہ سوئچ تمہاری دسترس میں ہو' تب بھی تم اسے آف نہ کرو۔" میمونہ نے اعتراض کیا۔

"وہ اور بات ہو گی۔" مجھے اختیار کا احساس ہو گا تو ذمے داری کا احساس بھی ہو گا۔ اپنی مرضی سے میں تکلیف اٹھانا چاہوں گا تو شکایت نہیں کروں گا۔ ہائے ہائے نہیں کروں گا۔ خاموشی سے سہوں گا کہ چوائس میری اپنی ہے۔"

"سوئچ نہ ملنے کے باوجود اختیار تو دیا گیا ہے تمہیں؟" میمونہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم بلب نکال سکتے ہو۔"

"اب بچکانا بات کر دی تم نے۔ یہ سچ مچ کی بجلی اور بلب کی بات نہیں' محبت کی برقی رو' وجود اور دل کی بات ہو رہی ہے۔ کیا انہیں یہ اختیار ملا ہے کہ اپنے دل کو اس کے ساکٹ سے نوچ کر پھینک دو؟"

میمونہ شرمندہ ہو گئی مگر وہ ہار نہیں مان سکتی تھی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں سمجھ گئی' مرد ہونا (Domination) کے عادی! عورت کے سامنے بے بسی' بے اختیاری تمہیں کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔ ہاں' اختیار کا وہم بھی ہو تو بالادستی کا احساس تو رہے گا۔"

"جو جی چاہے' سمجھ لو۔" اختر نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایک زحمت کرو' یہ دونوں چیزیں چیسٹ ڈراور کی دوسری دراز میں رکھ دو۔" اس نے پھول اور کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میمونہ دونوں چیزیں لے کر اٹھی۔ اس نے دوسری دراز میں پھول اور کارڈ کو رکھا مگر دراز میں ایک اور چیز دیکھ کر وہ چونکی۔ "اختر یہ کیا ہے؟" اس نے پلٹ کر اختر سے پوچھا۔ دراز اس نے ابھی بند نہیں کی تھی۔

"کس چیز کا پوچھ رہی ہو؟" اختر کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"یہ بروشر ہے دھنک بلڈرز کا۔"

"اوہ——— ہاں' یہاں لے آؤ۔"

میمونہ نے بروشر نکالا اور دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ بروشر کے ٹائٹل کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس پر ایک بنگلے کی تصویر تھی۔ بنگلے پر دھنک کی کمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آ رہی تھی۔

"تمہیں دھنک کی وجہ سے اس میں دلچسپی ہوئی ہے نا؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں دھنک میری کمزوری ہے۔"

"تمہارے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کی کمزوری ہے دھنک۔ کسی کے لیے دھنک خواب ہے تو کسی کے لئے تعبیر۔ میرے لئے یہ آرزو ہے——— آرزو پوری ہونے کی نوید۔ اس لئے اخبار میں دھنک بلڈرز کا اشتہار دیکھ کر دل مچل گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ محض دھنک نام رکھنے سے کیا ہوتا ہے مگر میں نے جا کر معلومات کیں تو پتا چلا کہ یہ کمپنی بھی کسی خواب دیکھنے والے ہی کی ہے۔ میں نے ماڈل بنگلہ دیکھا وہ ایسا ہی ہے' جیسا بروشر میں نظر آ رہا ہے۔ دھنک کی کمان سمیت۔ اس کے علاوہ جدید طرز کے لگژری فلیٹس کا ایک پراجیکٹ بھی ہے ان کا۔"

"بہت خوب۔"

"میں نے کچھ سوچ کر ایک بنگلہ بک کرا لیا۔" اختر اپنی بات کہتا رہا۔ "کیا سوچ کر' یہ تم جانتی ہو حالانکہ اس کا کوئی امکان نہیں لیکن میں بتا چکا ہوں کہ دھنک میرے لئے آرزو اور امید کی علامت ہے۔ میں ان دونوں کو کیسے چھوڑ دوں۔ چھوڑوں گا تو مر جاؤں گا۔"

"اللہ مبارک کرے۔ اللہ تمہارے اس مکان کو گھر کر دے۔" میمونہ نے بے حد خلوص سے دعا دی۔

"بڑی بوڑھیوں کے انداز میں باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔" اختر چڑ گیا۔ "اور وہ بھی ریاکاری کے ساتھ۔"

میمونہ کا چہرہ اتر گیا۔ "تم جانتے ہو' میں خلوص سے کہہ رہی ہوں۔"

"میں تمہاری ریاکاری ثابت کر سکتا ہوں۔"

"تو کرو۔" میمونہ نے چیلنج کیا۔



"اللہ کا حکم ہے کہ بندہ دعا کرے تو ساتھ ہی مدعا کے حصول کے لئے سعی بھی کرے۔ تم مجھے مکان کے گھر ہونے اور گھر کے مبارک ہونے کی دعا دے رہی ہو اور تم یہ جانتی ہو کہ وہ گھر صرف تم آباد کر سکتی ہو مگر تم مجھے رد کرتی رہی ہو اور کرتی رہو گی۔" اختر کا لہجہ تند تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ "گویا تم جانتی ہو——— اور یہ تمہارا ہی فیصلہ ہے کہ وہ گھر نہ آباد ہو گا' نہ مبارک ثابت ہو گا۔ اب بتاؤ' تمہاری دعا ریاکاری ہے یا نہیں———" وہ اچانک ڈھیر ہو گیا۔ آخر میں اس کی آواز لرزنے لگی تھی اور اب وہ ہانپ رہا تھا' جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔

میمونہ اس کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گئی۔ "کیا کرتے ہو؟" وہ اس پر جھکتے ہوئے بولی۔ "کیوں ظلم کرتے ہو اپنے آپ پر؟"

"میں کروں تو کوئی حرج نہیں' میرا حق ہے خود پر۔" وہ شدید ترین نقاہت کے باوجود بپھرا ہوا تھا۔ "مگر ظلم میں نہیں کر رہا خود پر۔ تم کر رہی ہو' کر رہی ہو تو کرو' مگر یہ تو بتا دو کہ تمہارا حق کیا ہے مجھ پر' کس طرح بنتا ہے؟"

میمونہ روہانسی ہو گئی۔ "تم کیسی غیر معقول بات کر رہے ہو۔" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "کوئی کسی سے محبت کرے تو کیا دوسرے فریق پر بھی اس کی محبت فرض ہو جاتی ہے۔ یہ تو دل کی بات ہے' جیسے تم مجبور ہو ویسے ہی میں———"

"تم مجھ سے محبت نہ کرنے پر مجبور ہو' ہے نا؟" اختر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے یہ نہیں کہا' تمہیں مجھ سے محبت نہیں تو یہ میرا نصیب لیکن مجھے گھر کی اور گھر کے بسنے کی دعا دے کر ریاکاری اور منافقت مت کرو۔"

"یہ ریاکاری اور منافقت نہیں۔ میں تم سے وہ محبت نہیں کرتی' جس کے تم طلب گار ہو لیکن میں دوسرے انداز میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری فکر رہتی ہے مجھے۔ تمہاری بہتری کے لئے دعا کرتی ہوں میں۔"

"مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں لیکن گھر کے حوالے سے تمہاری دعا منافقت اور ریاکاری کے سوا کچھ نہیں۔ میرا گھر صرف تم بسا سکتی ہو اور تمہاری نہ ایسی نیت ہے نہ ارادہ۔ اب خود بتاؤ۔"

"اس لئے تو کہتی ہوں کہ مجھے یہ اہمیت دینا چھوڑ دو۔" میمونہ نے دھیمے میں کہا۔ اسے اختر کی حالت پر تشویش ہو رہی تھی۔ وہ ویسے ہی بہت کمزور ہو گیا تھا۔

"میرے بس میں ہوتا تو چھوڑ چکا ہوتا۔" اختر نے جھنجلا کر کہا۔ "مگر یہ عجیب حال ہے تمہارے انکار کے باوجود میری آس نہیں ٹوٹتی۔"

"اچھا' اب یہ باتیں چھوڑو۔ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرو اور آرام سے لیٹو۔"

"تم میری اتنی فکر کیوں کرتی ہو جب۔۔۔"

"مجھے تمہاری فکر ہے میں تمہیں بے حد خوش و خرم اور کامیاب زندگی گزارتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"کچھ اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔" میمونہ نے کہا۔ "یہ الگ بات کہ تمہارے معیار پر پوری نہیں اترتی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور کچھ اس کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اسے میری بدنصیبی کہہ لو یا مقدر کہ میں اسے نہیں کر سکتی مگر اس محبت کے بدلے تمہاری بہتری کی فکر تو کر سکتی ہوں۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو؟"

میمونہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خواب سے تھے۔ پھر وہ دھیمے سے بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم کسی بہت ہی پیاری سی لڑکی سے شادی کر لو کوئی شہزادیوں جیسی لڑکی ہو۔ پھر تم اس سے محبت کرو اور اس کی محبت پا کر سب بھول جاؤ۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے ایک بہت اچھے دوست کی حیثیت سے یاد رکھو یقین کرو' میں تمہارے لئے سب سے اچھا دوست ثابت ہوں گی۔"

اختر نے جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"تم اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔ میری خاطر اتنا نہیں کر سکتے۔ میری اتنی بات نہیں مان سکتے؟" میمونہ نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے مگر میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں"۔ نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "لیکن جب تک آس نہیں ٹوٹتی' میں ایسا کچھ نہیں



سکتا۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں دو ٹوک اور واضح طور پر بتا چکی ہوں پھر بھی آس نہیں ٹوٹتی تمہاری۔"

اچانک اختر کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ "میں نے محبت کا دعویٰ کیا ہے تو دنیا کی سب سے عظیم دوستی کا دعویٰ تم نے کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ ہم دونوں اسے ثابت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تمہارا کام آسان ہے' تم بس میری آس توڑ دو۔"

"وہ کیسے؟" میمونہ نے حیرت سے پوچھا۔

"شادی کر لو۔"

میمونہ کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "شادی کر لوں' کس سے؟"

"اب مجھ سے پوچھو گی تو میں اپنے سوا کسی کا نام تجویز نہیں کر سکوں گا۔"

"پھر مسخرا پن شروع کر دیا۔" میمونہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"نہیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ تم کسی سے بھی شادی کر لو میری آس ٹوٹ جائے گی پھر میں تمہاری یہ بات مان لوں گا۔ میں کسی بہت پیاری' شہزادی جیسی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔ میں اس سے محبت کروں گا' خوش و خرم رہوں گا اور انشاء اللہ کامیاب زندگی گزاروں گا اور جس سے تم شادی کرو گی' اسے خود سے بہتر اور پوری دنیا سے محترم جانوں گا۔ یقین کرو' میں اس سے حسد نہیں کروں گا' اسے رقیب نہیں سمجھوں گا اور میں تمہاری دوستی پر فخر کروں گا۔"

میمونہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "میں شادی نہیں کر سکتی اختر۔"

"کیوں؟ جیسے میں تم سے محبت کرتا ہوں' تم بھی کسی سے محبت کرتی ہو۔ ہے نا؟" اختر اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

میمونہ چند لمحے ساکت بیٹھی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے بتاؤ نا' کون ہے وہ خوش نصیب؟" اختر کے لہجے میں حسرت تھی۔

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

"اسی پر دوستی کا دعویٰ کر رہی تھیں۔" اختر نے طنز کیا۔

"مجبوری ہے اختر' جو بات میں نے کبھی خود سے بھی نہیں کہی' تم سے کیسے کہہ سکتی ہوں؟"

"اپنی دوستی کی عظمت پر اب بھی اصرار ہے؟"

"ہاں۔ اس لئے کہ وہ سچی ہے۔" میمونہ نے کہا۔ "چاہو تو آزما لینا۔"

"آزمائش تو شروع ہی سمجھو۔" اختر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میمونہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اختر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہارے پاس تین ماہ کی مہلت ہے اس دوران میں جس سے محبت کرتی ہو اس سے یا کسی ایکس' وائی' زیڈ سے شادی کر لو۔ نہیں تو تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہو گی۔ تم شادی کر لو تو میں بھی کسی اچھی سی' شہزادیوں جیسی لڑکی سے شادی کر لوں گا اور خوش بھی رہوں گا۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو۔" میمونہ نے بے بسی سے کہا۔ "کسی اور سے شادی کرنا ممکن ہوتا تو تم سے اچھا کون تھا۔"

"تو اس سے شادی کر لو جس کی تم منتظر ہو۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں۔"

"بہرکیف تین مہینے میں اگر تم نے شادی نہیں کی اور مجھ سے بھی انکار کیا تو کچھ ہو گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" اختر نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم جانتی ہو کہ مجھے زندگی سے کتنا پیار ہے لیکن میں خود کو ختم کر لوں گا۔"

میمونہ لرز کر رہ گی۔ "لیکن اختر---"

"اب اس موضوع پر بات نہیں ہو گی۔" اختر کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "میں نے تمہیں ففٹی ففٹی چانس دیا ہے' آگے تم جانو۔"

اسی وقت بوا اور قمر آپا آ گئیں۔ گفتگو کا رخ بدل گیا لیکن میمونہ بے حد پریشان اور متوحش تھی۔

انا بوا اور میمونہ کے جانے کے بعد اختر دیر تک اپنے فیصلے پر غور کرتا اور میمونہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

میمونہ اور اختر کا تعلق بے حد پہلو دار تھا۔ وہ اس کی محبت تو تھی ہی لیکن اس سے اس کے کئی طرح کے تعلق تھے۔ کچھ اختیاری تھے اور کچھ پر اس کا اختیار نہیں



تھا۔ میمونہ اس کی تایا زاد بہن تھی۔ اس رشتے کے حوالے سے بھی وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ پھر میمونہ کی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس کا گھرانہ اچانک ہی وقت کی لپیٹ میں آیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا' جیسے کوئی محل زمیں بوس ہو گیا ہو مگر میمونہ کے پاس کیریکٹر تھا۔ اس نے زندگی کے ملبے پر نئی زندگی کی بنیاد رکھی تھی اور اینٹ سے اینٹ جوڑتے جوڑتے عمارت تعمیر کر ڈالی تھی۔ اس وجہ سے وہ میمونہ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اسے خود سے بڑی لگتی تھی۔

اختر' میمونہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ میمونہ کو دکھی دیکھنا اسے گوارا ہی نہیں تھا اور وہ بچہ نہیں تھا' جانتا تھا کہ میمونہ اسے پسند کرتی ہے' اس کا خیال رکھتی' اس کی فکر کرتی ہے لیکن محبت وہ کسی اور سے کرتی ہے اور اس محبت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ کون ہے اور اس سے شادی میں کون سی دشواریاں ہیں' یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اس محبت میں میمونہ کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ زندگی تو اس کی اپنی بھی تباہ ہو رہی تھی مگر اسے اپنی نہیں' میمونہ کی فکر تھی۔

اختر خود غرض نہیں تھا۔ وہ خود کو میمونہ پر تھوپنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس نے ایسا کیا تھا تو وہ بھی میمونہ کی بہتری کے لئے۔ اگر میمونہ اس شخص سے شادی کر لیتی جس سے اسے محبت تھی تو وہ اختر کے لئے بہت بڑی خوشی ہوتی لیکن تین مہینے میں یہ نہ ہونے کا مطلب یہی تھا کہ کسی بھی وجہ سے سہی' وہ ناکام محبت ہے اور میمونہ کو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ اس صورت میں میمونہ کو اس سے بچانا اس کا فرض تھا اور وہ میمونہ کو زندگی کی ہر خوشی دے سکتا تھا--- محبت سمیت۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اسے کچھ ملے گا یا نہیں؟ اور اسے بھروسہ تھا کہ موقع ملنے پر وہ اپنی محبت کے زور پر میمونہ کی محبت بھی جیت لے گا۔

اور اگر اس عرصے میں میمونہ کو اس کی محبت مل گئی تو---؟ اس سوال کا جواب بہت آسان تھا۔ وہ محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود حقیقت پسند تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر وعدہ کیا تھا۔ اس صورت میں وہ شادی کر لیتا' ایک بہت پیاری لڑکی سے۔"

فوزیہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ وہ اس کے دفتر میں جاب کرتی تھی اور وہ اس ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی وہ میمونہ سے کرتا تھا۔ شرمیلی ہونے کے باوجود وہ اشاروں میں اسے اپنا مدعا بتا چکی تھی اور حوصلہ افزائی نہ ہونے کے باوجود وہ محبت پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے میرا فیصلہ درست ہے۔" اختر نے طمانیت سے سر ہلایا۔ "ز اتنی طویل نہیں ہوتی کہ اسے واہموں میں ضائع کیا جا سکے--- وہ میری ہو' میمو ہو یا کسی اور کی۔ آس بڑی ظالم چیز ہے اسے پورا ہونا چاہیے یا ٹوٹ جانا چاہیے کیا کہ ایک پتلے سے دھاگے سے بندھے' جہنم کے دہانے پر لٹکے رہو بس اب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس صورتحال پر غور کر کے اسے ایک شعر یاد آیا ۔

مجھے تو چاہ میں چاہوں کسی کو اور کوئی تجھ کو
اسی صورت مکمل درد کی زنجیر ہو جائے

اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ میمونہ کی راہ میں رکاوٹ اس کے محبوب کی ہو۔ اسے اچانک خیال آیا جسے میمونہ چاہتی ہو' وہ کسی اور کو چاہتا ہو۔ بالکل-- بات قرین قیاس ہے اور ممکن ہے' میمونہ کا محبوب جسے چاہتا ہو' وہ کسی اور کو زنجیر تو بے حد طویل بھی ہو سکتی ہے۔ کڑیوں کو تو بس اپنے ادھر ادھر کا حال ہوتا ہے۔ انہیں کہاں پتا چلتا ہے کہ جس زنجیر کا وہ حصہ ہیں وہ کہاں تک چلی گئی کتنی طویل ہے۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی۔



"اب میں کیا کروں آپی۔" میمونہ نے شہلا کی تصویر کو سب کچھ بتانے کے آخر میں پوچھا۔

مگر تصویر کب جواب دیتی ہے۔ تصویر تو بس مسکراتی رہی۔ اور وہ مسکراہٹ میمونہ کا حوصلہ بڑھاتی محسوس ہوئی جیسے کہہ رہی ہو--- فکر نہ کرو'



گڑیا جان' سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن میمونہ کو قرار نہیں تھا۔ اختر نے آج اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اختر نے جو کہا ہے اس پر حرف بہ حرف عمل بھی کرے گا۔ دیکھا جائے تو یہ بلیک میلنگ تھی مگر میمونہ جانتی تھی کہ یہ بات نہیں۔ اختر کے خلوص پر' اس کی محبت میں شک کی گنجائش نہیں تھی۔

"مجھے بتائیں' میں کیا کروں؟" اس نے پھر تصویر سے پوچھا۔ تصویر مسکراتی رہی۔

اٹھارہ سال پہلے جو کچھ ہوا تھا' نہ ہوا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس کے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا۔ اگر اس وقت' وقت کے دھارے کا رخ موڑ دیا جاتا تو---؟ تو آپی کی سرمد بھائی سے شادی ہو جاتی۔ وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارتے اور شاید وہ اختر کی محبت کو قبول کر لیتی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھارہ برس پیچھے جا کر وقت کے دھارے کا رخ موڑ دے لیکن جانتی تھی کہ یہ اس کے--- کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ تقدیر بدلنے والا' وقت وار کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ وقت کا ہاتھ کب کس نے روکا ہے۔

مگر ایک اختیار آدمی کے پاس ہے وہ جب چاہے' ماضی کے کھنڈرات کا رخ کر سکتا ہے۔ وقت کی گلیوں میں پیچھے جا سکتا ہے۔ وہ وہاں کی کسی چیز کو چھیڑ نہیں سکتا' تبدیل نہیں کر سکتا۔ بس ایک تماشائی کی حیثیت ہوتی ہے اس کی۔ سو میمونہ بھی اٹھارہ برس پیچھے چلی گئی۔



سرمد بھائی امتحان دے چکے تھے۔ اب وہ کالج نہیں جاتے تھے۔ وہ بہت ہی بھلے دن تھے۔ سرمد بھائی اب پڑھانے بھی نہیں جاتے تھے۔ بڑا لطف آتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ سیر کرنے بھی جاتے تھے۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے سرمد بھائی' میمونہ کو چھوٹے سے بچے کی طرح لگتے تھے--- خود سے بھی چھوٹے اور ان کی ایک ادا اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ تتلی کو پکڑتے--- بس چند لمحوں کے لئے اور

پھر چھوڑ دیتے۔ اس کے بعد وہ اپنی انگلیوں کو چوم لیتے تھے۔ جس دن وہ بہت سار تتلیاں پکڑتے' اس روز ان کے ہونٹوں پر رنگ ہی رنگ ہوتے۔

امی اور آپی سرمد بھائی کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن ابو ان سے بات بھی بر کم کرتے تھے۔ میمونہ کو تو لگتا کہ ابو ان سے خفا ہیں لیکن پھر خیال آتا کہ ابو تو وی بھی کم ہی بات کرتے ہیں۔ ابو کبھی بلند آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ اس کے باو ان سے سب ڈرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں گھر میں خاموشی رہتی تھی۔ یہ بھی ش کا مقام تھا کہ ابو کا کمرا آنگن سے بہت دور تھا۔

میمونہ کو سرمد بھائی کی بس ایک بات بری لگتی تھی۔ وہ لکھتے بہت تھے اور لکھ وقت ان سے بات کئے جاؤ وہ کبھی ہاں میں اور کبھی نہ میں جواب دیئے جاتے اور بع میں پتا چلتا کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ یونہی ہوں ہاں کرتے رہے تھے۔

ایک دن میمونہ اور ارشد بھائی سیر کے موڈ میں تھے۔ سرمد بھائی سے بات کی انہوں نے حسب معمول سنا ہی نہیں۔ ہاں کہہ دیا کہ چلیں گے۔ میمونہ اور ارشد آپی سے بات کی تو انہوں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "ہم کبھی لے کر گئے ہیں دونوں کو۔ جاؤ اپنے بھائی جان سے کہو۔"

"انہی سے کہا تھا مگر وہ لکھ رہے ہیں۔" ارشد بولا۔

"لکھ رہے ہیں تو ابھی نہیں جا سکیں گے' انتظار کر لو۔"

"آپی' یہ بھائی جان کیا لکھتے رہتے ہیں؟" میمونہ نے آپی سے پوچھا۔

"کہانیاں لکھتے ہیں' جو رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔"

"اوہ--- ٹھیک تو ہے۔" ارشد نے دانش مندوں کی طرح سر ہلایا۔ "پریوں والی کہانیاں لکھتے ہوں گے۔"

"نہیں بھئی۔ یہ پریاں' یہ شہزادہ شہزادی یہ تو صرف تم جیسے بچوں کے لئے ہوتی ہیں۔ بڑوں کی کہانیاں تو بہت بدصورت ہوتی ہیں۔ پریوں کے چہروں کے پیچھے چڑیلیں اور بادشاہوں کے چہروں کے پیچھے ظالم دیو چھپے ہوتے ہیں۔ پھر مشکل یہ ہے کہ انہیں اپنے بدصورت ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اختیار کے زعم میں خوب صورتی کو ختم کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھولوں کو توڑتے' تتلیوں کو البم میں چپکاتے چلے



جاتے ہیں۔

"بھائی جان تو ایسا نہیں کرتے۔ وہ تو تتلی کے پروں کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔" میمونہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"وہ ظالم تو نہیں کہ ایسا کریں۔" آپی کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "اور سارے لوگ بھی ایسے نہیں ہوتے۔"

"پھر بھائی جان ایسی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟" ارشد نے سوال اٹھایا۔

"وہ ایسے برے لوگوں کی کہانیاں لکھتے ہیں تاکہ ان برے لوگوں کو کہانی پڑھ کر اپنی برائیوں کا پتا چل جائے--- احساس ہو جائے اپنی برائی کا۔"

"تو انہیں احساس ہوتا ہے کہانی پڑھ کر؟"

"ضروری نہیں۔ ذرا سی بھی روشنی ہو تو احساس جاگ جاتا ہے لیکن گھپ اندھیرے میں روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا۔"

آپی سرمد بھائی کی طرح بہت مشکل باتیں کرتی تھیں۔ "بھائی جان بہت ساری کہانیاں لکھتے ہیں؟"

"ہاں۔" آپی ہنسیں "لیکن آج کل تو وہ ملازمت کے لئے درخواستیں زیادہ لکھتے ہیں۔"

"ملازمت؟"

"ہاں بھئی وہ ملازمت کریں گے۔ دولت کمائیں گے' اپنا گھر بنائیں گے اور---" آپی کہتے کہتے رکیں۔ ان کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ "اور پھر سب کچھ ہو گا۔"

"تو بھائی جان یہاں نہیں رہیں گے؟" میمونہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ ان کا گھر نہیں ہے کیا؟" ارشد نے سوال کیا۔

"نہیں بھئی' یہ تو ابو کا گھر ہے۔" آپی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"ہمارا بھی نہیں ہے؟" میمونہ منہ بسورنے لگی۔

"نہیں مونا پگلی۔ یہ ہمارا بھی گھر نہیں ہے--- تمہارا نہ ہمارا۔ ہاں ارشد کا ہے یہ گھر۔" آپی ارشد کے گال تھپتھپاتے ہوئے ہنسیں۔

"کیوں؟" میمونہ روہانسی ہو گئی۔

"اری بے وقوف۔ لڑکیوں کا گھر تو بہت دور ہوتا ہے اپنے گھر سے۔" آپی اب بھی ہنسے جا رہی تھیں۔ "تمہارا گھر پتا نہیں کہاں ہو گا؟"

"آپ کو اپنے گھر کا پتا ہے؟" میمونہ نے پوچھا۔

"پتا تو نہیں ہے کچھ کچھ اندازہ ہے۔"

میمونہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے سر اٹھایا۔ "آپی۔۔۔ اگر یہ گھ اپنا نہیں تو پھر آپ اور میں بھائی جان کے گھر میں رہیں گے، ٹھیک ہے نا؟"

"کیا پتا؟" نہ جانے کیوں آپی اداس ہو گئیں۔ "دعا کرو۔" پھر ایک صبح سرمد بھائی معمول کے مطابق اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک اخبار چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں بھیگی بھیگی سی چمک تھی۔ میمونہ کو تو ایسا لگا کہ وہ رو رہے ہیں۔

"کیا ہوا بھائی جان؟ آپ رو رہے ہیں؟" ارشد نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" سرمد بھائی بہت زور سے ہنسے۔ "ہم تو ہنس رہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ کہیں جا رہے ہیں آپ؟" میمونہ نے سوال کیا۔

"ہاں، گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔" وہ پھر ہنسے۔ "تم بھی چلو گی؟"

میمونہ نے ان کی انگلی تھام لی اور جب وہ واپس آئے تو میمونہ کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ اس دوران میں اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سرمد بھائی امتحان میں فرسٹ آئے ہیں۔ سرمد بھائی تو خوش تھے ہی، آپی بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

"آپی، آپ کب پاس ہوں گی؟" میمونہ نے پوچھا۔

"ہم تو دو سال پہلے ہی پاس ہو چکے۔"

"اچھا، تو آپ بھائی جان سے بڑی ہیں۔"

"ہاں پورے دو سال بڑے ہیں ہم" آپی نے اکڑ کر کہا۔

"کیوں ہانکتی رہتی ہو الٹی سیدھی۔" امی نے آپی کو ڈانٹا۔ "اور وہ بھی بچوں کے سامنے۔ اگر اس کی ناک لمبی نہ ہوتی تو یہ تم سے چار سال پہلے بی اے کر ہوتا۔" امی نے سرمد بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سرمد بھائی مسکرا



کچھ ہی دن بعد مٹھائی ایک بار پھر آئی۔ یہ بھائی جان کی ملازمت کی خوشی میں تھی۔ آپی اس روز بہت خوش تھیں۔ انہوں نے بیلے کے پھولوں سے اپنی جھولی بھری اور پھر سرمد بھائی کے دونوں ہاتھوں کو پھولوں سے بھر دیا۔

اس روز میمونہ آپی سے بھی زیادہ خوش تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب سرمد بھائی ڈھیر ساری دولت کمائیں گے، اپنا گھر بنائیں گے۔ پھر وہ اور آپی، بھائی جان کے گھر میں بہت خوش رہیں گے۔ لیکن اس نے یہ بات کسی سے بھی نہیں کہی۔ آپی نے سختی سے منع جو کیا تھا۔

مگر سرمد بھائی کی ملازمت اچھی اور مبارک ثابت نہیں ہوئی۔ اب وہ صبح کو گھر جاتے اور شام کو واپس آتے۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہوتے تھے۔ اب وہ لکھتے بھی بہت کم تھے۔ ہاں کبھی کبھی آنگن میں بیٹھ کر کہانی ضرور سناتے۔ اداسی کا موسم بھی کبھی کبھی لوٹ آتا۔ سرمد بھائی وہی غزل گنگناتے۔ آپی کا نازک ہاتھ حرکت میں آتا اور میمونہ کو ایسا لگتا کہ ستارے بہت نیچے آ گئے ہیں۔ اتنے نیچے کہ سرمد بھائی ہاتھ بڑھائیں تو ستارے ان کی مٹھی میں آ جائیں۔

"آپ یہ غزل نہ گایا کیجئے۔" آپی ٹھہر ٹھہر کر کہتیں اور میمونہ کو آپی کا کمرا اور ٹیپ ریکارڈر سے آتی ہوئی آواز یاد آ جاتی۔

ایک تبدیلی بہرحال آئی تھی۔ اب میمونہ اور ارشد کو چاکلیٹ روز ملتے تھے۔ پہلے ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا کہ سرمد بھائی چاکلیٹ لاتے۔

پھر ایک دن گھر کی فضا اچانک بدل گئی۔ ہر طرف عجیب سا خوف چھا گیا۔ اس دن کے بعد ہنسی اور مسکراہٹ کو سب کے ہونٹ ترسنے لگے۔ آپی تو بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گئیں۔

اس رات کھانے کے بعد امی ہمیشہ کی طرح ابو کے کمرے میں چائے لے کر گئی تھیں۔ میمونہ آپی کو اپنی نئی گڑیا دکھانا چاہتی تھی۔ گڑیا لینے کے لئے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ابو کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ آپی کا نام سنائی دیا تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"شہلا کے متعلق کچھ سوچا آپ نے؟ اب تو سرمد کو ملازمت بھی مل گئی ہے۔" یہ امی کی آواز تھی۔

"سرمد کا یہاں کیا تذکرہ؟" ابو کے لہجے میں تیزی تھی۔ لیکن آواز بلند نہ تھی۔

"گھر کا لڑکا ہے' دیکھا بھالا ہے۔ نیک اور خوش اطوار ہے۔ کوئی برائی نہیں ہے اس میں۔"

"ایک برائی ہے۔" ابو نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ بے گھر ہے۔"

"کیوں؟ یہ اس کا گھر نہیں ہے کیا؟" امی کے لہجے میں شکایت تھی۔

"ہے' بالکل ہے۔ یہ اسی کا گھر ہے لیکن یہ ہمارے داماد کا گھر نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اس صورت میں سرمد کو اپنا گھر بنانا ہو گا۔ کچھ بن کے دکھانا ہو گا۔ میں اپنی بیٹی کو جہنم میں تو دھکیلنے سے رہا۔"

"جسے آپ جہنم سمجھ رہے ہیں' ممکن ہے وہی شہلا کے لیے جنت ہو۔"

"تم خالہ ہو اس لئے وکالت کر رہی ہو۔ اچھا جاؤ' سرمد کو میرے پاس بھیجو۔ میں خود بات کروں گا اس سے۔"

"دیکھئے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہئے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ کتنا خوددار ہے۔ کسی کی مدد کے بغیر اپنے زور پر تعلیم مکمل کی ہے اس نے۔"

"تم اسے بھیجو میرے پاس۔ میں بچہ تو نہیں ہوں' وہ بات کروں گا جو درست ہو۔"

میمونہ کی سمجھ میں کچھ آیا' کچھ نہیں آیا لیکن شرمندگی ضرور ہونے لگی۔ سرمد بھائی کہتے تھے کہ چھپ کر کسی کی بات نہیں سننی چاہیے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ سرمد بھائی کو پتا چلے گا تو وہ کتنے خفا ہوں گے پھر اس نے سوچا' پتا چلے گا ہی کیسے۔ میں بتاؤں گی ہی نہیں۔

چنانچہ وہ گڑیا لانے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ گڑیا لے کر واپس آ رہی تھی کہ اس نے سرمد بھائی کو ابو کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ اس بار وہ ان کی باتیں سننے کے لئے نہیں رکی۔ ایک بری بات وہ دانستہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔



پھر شاید ایک گھنٹے کے بعد سرمد بھائی آ گئے۔

میمونہ اور ارشد معمول کے مطابق لڑ رہے تھے۔ سرمد بھائی آئے اور آپی کی کرسی پر دونوں ہاتھ ٹکا کر جھک گئے۔ میمونہ نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ بہت بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ میمونہ کی سمجھ میں کوئی وجہ تو نہیں آئی لیکن اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

آپی کھڑی ہو گئیں۔ "بیٹھئے نا۔"

"ہاں' ضرور بیٹھیں گے۔"

آپی نے پلٹ کر ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور گھبرا گئیں۔ "کیا ہوا؟" انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔ "کیسے ہو رہے ہیں آپ؟"

"کیسا ہو رہا ہوں؟" سرمد بھائی عجیب سے انداز میں ہنسے۔ "کچھ بھی تو نہیں۔ مجھے کیا ہو گا؟" وہ پھر ہنسے "اور کیا ہونا چاہیے تھا؟"

"بتائیں نا؟" آپی نے اصرار کیا۔

"ارے بھئی کچھ بھی تو نہیں ہوا تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" وہ میمونہ اور ارشد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "لو بھئی' آج تمہیں ایک زبردست کہانی سنائیں گے۔" وہ چہک کر بولے لیکن ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ آپی بے بسی سے انہیں دیکھتی رہیں۔

"بھائی جان' فاکسی پری کی کہانی سنائیں۔" ارشد نے فرمائش کی۔

"نہیں بھئی' آج تمہیں ایک بالکل نئی کہانی سنائیں گے' لیکن نامکمل ہو گی وہ۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

میمونہ اور ارشد سنبھل کر بیٹھ گئے۔ آپی' سرمد بھائی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں لیکن وہ ان سے نظریں چرا رہے تھے۔

"سنو بچو--- ایک بادشاہ تھا۔" سرمد بھائی نے کہانی شروع کی۔ "دنیا کے بیشتر بادشاہوں جیسا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ بہت خوب صورت' نیک' بہت پیاری اور بہت معصوم ---"

"آپی جیسی؟" میمونہ نے وہی سوال کیا جو وہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ کرتی تھی۔

"ہاں-- بالکل ان جیسی۔" سرمد بھائی نے پہلی بار تسلیم کیا پھر وہ ہنسے۔ "اور ایک گمنام شہزادہ تھا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں کا شہزادہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا خیر--- شہزادے نے پہلی بار شہزادی کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھی لگی۔"

"اور شہزادی کو شہزادہ کیسا لگا؟" آپی نے پوچھا۔ میمونہ کو اس پر حیرت ہوئی کیونکہ آپی کہانی خاموشی سے سنتی تھیں۔

"مصیبت یہی تو ہوئی کہ شہزادی کو بھی شہزادہ بہت اچھا لگا۔"

"مصیبت! اچھا---" آپی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "اسے مصیبت کہہ رہے ہیں آپ۔" پھر وہ شکایت بھری نظروں سے سرمد بھائی کو تکنے لگیں۔ سرمد بھائی میمونہ اور ارشد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ آپی سے نظریں چرا رہے تھے۔

"ہاں تو شہزادی کو بھی شہزادہ بہت اچھا لگا۔ بہت عرصے تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ملتے رہے۔ پھر ایک دن شہزادی بولی۔ "تم مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے چلتے؟" شہزادے نے کہا۔ "وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا' شہزادی نے کہا اس سے اچھی کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی جہاں تم موجود ہو مجھے بھی نہیں چاہیے سوائے تمہارے ساتھ کے---"

"بھائی جان!" اچانک میمونہ نے ٹانگ اڑائی۔ "شہزادی' شہزادے سے بہت پیار کرتی تھی؟"

"ہاں' بہت زیادہ۔"

"اتنا' جتنا میں آپ سے کرتی ہوں؟"

"نہیں بے وقوف۔ اس سے بہت--- بہت زیادہ۔ اتنا--- اتنا' جتنا مجھ سے---" سرمد بھائی جملہ نامکمل چھوڑ کر آپی کو دیکھنے لگے اور چاند کے نہ ہوتے ہوئے بھی آپی کے چہرے پر جانے کہاں سے چاندنی اتر آئی۔

"دراصل آپ کو پتا ہی نہیں۔" میمونہ نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔ "کہ میں آپ سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اتنا--- اتنا پیار آپ سے کبھی کوئی نہیں کر سکے گا



اور ایک دن آپ کو پتا بھی چل جائے گا۔"

"چپ ہو جا چڑیل۔" ارشد نے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔ "کہانی سننے دے ہیں بھائی جان' پھر کیا ہوا؟"

"پھر شہزادی کے اصرار پر شہزادہ بادشاہ کے پاس گیا اور اس سے شہزادی کا رشتہ مانگا۔ بادشاہ نے پوچھا تم کہاں کے شہزادے ہو؟ کتنی زمینیں ہیں تمہاری؟ شہزادے نے کہا "میرے سینے میں اس پوری دنیا سے زیادہ زمین ہے۔ وہ زمین بہت زرخیز ہے۔ وہاں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ وہاں ہر صبح اودی اودی سہانی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ دن بھر رم جھم رم جھم برکھا برستی ہے اور ہر شام بہت بڑی بڑی' خوب صورت سی چمکیلی سی دھنک نکلتی ہے۔ وہاں کی مٹی میں ہمدردی کا سونا ہے اور جب یہ سونا گداز کی شفاف جھیل کی تہ میں چمکتا نظر آتا ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہاں خیال کے رنگا رنگ جواہرات کی کانیں ہیں۔ وہ ایسا خوب صورت دیس ہے کہ جو وہاں جائے واپس آنے کے لئے کبھی تیار نہ ہو۔ وہ سارا ملک شہزادی کے لئے ہے لیکن اس کی ہر چیز پر دنیا کے تمام انسانوں کا حق بھی ہے۔ کبھی جب حبس کی شدت ہو' گرمی بڑھ جائے تو میرے سینے کی سرزمین سے اٹھنے والی گھٹائیں پوری دنیا پر چھا جاتی ہیں۔ خوب بارش ہوتی ہے پھر دھنک کی کمان آسمان پر تن جاتی ہے۔ کتنے دل بھیگ جاتے ہیں۔ کتنی آنکھیں رنگوں پر سے یقین گنوانے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔"

"بھائی جان' یہ سچ ہے کیا؟" اس بار ارشد نے مداخلت کی۔

"ہاں بھئی' بالکل سچ ہے۔" سرمد بھائی نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"اچھا بھائی جان' سب کے سینوں میں اتنی بہت سی زمین ہوتی ہے؟" میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں مونا' زمین تو سب کے پاس ہوتی ہے لیکن پھول کھلانے کے لئے' گھٹائیں اٹھانے کے لئے دھنک سجانے کے لئے بڑی جان مارنی پڑتی ہے۔ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے زیادہ تر زمینیں بنجر رہ جاتی ہیں۔"

"میرے سینے میں بھی بہت زمین ہے؟" میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں مونا۔" سرمد بھائی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر تو میں بہت محنت کروں گی' بہت جان ماروں گی' میں زمین کو بنجر نہیں رہنے دوں گی۔"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے تم انشاء اللہ بہت شاداب رہو گی۔"

"تم خاموشی سے کہانی نہیں سن سکتیں؟" آپی نے میمونہ کو ڈانٹا۔

"اچھا بھئی' پھر یہ ہوا۔" سرمد بھائی نے پھر ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا۔۔۔ "شہزادے کی باتیں سن کر بادشاہ ہنسا بولا تمہاری مملکت شہزادی کے کس کام کی۔ بہرحال کیونکہ شہزادی تمہیں پسند کرتی ہے اس لئے تمہیں یہ رعایت دے رہا ہوں تم میری صرف ایک شرط پوری کر دو۔ مجھے کہیں سے بیلے کا سیاہ پھول لا دو۔۔۔ شہزادی کے بالوں میں سجانے کے لئے میں شہزادی کی شادی تم سے کر دوں گا۔ میں تمہیں ایک سال کی مہلت دے رہا ہوں۔۔۔"

دفعتاً" آپی اٹھ کر بہت تیزی سے بھاگیں۔ شاید ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اور کرسی سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئیں۔ سرمد بھائی بھی بہت تیزی سے لپکے۔ میمونہ بھی بھاگی سرمد بھائی نے آپی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ "بس ابھی سے گھبرا گئیں؟"

"جی نہیں۔ میں نہیں گھبرائی۔ مجھے تو آپ ہی کا خیال ہے۔ اچھا شب بخیر" آپی نے کہا اور چلی گئیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر سب واپس آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "پھر کیا ہوا بھائی جان!" میمونہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔۔۔ یہ کہانی تو بعد میں مکمل ہو گی۔" سرمد بھائی نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی سنایئے نا۔" ارشد نے ضد کی۔

"بھئی ابھی تو شہزادہ بیلے کا سیاہ پھول لینے گیا ہے واپس آئے گا تو آگے کا حال اس سے پوچھیں گے۔ تبھی تو سنائیں گے۔" سرمد بھائی نے اسے تسلی دی۔

"شہزادہ کب واپس آئے گا؟" میمونہ نے پوچھا۔

"ایک سال بعد آئے گا۔ چلو مونا' اندر چلیں اب نیند آ رہی ہے۔"

تین چار دن کے بعد سرمد بھائی گھر سے رخصت ہو گئے۔ میمونہ نے پوچھا



انہوں نے بتایا کہ وہ اپنا گھر بنانے کے لئے جا رہے ہیں۔ پھر آکر اسے اپنا گھر دکھانے کے لئے لے جائیں گے۔ جاتے وقت انہوں نے میمونہ اور ارشد کو بہت ساری چاکلیٹ دی اور بہت پیار کیا۔ اس روز ان کی آنکھیں بہت چمک رہی تھیں۔ وہ بات بے بات ہنس رہے تھے۔ شاید وہ بہت خوش تھے لیکن آپی دیر تک روتی رہی تھیں۔

پھر سرمد بھائی نے میمونہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ خالی کمرا میمونہ کو بہت برا لگا۔ اس کا جی رونے کو چاہنے لگا۔

"دیکھو مونا' میری جان' تم اپنی آپی کا بہت خیال رکھنا۔ ان کا دل بہلاتی رہنا۔" سرمد بھائی نے کہا۔

اس لمحے میمونہ کو لگا کہ وہ بڑی۔۔۔ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ بڑی اور ذمے دار۔۔۔ "آپ پریشان نہ ہوں بھائی جان!" اس نے بے حد بردباری سے کہا۔ "میں آپی کا بہت خیال رکھوں گی۔ انہیں کبھی رونے نہیں دوں گی۔"

اچانک سرمد بھائی نے چہرہ چھپایا اور کھانسنے لگے۔ دیر تک وہ کھانستے رہے پھر ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ان کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ "شاید زکام ہو گیا ہے مجھے۔" انہوں نے رومال سے اپنی آنکھیں اور چہرہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ میں سمجھی تھی' آپ رو رہے ہیں۔"

"نہیں مونا' مرد کہاں روتے ہیں۔ رو ہی نہیں سکتے بے چارے۔" انہوں نے بہت بے بسی سے کہا۔

سرمد بھائی کیا گئے اپنے ساتھ گھر کی رونقیں بھی لے گئے۔ اب گھر میں ہر وقت خاموشی رہتی تھی۔ امی پہلے بھی زیادہ نہیں بولتی تھیں مگر اب تو وہ بالکل ہی چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہاں' اب وہ آپی سے بہت زیادہ محبت کرنے لگی تھیں۔ "ہر وقت کمرے میں نہ بیٹھی رہا کرو۔" وہ آپی سے اکثر کہتیں۔ ان کے لہجے میں دلار ہوتا۔ "آنگن میں بیٹھا کرو ہنسا کھیلا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جی امی!" آپی یوں کہتیں جیسے "نہیں امی" کہہ رہی ہوں۔

"میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں شہلا مگر کیا کروں بے بس ہوں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی۔"

امی اب ہر شام بچوں کے ساتھ آنگن میں بیٹھتیں لیکن میمونہ اور ارشد
نوک جھونک کے سوا کوئی آواز نہ ہوتی۔ آنگن اداس اور ویران لگتا۔ آپی اکثر
دھیرے دھیرے وہی غزل گنگناتیں جو سرمد بھائی گنگناتے تھے اور وہ اس سے انہیں
کرتی تھیں۔ دن میں، اپنے کمرے کی تنہائی میں وہ کئی کئی بار وہی غزل سنتیں مگر
وہ کمرے کا دروازہ بند نہیں کرتی تھیں۔ ایسے میں میمونہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تو
میمونہ کو سرمد بھائی کی بات اور اپنا وعدہ یاد تھا۔ وہ بساط سے بڑھ کر آپی کا
رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ سرمد بھائی کی آواز میں وہ غزل، تو وہ چپ چاپ بیٹھ
سنتی۔ پھر وہ ان سے سرمد بھائی کی باتیں کرتی۔ ان کی سنائی ہوئی کہانیاں آپی کو سنا

"تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو میری مونا؟" اکثر وہ بڑی محبت سے پوچھتیں

"بھائی جان کہہ کر گئے تھے۔"

"تو ان کی اتنی تابع دار ہو تم، ویسے ہمارا خیال نہیں ہے؟"

"ہے مگر بھائی جان کی بات اور ہے۔"

"کتنا پیار کرتی ہو ان سے؟"

"بہت زیادہ--- سب سے زیادہ۔"

مگر یوں ہوتا کہ جب میمونہ، سرمد بھائی کی سنائی ہوئی کہانیاں آپی کو سناتی
رونے لگتیں۔ ایسے میں وہ چپ ہو جاتی۔

"سناؤ نا۔ چپ کیوں ہو گئیں؟" آپی اسے ٹوکتیں۔

"نہیں، میں نہیں سناتی۔" میمونہ خفا ہو کر کہتی۔ "آپ کہانیاں سن کر رو
اور پتا ہے بھائی جان نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔"

"کیا وعدہ؟"

"یہی کہ میں آپ کا بہت خیال رکھوں گی اور میں نے یہ وعدہ بھی کیا
آپ کو رونے نہیں دوں گی۔"

"پگلی ہو تم تو۔" آپی اس کی پیشانی چوم کر کہتیں۔ "ہم رو تو نہیں رہے
تو زکام ہو گیا ہے ہمیں۔"

"اچھا!" میمونہ اطمینان کا سانس لیتی۔ "بھائی جان کو بھی زکام ہو گیا تھا



رات۔" اور وہ پھر سے باتیں شروع کر دیتی۔

یونہی بے کیف سے دن گزرتے گئے۔ ششماہی امتحان ہوئے پھر سالانہ امتحان
ہوئے۔ میمونہ کلاس میں اول آئی جبکہ ارشد ہفتم آیا تھا۔ اس کے بعد گرمی کی
چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ گھر کا سناٹا اور برا لگنے لگا۔ بے کیفی بڑھ گئی۔ کہیں کوئی خوشی
نہیں تھی۔

پھر ایک شام سرمد بھائی واپس آ گئے۔ انہوں نے امی کو سلام کیا، میمونہ اور
ارشد کا ماتھا چوما اور چاکلیٹ دی۔ وہ بہت تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔

"سرمد بیٹے، تم واپس آ جاؤ نا۔" امی نے بڑی محبت سے کہا۔

"نہیں خالہ جان یہ ممکن نہیں ہے۔ سہارے آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔"

"امی نے بڑے دکھ سے انہیں دیکھا۔ دیر تک دیکھتی رہیں۔ "اچھا کچھ دن تو
رکو گے نا؟"

"نہیں خالہ جان۔ بس رات رکوں گا صبح کو چلا جاؤں گا۔"

"تمہیں کھانے پینے کی کتنی تکلیف ہو گی؟" امی بہت دکھی ہو رہی تھیں۔

"نہیں تو خالہ جان میں بڑے مزے میں ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

میمونہ کو حیرت ہوئی۔ سرمد بھائی نے آپی کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ بلکہ ان
کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"وہ تو صورت سے ہی ظاہر ہے کہ مزے میں ہیں۔" آپی نے عجیب سے لہجے
میں کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ سب آنگن میں جا بیٹھے۔ میمونہ سرمد بھائی کو بتانے لگی کہ اس
نے آپی کا کس کس طرح اور کتنا خیال رکھا ہے۔ سرمد بھائی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ
زور زور سے آنکھیں ملنے لگے۔

"بھائی جان آپ کو ابھی تک زکام ہے؟" میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں مونا، چلتا ہی رہتا ہے۔" سرمد بھائی کی آواز بھی بدلی بدلی سی تھی۔ چہرے
کی سرخی اور بڑھ گئی تھی۔

"اچھا بھائی جان، آج وہ کہانی مکمل کریں گے؟" ارشد کو نامکمل کہانی یاد آ گئی۔

"ہاں بھئی آج تمہیں مکمل کہانی بھی سنائیں گے۔"

"آپ پھر چلے جائیں گے؟"

"ہاں مونا!"

"کہاں؟"

"اپنے گھر۔"

"تو آپ نے گھر بنا لیا ہے؟" میمونہ خوش ہو گئی۔

"ہاں، گھر تو بنا لیا ہے لیکن ویسا گھر نہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔"

"بس ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے — میں اور آپی۔" میمونہ بولی۔

"نہیں گڑیا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔" سرمد بھائی نے بے حد خفا ہو کر کہا۔ میمونہ سہم کر چپ ہو گئی۔ سرمد بھائی بہت کم خفا ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی خفگی سے اسے ڈر لگتا تھا۔

اس رات کھانے کے دوران میں ابو سرمد بھائی سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ا[illegible] پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ زیادہ تر باتیں بھائی جان کی ملازمت سے متعلق تھیں۔ ک[illegible] کھانے کے بعد ابو معمول کے مطابق اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جانے سے پ[illegible] انہوں نے سرمد بھائی سے کہا۔ "سرمد — چائے میرے ساتھ پینا' میں تمہارا انتظ[illegible] ہوں۔"

ابو کے جانے کے بعد سرمد بھائی نے کہا۔ "تم لوگ آنگن میں چلو ابھی واپس [illegible] کر میں تمہیں کہانی سناؤں گا۔" پھر وہ بھی ابو کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

میمونہ اور ارشد نے آنگن میں کرسیاں ڈالیں اور سرمد بھائی کا انتظار کر[illegible] لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آ گئے۔ آپی نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا مگر فوراً نظریں جھکا لیں۔ ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"ہاں بھئی مونا' ارشد!" سرمد بھائی نے چہک کر کہا۔ "کہاں تک پہنچی تھی [illegible] کہانی؟"

"شہزادہ بیلے کے سیاہ پھول کی تلاش میں نکلا تھا۔" میمونہ نے یاد دلایا۔

"اچھا آج بیچ میں مت ٹوکنا تم لوگ ورنہ میں کہانی بھول جاؤں گا۔"



میمونہ اور ارشد سر ہلانے لگے۔

"ہاں تو پھر ہوا یوں —" سرمد بھائی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ — "کہ شہزادہ پھول کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پھولوں کی تمام دکانوں پر اس نے پوچھا لیکن بیلے کے سیاہ پھول کا پتا نہیں ملا۔ الٹا اس کا مذاق اڑا۔ سب اس کی بات سن کر ہنس دیے۔ کئی پھول والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر بیلے کے پھول سیاہ ہونے لگے تو دنیا میں خوب صورتی کیسے رہے گی۔ سفید رنگ سب سے حسین اور پاکیزہ رنگ ہے لیکن شہزادے کو یقین تھا کہ بادشاہ نے شرط لگائی ہے تو ایسے پھول کا وجود ضرور ہو گا مگر وہ پھول والوں کو یہ بات کیسے سمجھاتا۔ بہرحال اسے تو سیاہ پھول ہی درکار تھا۔ مہینوں وہ بستی بستی خاک چھانتا پھرا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

"ایک دن اسے راستے میں ایک بزرگ صورت شخص ملا جس کے سر' داڑھی اور بھوؤں کے بال بالکل سفید تھے۔ سیاہ تسبیح کے دانوں پر بزرگ کی انگلیاں تیزی سے تھرک رہی تھیں۔ "نوجوان' تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو' بزرگ شخص نے شہزادے کو روکتے ہوئے کہا۔ شہزادے نے تمام قصہ اسے سنا دیا۔ بزرگ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "دیکھو میاں بیلے کا سیاہ پھول بہت مہنگا ملتا ہے — اپنی اوقات سے بہت زیادہ مہنگا اور سچ تو یہ ہے کہ اس میں ایسی کوئی خوبی بھی نہیں کہ جس کی وجہ سے اس کا حصول بہت ضروری ہو۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کے بغیر دنیا میں کام بھی نہیں چلتا۔ اب تو یہ ضرورت مند کی ضرورت پر منحصر ہے کہ وہ اتنے مہنگے مول پہ پھول خریدے یا نہ خریدے؟"

"شہزادے نے یہ سن کر بڑی بے تابی سے کہا۔ "قبلہ مجھے اس پھول کی شدید ضرورت ہے برائے مہربانی مجھے اس کے متعلق تفصیل سے بتائیں کہ یہ پھول کہاں ملتا ہے اور اس کی قیمت کیا ہے؟"

"بزرگ صورت شخص مسکرایا۔ "کہاں مل سکتا ہے یہ تو میں جب بتاؤں گا کہ تم اس کی قیمت ادا کرنے پر رضا مند ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔ "بہتر ہے کہ پہلے اس کی قیمت سن لو۔ اس پھول کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے سینے میں کھلنے والے تمام رنگا رنگ اور مہکتے پھولوں سے دستبردار ہونا ہو گا۔ یہ یاد رکھنا کہ تم اپنے سینے کے تمام

پھول بیچ دو گے تو وہ تتلیاں رنگوں سے محروم ہو جائیں گی جو ان پھولوں سے رنگ کر لے جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر بچوں کے دلوں میں آرزوئیں اور آنکھوں میں خوا مچلتے ہیں اور ان کے سینوں میں گداز کا پہلا پہلا بیج پھوٹتا ہے۔ دوسری طرف تمہار پھولوں کے رنگ اور خوشبوئیں کاغذ کے پھولوں کو دے دی جائے گی تاکہ انہیں مانگے داموں بیچ کر دھوکے کو فروغ دیا جا سکے۔ دنیا کو فریب میں مبتلا کیا جا سکے ا تمہیں اپنے سینے سے اٹھنے والی وہ گھٹائیں بھی اس سیاہ پھول کے عوض دینی ہوں گی رم جھم رم جھم برستی ہیں تو صرف جسم ہی نہیں بھیگتے، روح بھی بھیگتی ہے۔ دل بھیگتے ہیں۔ وہ گھٹائیں جن سے پانی کے بجائے محبت اور اس کی سرشاریاں برستی ہ جو روح کی تمام کلفتوں کو دھو ڈالیں۔ وہ گھٹائیں تمہیں بیچنی ہوں گی تاکہ پانی سوداگر پیاسوں سے ان کی قیمت تا عمر وصول کرتے رہیں اور تمہیں اپنے سینے م چھپی اس دھنک سے بھی دستبردار ہونا ہو گا جو آسمان پر اس وقت نکلتی ہے جب آنکھیں رنگوں کو اس حد تک ترس جائیں کہ رنگوں کی تمیز کھو بیٹھنے کا خدشہ پیدا جائے۔ دھوکے کے تاجر اس دھنک کے رنگوں کو جدا جدا کر کے انہیں بے رنگ چیزوں پر چسپاں کر کے لوگوں کو بیچا کریں گے تاکہ لوگ ہر روز بے رنگ اور بے ر چیزوں سے رنگوں کا دھوکا کھایا کریں اور یوں رنگوں کا اعتبار اور ان کی پہچان کھو جا اور تمہیں---

”بزرگ ابھی کہے جا رہے تھا کہ شہزادے نے اسے ٹوک دیا۔ ”بس محترم! م سمجھ گیا۔ میں اس پھول کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔“

”میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔“ بزرگ نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

شہزادہ واپس چل دیا۔ واپسی کے سفر میں اس نے ایک شخص کے ہاتھ میں کا بہت بڑا سیاہ پھول دیکھا۔ شہزادے کے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ اس نے ا پھول کی وہ قیمت ادا کی ہے کہ شہزادہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شہزادے نے اسے کہ اسے اس پھول کی قیمت کا خوب اندازہ ہے۔ پھر شہزادے نے اس سے پوچھا کہ پھول کیسے کھلتا ہے۔ وہ شخص ہنس کر بولا۔ ”یہ شیطان کی عطا ہے اور یہ پھول کھلا نہیں، بنایا ہوا ہے۔ بیلے کے سفید، حسین اور مہکتے پھولوں میں سے شیطنت



فاک ہاتھ تمام رس، تمام خوشبو نچوڑ لیتے ہیں پھر انسانی محنت کے لہو میں ضمیر کی سیاہی کو اچھی طرح گھولا جاتا ہے اور جب اس میں بدبو پیدا ہونے لگے تو کاغذ کے بنے بیلے کے پھول پر یہ رنگ چڑھا دیا جاتا ہے پھر اسے جھوٹ، بے ایمانی، رشوت ستانی، بلیک مارکیٹنگ اور سمگلنگ جیسی متعفن چیزوں کے کیچڑ میں اچھی طرح لتھیڑا جاتا ہے۔

شہزادے نے وہ پھول سونگھا تو اس کا جی متلا گیا۔ پھول سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”کیا بیلے کے سیاہ پھول میں کبھی مہک نہیں ہوتی؟“ اس پر اس شخص نے کہا کہ کسی کے مقدر کی شاخ پر اگر اللہ اپنے کرم سے بیلے کا سیاہ پھول کھلا دے تو اس پھول کی مہک دنیا کے ہر پھول سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر ایسا خوش بخت شخص اس کی مہک اور اس کے لمس سے ضرورت مندوں، مجبوروں اور لاچاروں کی مدد کا فرض ادا کرتا رہے تو اس کی خوشبو بڑھتی چلی جاتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔ نہ ہی یہ پھول کبھی مرجھاتا ہے اور اگر کوئی شخص خود غرضی سے کام لے کر اسے اپنے تک محدود کر لے تو کچھ عرصے بعد اس کی خوشبو ختم ہو جاتی ہے اور مزید کچھ عرصے کے بعد پھول مرجھا جاتا ہے۔

”شہزادہ واپس آکر اپنے مقدر کی شاخ پر اس پھول کے کھلنے کا انتظار کرتا رہا لیکن پھول نہ کھلا۔ جب بادشاہ کی دی ہوئی مدت ختم ہو گئی تو اس نے جا کر بادشاہ کو بتا دیا کہ وہ بادشاہ کی شرط پوری نہیں کر سکا ہے۔ بادشاہ نے بھی فیصلہ سنا دیا کہ وہ شہزادے سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔ شہزادی کی شادی اسی شخص سے ہو گی جس کے پاس بیلے کا سیاہ پھول ہو گا۔“

سرمد بھائی خاموش ہوئے تو لگا کہ کائنات کی نبضیں تھم گئی ہیں۔

”اب کیا ہو گا بھائی جان!“ اداس میمونہ نے پوچھا۔ کہانی پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود وہ اداس ہو گئی تھی۔

”اب شہزادی کی شادی ہو جائے گی۔“ سرمد بھائی نے جواب دیا۔

”شہزادے سے؟“ میمونہ نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں بھئی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ کوئی شخص بیلے کا سیاہ پھول لے کر آئے گا اور شہزادی کو بیاہ کر لے جائے گا۔“ سرمد بھائی کی آواز بھرا گئی۔

"جی نہیں۔" آپی اچانک بول اٹھیں۔ "ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ہم یہ فیصلہ ہرگز نہیں مانیں گے۔ ہمیں ---" وہ کچھ ثانیوں کے لئے رکیں پھر ان کے لہجے میں بے پناہ یقین آ گیا۔ "ہمیں آپ کے ساتھ زندگی کی بڑی سے بڑی تکلیف بھی بہت پیاری معلوم ہو گی۔ ابو کو اپنے لئے دولت چاہئے تو وہ خود کما لیں اور اگر وہ ہمارے لئے ایسا کہتے ہیں تو ہمیں ان کا یہ فیصلہ قبول نہیں۔ زندگی تو ہمیں گزارنی ہے ہم آج ہی ابو کو بتا دیں گے کہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے اور اگر وہ نہ مانے' تب بھی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اپنی زندگی برباد نہیں ہونے دیں گے۔"

پھر آپی خاموش ہوئیں اور سناٹا چھا گیا۔ ہوا جیسے سہم کر رک گئی تھی اور پتوں نے بھی سانسیں روک لی تھیں---

○



پھر اچانک اس خاموشی میں سرمد بھائی کی دھیمی آواز ابھری۔ ان کے لہجے میں بہت ہی محبت تھی۔ "نہیں شہلا' ایسا کبھی نہ سوچنا۔"

"زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو یونہی خراب ہونے دیں۔" آپی بپھری ہوئی تھیں۔

"اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کو دکھ دینا گناہ ہے۔ دوسروں کو دکھ دے کر خوشی حاصل کرنے والوں کو کبھی سچی خوشی نہیں ملتی۔ دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کا خیال رکھنا بھی عبادت ہے۔ تم ایسا خیال کبھی بھی دل میں نہ لانا۔"

"آپ ہمارے ساتھ ہوں تو ہم ہر حال میں خوش رہیں گے۔"

"نہیں۔ ایسا کبھی نہ سوچنا۔" اس بار سرمد بھائی کے لہجے میں سختی تھی "میں اس خاندان کا ..... اس گھر کا فرد ہوں۔ گھر کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"یوں کہئے کہ آپ بزدل ہیں۔"

"جو جی چاہے سمجھ لو مگر کبھی نہ کبھی میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ یہ میرا گھر ہے اور اس گھر کی عزت مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ تمہیں میں وہ خوشیاں نہیں دلا سکا' جن پر تمہارا حق تھا مگر مونا کی خوشیاں انشاء اللہ کوئی نہیں چھین سکے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

آپی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے مین چلی گئیں۔ سرمد بھائی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اچانک بونداباندی شروع ہوئی اور کچھ دیر بعد باقاعدہ بارش ہونے لگی۔ سب اندر چلے گئے۔

میمونہ اور ارشد بہت دیر تک سرمد بھائی کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھے رہے۔ لیکن سرمد بھائی کو جیسے ان کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ گنگناتے

رہے۔ کوئی ستارہ نہ آجائے پاؤں کے نیچے۔ قدم سنبھل کے اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے۔

نجانے کب دونوں بچوں کو نیند آگئی۔

صبح سرمد بھائی جانے کے لئے تیار ہوئے تو اس وقت بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ امی نے انہیں منع کیا کہ اس موسم میں جانے کا کیا تک ہے۔

"ارے خالہ جان۔" وہ ہنسے "یہ رم جھم کا موسم تو ہمارا موسم ہے۔ یہی تو جانے کا موسم ہوتا ہے۔"

"پھر کب آؤ گے؟"

"جب بھی آنے کے قابل ہوئے' آجائیں گے۔ خواہ دیر ہوچکی ہو۔ آپ دعا کیجئے گا کہ خدا مجھے واپسی کی اہلیت عطا فرمائے۔"

یہ سن کر امی کی نظریں جھک گئیں۔ وہ بے حد شرمندہ نظر آرہی تھیں۔

"اچھا مونا .... اللہ حافظ۔" سرمد بھائی نے میمونہ کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے ارشد کی پیشانی چومی "ہمیں بھول نہ جانا بھائی۔"

"ہم بھول ہی نہیں سکتے آپ کو۔" ان دونوں نے بیک آواز کہا۔

سرمد بھائی کے جانے کے بعد آپی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے شاید سوگئیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت میمونہ نے کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا لیکن آپی نے دروازہ نہیں کھولا۔ "جاؤ۔ مت تنگ کرو ہمیں۔" انہوں نے اندر سے چیخ کر کہا "ہمیں بھوک نہیں ہے۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ آپی نے میمونہ سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ میمونہ کا دل بہت دکھا۔ غصہ بھی آیا لیکن اسے سرمد بھائی سے اپنا وعدہ یاد تھا۔ اسے تو آپی کا خیال رکھنا تھا۔ وہ کچھ بھی کریں۔

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ شام کو بارش رکی تو دھنک نکل آئی۔ بڑی سی' چمک دار دھنک ..... سرمد بھائی کی کہانیوں والی۔ میمونہ بھاگی بھاگی آپی کے کمرے کی طرف گئی اور دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔

"کیا مصیبت ہے؟" آپی چلائیں۔

"آپی ..... آپی .... باہر تو آیئے۔ دیکھئے کیسی پیاری دھنک نکلی ہے۔"



میمونہ کو یقین تھا کہ اس بار وہ اسے اور زور سے ڈانٹیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دروازہ کھلا اور آپی باہر آگئیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔

"اوہ آپی' آپ کو تو بہت زیادہ زکام ہوگیا ہے۔" میمونہ پریشان ہوگئی۔ آپی اسے سرمد بھائی کے خالی کمرے کی طرح لگیں۔ اجڑی اجڑی اور ویران۔

اچانک آپی جھکیں اور انہوں نے میمونہ کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ دیر تک وہ یونہی ہونٹ رکھے رہیں۔ میمونہ کو وہ بوسہ بہت اچھا لگا۔ وہ سحرزدہ سی ہوگئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں "تو ہمارا اتنا خیال رکھے گی پیاری مونا۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بکھر گئی۔ میمونہ کی گردن پر گرم گرم قطرے گرے تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ آپی رو رہی تھیں۔

وہ دونوں آنگن میں چلی آئیں۔ آپی دیر تک ٹکٹکی باندھے دھنک کو دیکھتی رہیں۔

"آپی' کتنے دنوں کے بعد دھنک نکلی ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں مونا۔ آج تو رم جھم بھی ہونا تھی۔ دھنک بھی نکلنی تھی۔ نہ گھٹائیں بکی ہیں' نہ پھول' نہ ہی دھنک۔ بس آرزوئیں مرگئی ہیں۔" آپی نے کہا اور مونا سمجھ گئی کہ وہ سرمد بھائی کی کہانی کی بات کر رہی تھی۔

ماضی کی فلم بہت تیز چلنے لگی۔ اتنی تیز کہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ دو سال گزر گئے۔ دکھ اور اذیت کے' اداسیوں اور رت جگے کے دو سال۔ میمونہ ان دو سالوں میں بڑی ہوگئی۔ وقت اور ذمے داری نے اسے بڑا بنا دیا۔ وہ آپی کا یوں خیال رکھتی' جیسے وہ اس سے چھوٹی ہوں' ننھی سی بچی ہوں۔ سرمد بھائی کی بات اس کے دل سے کبھی نہیں مٹی۔ انہوں نے کہا تھا۔ اپنی آپی کا خیال رکھنا۔ سو وہ آپی کا سایہ بن گئی۔ اصرار کر کے انہیں کھانا کھلاتی۔ رات کو نیند نہ آتی تو وہ ان سے باتیں کرتی' اس کا دل بہلاتی۔

آپی نے بولنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ہاں مگر وہ اس سے باتیں کرتی تھیں۔ اپنے دل کی باتیں۔ ان کی باتوں نے اسے اور بڑا بنا دیا۔ آپی زیادہ تر باتیں سرمد بھائی کے

متعلق ہی کرتی تھیں۔ ایسے میں ان کی باتوں‘ ان کے لہجے میں زندگی ہوتی ورنہ
سے قطع نظر وہ زندگی اور امنگ سے محروم ہوچکی تھیں۔ اکثر وہ کہتیں "مونا
نے ہمیں زبردستی زندہ رکھا ہوا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ اب ہمیں زندگی بر
گزارنی۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کریں آپی۔" میمونہ انہیں دلاسا دیتی "کیا پتا‘ بھائی جان
بیلے کا سیاہ پھول مل جائے۔"

"مقدر کی شاخ پر بیلے کا پھول ایسے ہی نہیں کھلتا۔"

دو سال بعد گھر میں ہنگامہ تھا۔ سناٹے میں ڈوبا گھر دو سال بعد آوازوں سے
گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ گھر کے لوگ اب بھی سناٹے میں تھے۔ امی گم صم‘ ا
چپ چپ اور آپی نے تو رو رو کر خود کو نڈھال کرلیا تھا۔ حالانکہ موقع خوشی کا
آپی کی شادی ہو رہی تھی۔

ایک دن میمونہ نے مایوں بیٹھی آپی سے کہا "آپ انکار کیوں نہیں کر دیتیں
ابو سے ڈرتی ہیں۔"

"نہیں گڑیا۔ تمہیں کیسے سمجھائیں۔ ہم تو اسی دن ابو کے سامنے کھڑے
جاتے لیکن سرمد بھائی نے روک دیا۔ اب ان کی یہی مرضی تھی تو ہم یہ زہر بھی
لیں گے۔" آپی نے کہا پھر جوش بھرے لہجے میں بولیں "ہم بزدل نہیں۔ ہم اپنی
بھی ختم کرسکتے ہیں لیکن یہ ان کی امانت ہے۔ سو ان کے کہنے کے مطابق گزار
گے۔ گھر کی۔ خاندان کی عزت پر قربان ہوجائیں گے۔"

"اصل میں بھائی جان ہی بزدل تھے۔" میمونہ نے کہا۔

"خبردار ..... کبھی ایسا نہ سوچنا۔ عظمت کو بزدلی کا نام دینا بہت بڑی زیادتی
شروع میں ہم ان کی بات نہیں سمجھے۔ زندگی کا سب سے بڑا زیاں سامنے تھا
لئے ..... لیکن اب ہم نے جان لیا کہ بزدلی وہ ہوتی۔ خود غرضی بزدلی کی بدترین
ہے۔"

آپی کی شادی ہوگئی اور وہ زبردستی کے پیا کے گھر چلی گئیں۔ گھر اور سونا ہو
ایک عجیب بات تھی۔ امی آپی کو یاد کرتی ہوں گی۔ مگر دل ہی دل میں



نے کبھی آپی کا نام بھی نہیں لیا لیکن سرمد بھائی کو وہ بہت یاد کرتی تھیں۔ تڑپتی تھیں
ان کے لئے۔ ہر وقت پریشان رہتیں۔ بڑبڑاتیں۔ کہاں چلا گیا؟ کوئی نشان بھی نہیں
چھوڑا۔ میرا دکھی بچہ۔ گھر اور گھر والوں کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر اور اکیلا پھر رہا
ہے۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی باجی کو۔

آپی کی شادی کے موقع پر ابو نے سرمد بھائی کو تلاش کرنے .... ان کا پتہ چلانے
کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ سرمد بھائی نے وہ ملازمت ہی چھوڑ دی
تھی۔ چنانچہ ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ارشد نے بھی انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی
مگر وہ نجانے کہاں کھو گئے تھے۔

شادی کے بعد رسموں تک تو آپی گھر آئیں مگر وہ گھر آکر خوش کبھی نہیں ہوتی
تھیں۔ پھر انہوں نے آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ کبھی عید بقر عید پر آتیں تو آتیں۔ ایک
بار دولہا بھائی انہیں لے کر آئے تو امی نے ان سے شکایت کی۔ "بیٹے‘ تم نے تو ہماری
بٹی کو ہم سے چھین ہی لیا۔ ہم تو صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں اس کی۔"

دولہا بھائی شرمندہ ہوگئے۔ "امی جان‘ میں تو ہمیشہ کہتا رہتا ہوں۔ شہلا تیار ہی
نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ منع کر دیتی ہیں۔ آج بھی زبردستی لے کر آیا ہوں اور کہہ دیا ہے
کہ کم از کم ایک ہفتے انہیں یہاں رہنا ہوگا۔ مجھے احساس ہے کہ آپ لوگ انہیں کتنا
مس کرتے ہیں۔"

امی نے آپی کو غور سے دیکھا۔ آپی نے نظریں جھکالیں "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں
امی۔" انہوں نے آہستہ سے کہا "بس ہمارا دل وہاں اتنا لگ گیا ہے کہ آنے کو جی ہی
نہیں چاہتا۔ امی جان اتنا خیال رکھتی ہیں پھر پاپا کا دل بھی نہیں لگتا ہمارے بغیر۔"

"اور بیٹے‘ یہ تم نے کیا کہا کہ صرف شہلا رہے گی۔" امی دولہا بھائی سے
مخاطب ہوئیں "تم بھی تو رکو نا۔"

"جی تو بہت چاہتا ہے امی جان لیکن مجبوری ہے۔ کاروباری مصروفیات بھی
ہیں۔ پھر امی اور پاپا کی تنہائی کا بھی خیال ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں بیٹے۔" امی نے سرہلا کر کہا۔ "بس میں تو تمہاری خوشیوں
کے لئے دعا کرتی ہوں۔"

دولہا بھائی رات کے کھانے پر رکے اور اس کے بعد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپی اپنے کمرے میں بند ہوگئیں۔ انہوں نے میمونہ سے بھی کوئی بات نہ کی۔ کہہ دیا کہ انہیں نیند آرہی ہے۔

"کیا ہوگیا ہے اس لڑکی کو؟" امی متفکرانہ انداز میں بڑبڑائیں۔ "گھر کو..... سب کو چھوڑ بیٹھی۔ ایسا بھی کیا۔"

۱۴ سالہ میمونہ اب اتنی بڑی ہوچکی تھی کہ اس 'ایسا بھی کیا' کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "آدمی جس مقام پر لٹا ہو' اس سے ہمیشہ ڈرتا ہے امی۔"

امی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کے انداز میں غصہ تھا مگر وہ نرم لہجے میں بولیں۔ "اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟"

"ہاں' خاموش تماشائیوں کو قصور وار نہیں سمجھنا چاہیے۔" میمونہ نے تلخ لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

آپی نے سرمد بھائی کے جانے کے بعد سے ابو سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ کچھ پوچھتے تو ہوں ہاں کردیتیں۔ خود سے کبھی بات نہ کرتیں۔

اس صبح ناشتے کی میز پر ابو نے آپی سے پوچھا "شہلا بیٹی' تم خوش تو ہونا؟"

آپی نے جواب دینے کے بجائے منہ پھیرلیا۔ ابو کو توہین کا احساس ہوا۔ خفت کے مارے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ امی کو یہ بات بہت بری لگی۔ انہوں نے سخت لہجے میں آپی سے کہا "شہلا' تمہارے ابو نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔"

آپی ناشتا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں "آپ ان سے کہیں کہ ہم سے بات نہ کریں۔" انہوں نے ابو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امی سے کہا "ان کے منہ سے ہمیں اپنی خوشیوں کے خون کی بو آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

کہاں تو ابو کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ کہاں ایک دم سفید پڑگیا۔ ان سے بھی ناشتا نہیں کیا گیا۔ "میں نے اپنی بیٹی کو خوشیوں اور آسائشات میں تول دیا تھا۔ یہ صلہ دے رہا ہے اس کا۔" انہوں نے جاتے جاتے کہا۔



اس کے بعد کون ناشتا کرسکتا تھا۔ ارشد کالج چلا گیا۔ امی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ "کچھ بھی سہی۔ باپ سے اس طرح بات کرنے کا حق کسی کو بھی نہیں ہوتا۔"

میمونہ کچھ نہ بولی۔ وہ اختلاف کرکے امی کو اور دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوپہر کو امی نے آپی کو سمجھانے کی کوشش کی "دیکھو شہلا' کچھ بھی سہی۔ وہ تمہارے باپ ہیں اور تم سے محبت کرتے ہیں۔"

"امی پلیز۔ ابو سے محبت کے لفظ کو منسوب نہ کیا کریں۔" آپی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہارا رویہ ان کے ساتھ بہت خراب ہے۔ یہ مناسب نہیں۔"

"جانتے ہیں ہم اگر ہم نے ابو کے انداز میں ندامت اور پچھتاوا دیکھ لیا ہوتا تو ہم سب بھول جاتے۔ اگر آدمی غلط فیصلہ کرے اور بعد میں اس پر پشیمان ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے لیکن ابو تو ہماری زندگی برباد کرکے بھی خوش اور مطمئن ہیں۔ انہیں زعم ہے کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ بلکہ اپنی دانست میں وہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے ہم پر کوئی احسان کیا ہے..... ہمیں زندگی کی سچی خوشیوں سے بچا کے۔"

"وہ تم سے محبت کرتے ہیں شہلا۔ ان کے کچھ خواب ہیں تمہارے بارے میں
"

"ہم کہہ چکے ہیں کہ ابو سے یہ لفظ منسوب نہ کیا کریں۔"

"میری پوری بات سن لو۔" امی نے تحمل سے کہا۔ "انہیں نواسے کی آرزو ہے۔ تمہارے بچوں کو گود میں کھلانا چاہتے ہیں وہ۔"

"ان کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ہم پوری نہیں ہونے دیں گے۔" آپی نے بے حد وثوق سے کہا۔ "ان کا یہ مان ٹوٹ جانا چاہئے کہ وہ ہر فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہمیں ماں نہیں بننا ہے۔ اس معاملے میں ان کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں۔" آپی کہتے کہتے رکیں پھر بولیں۔ "انہیں بتا دیجئے گا کہ ایسی کوئی آس نہ رکھیں۔"

امی کا چہرہ فق ہوگیا۔ چند لمحے تو ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا پھر انہوں نے

افسردگی سے کہا "تم کتنی منتقم مزاج ہوگئی ہو شہلا۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ
سے تمہیں کتنا بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے ؟"

"ہمیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جو پہنچنا تھا' پہنچ چکا۔ اب تو ہم نفع و
کے تصور سے بھی بے نیاز ہیں۔"

"یہ آرزو تمہارے ساس سسر کی اور تمہارے شوہر کی بھی تو ہوگی۔"

"ہوتی رہے۔" آپی نے بے پرواہی سے کہا۔

"یہ کمی رہ جائے تو گھر خراب ہو جاتا ہے شہلا۔" امی نے انہیں سمجھا
کوشش کی۔

"گھر!" آپی تضحیک آمیز انداز میں ہنسیں "گھر ہمارے نصیب میں کہاں۔
ہمارا گھر ہے نہ وہ۔"

"مرد کو دوسری شادی کرتے دیر نہیں لگتی۔"

"ہمیں کوئی پرواہ نہیں امی۔ پاؤں میں پڑی زنجیر کو مجبوراً" ہی گوارا کیا
ہے۔ اسے دل میں کون ڈالتا ہے۔ ہم فیروز کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنیں گے

"فیروز کو معلوم ہے ؟" امی کے لہجے میں راز داری آگئی۔

"شاید نہیں۔ لیکن ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ معلوم ہو جائے تو بھی کیا۔"

اس کے بعد امی کے لئے آپی سے مزید بات کرنا ممکن نہیں رہا۔ انہیں
کے لئے چپ لگ گئی۔ یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بربادی اتنی مکمل ہ
وہ ماں تھیں۔ اس کے بعد پل پل انہیں بیٹی کے اجڑنے کا خوف ستاتا رہا۔ یہ
بات ہے کہ ان کا خوف بے بنیاد ثابت ہوا لیکن وہ کچھ ہوگیا' جس کے بارے
انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اس ایک ہفتے میں' جو آپی نے جبراً" قہراً" وہاں گزارا' میمونہ کو صحیح معنوں
احساس ہوا کہ آپی کتنی بدل گئی ہیں۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سانس ضرور لے رہی تھ
زندہ نہیں تھیں۔ زندوں والی کوئی بات نہیں تھی ان میں۔ کم گو تو وہ پہلے ہی ت
مگر اب تو وہ ہلائے جلائے بغیر بولتی ہی نہیں تھیں اور بولتیں تو ان کی باتوں
زہر بھرا ہوتا' جو زبردستی انہیں پلا دیا گیا تھا۔ میمونہ نے انہیں اس دور میں بھی



جب اندھیری راتوں میں بھی ان کے چہرے پر جانے کہاں سے چاندنی اتر آتی
اس نے ان کے چہرے پر بھری دوپہر کی دھوپ کو انکھیلیاں کرتے دیکھا تھا مگر
دھوپ ڈھل چکی تھی۔ دم توڑتی شام کی سایہ زدہ زرد دھوپ ان کے چہرے پر
پرچھائیاں بناتی بگاڑتی نظر آتی تھی۔ لحہ لحہ بولتی چمکتی آنکھیں اب یوں چپ رہتی
جیسے انہیں کبھی بولنا ہی نہ آیا ہو۔ ان کا ہم سخن' ہم زباں کھو چکا تھا۔

اس ایک ہفتے میں صرف میمونہ نے ان کے ساتھ وقت گزارا۔ آپی صرف ان
لمحوں میں زندہ ہوتی تھیں' جن میں وہ سرمد بھائی کی باتیں کرتیں۔ سرمد بھائی کے
متعلق باتیں کرتے وقت ان کے لفظوں اور لہجے سے محبت برستی۔ کبھی تو یوں لگتا'
جیسے وہ ان کے سامنے موجود ہوں۔ ان کا انداز والہانہ ہوتا۔ پھر اچانک وہ چونکتیں'
جیسے کوئی خوب صورت خواب ٹوٹ گیا ہو۔ پھر وہ پوچھتیں "کچھ پتا بھی چلا ان کا
کہاں ہیں وہ ؟ کیسے ہیں ؟"

"نہیں آپی۔ ارشد تو اب بھی انہیں تلاش کرتا ہے۔"

یہ سن کر آپی یوں چپ ہو جاتیں' جیسے آوازوں کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی
نہ ہو۔ میمونہ شدت سے ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی۔ اسے ان سے محبت بھی
بہت تھی اور پھر یہ سرمد بھائی کی ہدایت بھی تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ آپی کو اس کی
ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

مگر اس روز سرمد بھائی کے متعلق پوچھنے اور میمونہ کا جواب سننے کے بعد وہ
چپ نہیں ہوئیں۔ "خیر..... ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں' ٹھیک ٹھاک
ہیں۔ کسی تکلیف یا پریشانی میں نہیں ہیں۔" انہوں نے بڑی طمانیت سے کہا۔

"کہاں ہیں بھائی جان ؟" میمونہ نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ آپی کو بغور دیکھ
رہی تھی۔

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔"

"مگر آپ کہہ رہی تھیں کہ ....."

"ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ جہاں بھی ہیں' ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کسی تکلیف یا
پریشانی میں نہیں ہیں۔"

"مگر آپ کو کیسے معلوم ؟"

"پگلی مونا' دلوں کے رشتوں میں رابطے کبھی نہیں ٹوٹتے۔ ہمیشہ جڑے ر ہیں۔" انہوں نے بے حد محبت سے کہا۔

"تو پہلے آپ کو کیوں معلوم نہیں ہوا ؟"

"پہلے بھی معلوم تھا۔"

"مگر آپ نے تذکرہ نہیں کیا....."

"کیا کرتے۔ وہ پریشان تھے' تکلیف میں تھے۔ اب کہیں سکون ملا ہے انہیں

میمونہ کو لگا کر خدانخواستہ آپی کا دماغ چل گیا ہے۔ اسے وہ بہکی بہکی باتیں رہی تھیں "آج آپ خوش لگ رہی ہیں ؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج ہم خوش ہیں۔ اطمینان جو ہوا ہے۔"

"تو پہلے کیوں پریشان اور دکھی رہتی تھیں ؟"

"ان کی وجہ سے ورنہ اپنی اذیت اگر مستقل ہو تو آدمی اس کا عادی ہو جا مگر آج ہمیں سکون ہوگیا۔"

"لیکن آپی' دلوں کے رابطے کیسے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حال کیسے ہوتا ہے۔"

آپی چند لمحے سوچتی اور الجھتی رہیں "اب ہم تمہیں کیسے سمجھائیں۔ دو کے درمیان سچی محبت ہو تو وہ کبھی ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہتے۔ وہ دوسرے سے دور ہوں تو ان کا کچھ بھی اپنا نہیں رہتا۔ کچھ بھی اپنے لئے نہیں ان کے دل اپنے لئے نہیں دھڑکتے' اپنے دکھ میں نہیں تڑپتے۔ وہ خالی ہو جاتے محض خون پمپ کرنے والا آلہ بن جاتے ہیں۔ ان کے ذہن اپنی فکر' اپنی پر میں نہیں الجھتے۔ وہ بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ خالی اور دوسری طرف سے کسی منتظر ہیں۔ اور ان کی آنکھیں اپنے لئے نہیں بھیگتیں' اپنے لئے خواب بھی دیکھتیں۔ وہ بھی خالی رہتی ہیں۔" وہ کہتے کہتے رکیں پھر بولیں۔ "ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے ورنہ سچ جانو' ہم تو اپنے لئے مرچکے ہیں۔ کبھی ہمارے دل میں د درد سا محسوس ہوا اور دل پریشان ہوگیا۔ ہمیں معلوم ہوگیا کہ انہیں کوئی دکھ



وہ پریشان ہیں۔ کبھی ہم فکر مند ہو جاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہیں کوئی فکر ہے۔ کبھی بیٹھے بیٹھے یونہی ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے حالانکہ ہمیں کوئی تکلیف ہوتی ہے' دکھ نہ پریشانی۔ بے سبب آنسو جاری ہو نے کا مطلب ہے کہ انہیں تنہائی کا شدید احساس ہو رہا ہے اور وہ اپنے آنسو ضبط رہے ہیں۔ انہیں کوئی دکھ ستا رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم ان کے تمام مات کو شیئر کرتے ہیں اور یوں ان کا دکھ بٹ جاتا ہے۔ پریشانی اتنی بڑی نہیں تی اور گریہ تھم جاتا ہے اور ہماری ننھی گڑیا کبھی اللہ کی خاص عنایت ہو تو ہماری خواب آنکھوں میں خواب اتر آتے ہیں۔ ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ وہ کس حال ں ہیں۔ لیکن ہم بھی خوب ہیں۔ وقت سے پہلے تمہیں اتنی مشکل باتیں سمجھانے کی شش کر رہے ہیں۔ کیا سمجھ میں آرہا ہوگا تمہاری ؟"

"میں سمجھ رہی ہوں آپی۔" میمونہ نے بے حد اعتماد سے کہا۔ "اب اتنی چھوٹی ی نہیں ہوں۔" وہ کچھ دیر ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے کچھ سوچتی رہی پھر بولی "کبھی کبھی ے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے آپی۔"

آپی کی آنکھوں میں دلچسپی کی ایک چمک ابھری "مثلاً ؟"

"آپ کے معاملے میں بھی اور بھائی جان کے معاملے میں بھی۔" میمونہ نے کہا "آپ تو جانتی ہیں آپی کہ میرا اپنا کوئی دکھ نہیں' کوئی پریشانی نہیں۔"

"اس عمر میں ہوتی بھی نہیں۔"

"مگر میں بیٹھے بیٹھے بلاوجہ پریشان ہو جاتی ہوں۔ دل بیٹھنے لگتا ہے۔ آنکھیں تی ہیں اور خواہ مخواہ آنسو بہنے لگتے ہیں اور بھائی جان کو میں خواب میں دیکھتی رہتی ہوں۔"

اب آپی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ بالاخر انہوں نے کہا "اب تو تم بڑی ہوگئیں۔ اچھا' اپنا کوئی خواب سناؤ ہمیں۔"

"جی آپی۔ بھائی جان کے جانے کے بعد میں نے پہلا خواب دیکھا تھا۔ دیکھا کہ یک بہت خوب صورت باغ میں ہیں پھر ایک بہت خوب صورت پروں والی تتلی نظر آتی ہے۔ اس تتلی کے پروں پر دھنک کے سارے رنگ تھے۔ پروں کا

ڈیزائن بھی بہت خوب صورت تھا۔ وہ پری کسی پھول پر بیٹھتی اور بھائی جان جیسے قریب پہنچ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے' اڑ جاتی۔ اسی طرح بھائی جان اس کے پیچھے لگے لگے باغ سے باہر آگئے۔ اچانک انہوں نے خود کو ایک گھنے اندھیرے جنگل میں پایا۔ اس جنگل میں راستوں پر کانٹے بھی تھے۔ قدم قدم پر بھائی جان کے پیروں میں کانٹے چبھتے۔ وہ رک کر پیر سے کانٹا نکالتے اور خون کے اس سرخ قطرے کو حیرت سے دیکھتے' جو چمک دار یاقوت کی طرح پیر سے چپکا ہوتا۔ پھر وہ آگے بڑھتے مگر پھر کوئی کانٹا انہیں روک دیتا اور اچانک بھائی جان کو احساس ہوا کہ وہ تتلی او جھل ہوگئی ہے' جس کے لئے وہ یہاں تک آئے تھے۔ اس کے بعد وہ جنگل سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے مگر اتنا اندھیرا تھا کہ راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بھائی جان وہاں بھٹکتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ تھکن سے چور ہوگئے اور کانٹوں سے ان کے پیر لہولہان ہوگئے۔ آخر میں وہ تھک کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اندھیرے جنگل کو رات نے اور اندھیرا کر دیا تھا۔ بس پھر میری آنکھ کھل گئی آپی۔ اور یقین کریں' وہ بہت لمبا خواب تھا۔ پوری رات میں وہ خواب دیکھتی رہی تھی اور آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی۔" اس نے سر اٹھا کر آپی کو دیکھا۔ وہ نگاہوں میں حیرا لئے اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "کیا ہوا آپی؟" اس نے پوچھا۔

آپی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "اللہ .... یقین نہیں آتا۔" انہوں نے کہا "بالکل یہی خواب ہم نے دیکھا تھا .. بالکل یہی .... اور ہمیں یقین ہے کہ ہم دونوں نے یہ خواب ایک ہی وقت میں دیکھا ہوگا۔" وہ کہتے کہتے رکیں' چند لمحے کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں "ہمیں اس خواب کے سچے ہونے کا یقین تھا مگر اب تو ہم اس کی سچائی کی قسم کھاسکتے ہیں۔"

"آپ نے بھی بالکل یہی خواب دیکھا تھا؟" میمونہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل یہی۔" آپی نے پرخیال لہجے میں کہا پھر اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولیں "جواب ہمیں معلوم ہے لیکن ہم تمہارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم ہم سے کتنی محبت کرتی ہو۔ مگر سچ سچ بتاؤ تم ہم سے زیادہ محبت کرتی ہو یا سرمد بھائی سے۔"



"سرمد بھائی سے۔" میمونہ نے بلاجھجک کہا "بھائی جان سے زیادہ محبت تو میں کسی سے کر ہی نہیں سکتی۔ ساری دنیا کے لوگوں کو ملا کر میں جتنی محبت کرتی ہوں' اس سے زیادہ اکیلے بھائی جان سے کرتی ہوں۔" وہ رکی اور اس نے آپی کو غور سے دیکھا "آپی ..... آپ کو برا تو نہیں لگا؟ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی مجھ سے؟"

"ارے نہیں پگلی۔" آپی نے اسے محبت سے لپٹا لیا "ہمیں تو خوشی ہوئی یہ سن کر اطمینان ہوا۔ ہم محبت کو سمیٹ کر رکھنے کے نہیں' پھیلانے کے قائل ہیں۔ ہم بغض کرنے والے بھی نہیں اور ویسے بھی اب تو ہم اس پوزیشن میں نہیں۔"

"لیکن آپی' یہ والا خواب میں نے نہیں دیکھا۔ یہ جس سے آپ کو تسلی ہوئی ہے۔"

"ہوتا ہے' ایسا بھی ہوتا ہے۔ رابطہ مستحکم رکھو گی تو ایسا نہیں ہو گا۔"

آپی ایک ہفتہ گزار کے دولہا بھائی کے ساتھ چلی گئیں۔ امی کو بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ پھر آپی کا آنا بالکل ہی کم ہوگیا۔ صرف عید اور بقر عید پر آتیں مگر وہ رکتی کبھی نہیں تھیں۔ دولہا بھائی کے ساتھ آتیں اور ان کے ساتھ ہی چلی جاتیں۔ امی نے کبھی رکنے کو نہیں کہا۔ ابو کی تو کبھی آپی سے بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ دولہا بھائی سے وہ ضرور باتیں کرتے تھے۔ میمونہ اور ارشد آپی سے رکنے کو کہتے تو وہ ہمیشہ کہتیں "پھر آئیں گے اور ایک ہفتہ رکیں گے کم از کم۔" ...... لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

وقت کا کام گزرنا ہے۔ وہ گزرے جا رہا تھا۔ ارشد میڈیکل میں تھا اور میمونہ نے انٹر کرلیا۔ اس دوران میں آپی سال میں بس دو بار آتی رہی تھیں۔ میمونہ کو انہیں دیکھ کر تشویش ہوتی تھی۔ ان کی صحت تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ میمونہ جانتی تھی کہ سرمد بھائی کا روگ انہیں اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔

آپی کی شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے لیکن وہ اب بھی بے اولاد تھیں۔ میمونہ دولہا بھائی کی عظمت کی قائل ہوگئی۔ انہیں یقیناً" اولاد کی خواہش تھی اور پھر والدین کا دباؤ بھی تھا ان پر مگر وہ کبھی دوسری شادی کا نام زبان پر نہیں لائے۔ وہ بے قصور تھے۔ بے تعلق تھے ان معاملات سے لیکن انہیں برابر کی سزا ملی تھی۔ سزا کے سوا

انہیں کچھ بھی تو نہیں ملا تھا۔ آپی انہیں کبھی خوشی نہیں دے سکیں مگر وہ ہمیشہ انہیں خوشیاں دینے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ سوچے بغیر کہ آپی کو خوشیوں کی طلب ہی نہیں ہے۔

میمونہ تو یہ سمجھتی تھی کہ دولہا بھائی کی زندگی کے پانچ خوب صورت اور امنگ بھرے سال ناکردہ گناہ کی سزا میں گزر گئے۔ آخری بار آپی چند روز رہنے کے لئے آئیں تو اس نے یہ بات آپی سے کہہ بھی دی۔ آپی یہ سن کر افسردہ ہوگئیں "ٹھیک کہتی ہو مونا۔" انہوں نے آہستہ سے کہا "لیکن ہم کیا کرتے۔ ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے یہ ہمارے نصیب کا لکھا تھا' ویسے ہی ان کے نصیب کا لکھا ہے سمجھ لو اسے۔"

آخری بار آپی گھر رہنے کے لئے آئیں تو ان کی شادی کو پانچ سال ہوچکے تھے اور انہیں دیکھ کر میمونہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ بہت کمزور' بہت بیمار لگ رہی تھیں۔ "آپی' کیا ہوا ہے آپ کو؟" میمونہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ وہ جو سات سال پہلے ہوا تھا' وہی چل رہا ہے... اور چلتا رہے گا آخری سانس تک۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ....؟"

"تم تو جانتی ہو گڑیا۔ سات سال پہلے دیمک لگی تھی ہمیں۔" "آپی! آپ کو خیال بھی نہیں کہ آپ کو دیکھ کر ہم سب اداس ہو جاتے ہیں۔" میمونہ نے شکایت کی۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔" آپی بولیں "خوش ہو جاؤ کہ ہم صرف تمہارے لئے آئے ہیں... صرف تم سے ملنے۔ پھر جانے موقع ملے نہ ملے۔"

ان دنوں میمونہ کو بھی فرصت تھی۔ انٹر کا رزلٹ ابھی نہیں آیا تھا۔ درحقیقت آپی کے قیام کے ان سات دنوں کا ہر لمحہ اس نے آپی کے ساتھ گزارا۔ دونوں گزرے دنوں کی اور خاص طور سے سرمد بھائی کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ میمونہ وہ دن کبھی نہیں بھولی۔

ساتویں دن آپی ناشتے کے بعد میمونہ کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی بلکہ سنگینی تھی۔ "آؤ بیٹھو ہمارے پاس۔" انہوں نے میمونہ سے کہا۔ "پورے دن ہمارے پاس رہو۔ پتا ہے' آج ہم چلے جائیں گے۔"



"اور کچھ دن رک جائیں نا۔" میمونہ نے کہا۔

"نہیں رک سکتے۔ وقت پورا ہوگیا ہے۔" آپی نے عجیب سے لہجے میں کہا "آج ہم بہت ساری باتیں کریں گے۔"

"باتیں تو ہم روز کرتے رہے ہیں۔" میمونہ نے ہنستے ہوئے کہا "اور ہم نے کیا ہی کیا ہے۔"

"لیکن آج کا معاملہ مختلف ہے۔" آپی نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بہت خاص دن ہے۔"

"خاص! وہ کیسے۔"

آپی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری "چھ دن ہم ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ آج صرف حال اور مستقبل کی باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میمونہ نے اثبات میں سرہلایا۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" اچانک آپی نے پوچھا۔

"سترہ سال۔"

"بہت کم عمر ہو ابھی۔" آپی نے آزردگی سے کہا "لیکن اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ وقت نے .... اور کچھ ہم نے ... وقت سے پہلے ہی سمجھ دار بنا دیا تمہیں۔ یہ زیادتی ہے۔ اس پر ہمیں معاف کر دینا۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" میمونہ نے احتجاج کیا "اور میرے متعلق کیوں کر رہی ہیں۔"

آپی پھیکی پھیکی ہنسی ہنسنے لگیں "آج تو تمہارے ہی متعلق بات ہوگی۔ ہم نے کہا تھا ناکہ آج کا دن حال اور مستقبل کے نام ہے۔"

میمونہ کو آپی کے انداز اور لہجے سے ڈر لگنے لگا "تو پھر؟"

"پھر یہ کہ ہم نہ حال ہیں نہ مستقبل۔ ہم تو بس ماضی ہیں' دکھوں' اذیتوں اور

پچھتاووں سے بھرا ماضی۔ ہم تو گزر چکے مونا گڑیا۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔ "جبکہ تم حال ہو .... اور مستقبل انشاء اللہ تمہارا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ تابناک ہو اور تمہارے لئے زندگی کی سچی خوشیاں لائے۔"

"آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپی۔" میمونہ روہانسی ہوگئی۔

"مونا' آج کی ہماری ہر بات بہت توجہ سے سننا اور کبھی نہ بھولنا۔ اسے ایک جانے والی کی وصیت سمجھ لو۔"

میمونہ رونے لگی۔ آپی نے اسے لپٹا کر' پیار کر کے چپ کرایا۔ "رو مت گڑیا۔ تم تو ہمارا بھلا چاہنے والوں میں سے ہو۔ کیا ہمیں دکھی دیکھنا اچھا لگتا تھا تمہیں۔ ارے ہمیں تو مکتی مل رہی ہے۔ مشکل آسان ہو رہی ہے ہماری۔ ہم تو بہت خوش ہیں۔ ہمیں ہمارے ظرف سے زیادہ ملا تھا۔ اللہ جانتا ہے کہ کیسے سہا ہم نے مگر اب سکون آجائے گا۔"

میمونہ کا یہ حال تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"دیکھو مونا گڑیا' ہم پہلے ہی تم سے معافی مانگ رہے ہیں۔ ہم سے محبت کرتی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔ ہم تمہیں بہت بڑا بوجھ' بہت بڑی امانت سونپ کر جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ تم ہمیشہ ہماری دعاؤں کے سائے میں رہو گی لیکن ہمارا سونپا ہوا بوجھ شاید تمہیں بہت ستائے۔ ایسا ہو تو ہم سے خفا نہ ہونا۔ بار بار معاف کرتی رہنا ہمیں۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں آپی۔" میمونہ گڑگڑائی۔

آپی نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے چابیاں نکالیں۔ وہ کی چین میں منسلک ایک گچھا تھا۔ آپی نے وہ اس کی طرف بڑھایا "یہ ہماری الماری کی چابیاں ہیں۔ اب یہ الماری اور اس کی ہر چیز تمہاری ہے۔ بس ایک شرط ہے۔ جب ہم نہ رہیں تو اسے اپنی ملکیت سمجھ لینا۔"

"لیکن آپی ...."

"اور اب ہم تمہیں اپنی سب سے قیمتی چیز سونپ رہے ہیں۔" آپی نے اس کی بات کاٹ دی "جانتی ہو' وہ کیا ہے ؟"



میمونہ نے نفی میں سرہلایا "نہیں آپی۔"

"ہماری وہ قیمتی چیز تمہارے لئے بہت بڑا بوجھ اور بہت بڑی آزمائش ثابت ہوسکتی ہے اور وہ قیمتی چیز ہے سرمد کی محبت ...."

میمونہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے لئے وہ بہت بڑا دھماکا تھا۔ "یہ .... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی۔ محبت کوئی گلے کا ہار یا انگلی میں موجود انگوٹھی تو نہیں کہ جب جی چاہا' اتاری اور کسی کو دے دی" یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں تلخی آگئی "اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں تو ویسے ہی بھائی جان سے محبت کرتی ...."

آپی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "بس' آئندہ کبھی انہیں بھائی جان مت کہنا۔ سرمد بھائی کہا کرو۔"

میمونہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ ؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ اسے وہ دن یاد تھا' جب آپی نے اسے اور ارشد کو مجبور کیا تھا کہ وہ انہیں سرمد بھائی کے بجائے بھائی جان کہا کریں اور آج ....

آپی نے جیسے اس کی سوچیں پڑھ لیں "وہ اور بات تھی۔ اب اور بات ہے۔" وہ بولیں "اور ہاں' ہم جانتے ہیں کہ تم سرمد سے محبت کرتی ہو لیکن گڑیا جان' تمہاری محبت اور ہے اور جو محبت ہم تمہیں سونپ رہے ہیں' وہ اور ہے۔ تمہاری محبت تمہارے لئے بوجھ نہیں لیکن جو محبت ہم تمہیں سونپ رہے ہیں ' وہ تمہارے لئے بوجھ ہی ہوگی اور آزمائش بھی۔ اسی لئے تو تم سے معذرت بھی کر رہے ہیں۔"

"لیکن آپی ...." میمونہ کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔

"مونا' ہماری جان۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔" آپی نے بڑی محبت سے کہا "تم بچی نہیں ہو اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار بھی ہو۔ لیکن گڑیا' بہت سی چیزیں' بہت سی باتیں پھر بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان کا عقدہ کھلنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس وقت سے پہلے آدمی انہیں نہیں سمجھ پاتا۔ ہم سے پوچھو تو اس وقت تم یہ بوجھ قبول کر کے ہم پر احسان کر رہی ہو۔ لیکن آنے والے وقت میں کبھی نہ کبھی تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تم پر احسان کیا تھا اور باتیں دونوں ہی سچی ہوں گی۔ بس اس وقت تو تم ہماری بات مان لو اور ہم سے وعدہ کرو کہ سرمد کے سوا تم کسی سے شادی نہیں کرو

گی۔ انہیں ایک گھر اور زندگی کی تمام خوشیاں دو گی۔ ان کی ہر محرومی کی تلافی
گی۔ ان کے صبر کا صلہ بن جاؤ گی تم ۔ وعدہ کرو ہم سے۔"

میمونہ گنگ بیٹھی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"وعدہ کرو ہم سے مونا جان۔ ورنہ ہم سکون سے مر بھی نہیں سکیں گے۔" آپی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ان کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

"کیسے کروں آپی۔" میمونہ نے بے بسی کہا "کون جانے' آگے نصیب میں لکھا ہو۔ کیا پتا' میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو آپ کے ساتھ ہوا تھا اور پھر آپ کے حصے کی' آپ کے نام کی اتنی بڑی خوشی میں کیسے لے سکتی ہوں۔ وہ میری تو نہیں ہیں نا۔"

آپی رونے لگیں۔ "پگلی' وہ اب ہماری خوشی ہے ہی کب۔ کیسے سمجھائیں تجھے۔ اگر خدانخواستہ فیروز ہمیں چھوڑ دیں اور سرمد آ بھی جائیں تو تو کیا سمجھتی ہے ہم سرمد سے شادی کرلیں گے۔ کبھی نہیں۔ اس خوشی کو تو ہم نے کھو دیا۔ ہم ان کے لئے نہیں اور وقت سے نہ ڈر گڑیا۔ نصیب کی بھی فکر نہ کر۔ بس سچے دل سے وعدہ کرلے۔ اللہ سے لولگا کے۔ پھر وہ خود مدد کرے گا اس کے ایفا کے لئے۔"

"آپ بچوں جیسی بات کر رہی ہیں' آپی۔ اول تو یہ خیال عجیب لگ رہا ہے اور پھر بھائی جان ...."

"بھائی جان نہیں' سرمد بھائی کہو۔" آپی نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ کھسیا گئی۔ اسے شرم آ رہی تھی "میں یہ کہہ رہی ہوں آپی کہ ممکن ہے سرمد بھائی نے شادی کرلی ہو' مستقبل میں کرلیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آس ٹوٹ جانے کے بعد بھی وہ عمر بھر.."

آپی کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا "ہم مانتے ہیں کہ تم انہیں زیادہ چاہتی ہو۔ تمہاری محبت ہماری محبت سے بڑی ہے۔ لیکن تم انہیں نہیں جانتیں۔" ان کے لہجے میں ملامت تھی "وہ جب بھی واپس آئیں' آئیں گے ضرور .... اور وہ تنہا ہوں گے۔ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ اسی لئے تو تم سے وعدہ لے رہے ہیں ہم۔"

ہمیشہ کی جذباتی میمونہ اس روز حقیقت پسند بن کر سوچ رہی تھی "میں نے مانا کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"



اس نے آہستہ سے کہا "لیکن یہ تو سوچیں کہ سرمد بھائی کے دل پر آپ کا نام لکھا ہے۔ وہ مجھے کیسے ..." اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔ شرم اور شرمندگی سے اس کا برا حال تھا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ صرف تمہیں قبول ہی نہیں کریں گے' اس سے زیادہ محبت کریں گے تم سے' جتنی ہم سے کرتے تھے۔ ایک تو ان کے دل میں تمہاری محبت پہلے سے موجود ہے اور پھر ہم انہیں سمجھا دیں گے۔"

"آپ کیسے سمجھا دیں گی ؟ آپ کو پتا معلوم ہے ان کا ؟"

"تم اسے چھوڑ دینا۔ یہ ہمارا درد سر ہے۔ تم بس وعدہ کرو ہم سے۔"

میمونہ کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ خدانخواستہ آپی کے دماغ پر کچھ اثر ہوگیا ہے۔ کوئی نارمل آدمی تو اس طرح کی بات نہیں کرسکتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے ....

"وعدہ کرو نا ہم سے۔" آپی نے تند لہجے میں کہا۔

میمونہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور ان کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے تھام لئے "میں آپ کا کہا ٹال سکتی ہوں آپی؟" اس نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں..."

آپی اسی رات دولہا بھائی کے ساتھ چلی گئیں۔ اگلی صبح میمونہ نے امی سے کہا "امی' میں آپی کے کمرے میں منتقل ہونا چاہتی ہوں۔"

امی نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا لیکن کوئی اعتراض نہیں کیا۔

آپی کے کمرے میں ان کے بیڈ پر لیٹ کر وہ آپی کی گفتگو پر غور کرتی رہی۔ اس نے سرمد بھائی کا تصور کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ وہ انہیں بہت غور سے دیکھتی رہی۔ بے شک' وہ ان سے محبت کرتی تھی .... بہت .... بہت زیادہ .... اتنی محبت کہ شاید کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی' لیکن یہ وہ محبت نہیں' جو آپی سرمد بھائی سے کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ایسا سوچنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس خیال نے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی اور اب اسے ایسا سوچنے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ اب وہ محبت کرسکتی تھی۔ اسے بہت بڑی خوشی کا احساس ہوا مگر فورا" ہی اس کے اندر ملامت ابھری اور اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

تمہاری خوشی کی بنیاد ایک بہت محبوب اپنے کے دکھ پر ہے۔ اس کے اندر کی سرگوشی میں کہا۔

ایک ہفتے بعد خبر آئی کہ آپی کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور وہ ہاسپٹل ہیں۔ گھر میں کسی نے اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیا لیکن ہاسپٹل جاکر آپی کو دیکھ سبھی دہل گئے۔ وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھیں۔ صرف ایک ہفتے میں اتنا فرق!

سبھی آپی کو دلاسے دے رہے تھے۔ امید بندھانے والی باتیں کررہے تھے وہ بس مسکرا رہی تھیں۔ صرف میمونہ نے ہی اس مسکراہٹ پر غور کیا اور اسے سکی۔ اس مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے' نجات کی خوشی' پچھتاوا' تاسف' معذرت درگزر۔

اگلے روز دولہا بھائی گھر آئے۔ وہ سب کو آپی کی اصل حالت سے آگاہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپی جگر کے سرطان میں مبتلا ہیں۔

یہ سن کر سب کے چہرے ستے گئے۔ گھر پر موت کا سا سناٹا چھا گیا پھر ا بڑی مشکل سے کہا "یہ .... یہ سب کیسے ہوگیا .... اچانک!"

"تشخیص ہونے میں دیر ہوگئی۔" دولہا بھائی نے بے حد تاسف سے کہا۔

"کوئی .... امکان ہے ؟" ابو کی ڈوبتی آواز ابھری۔

"دعا کیجئے۔" دولہا بھائی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

ابو تو بالکل ہی گم صم ہوگئے۔ سب لوگ روز ہاسپٹل جاتے تھے۔ میمونہ میں آپی ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ آپی کو اذیت پر اسے رونا آتا لیکن وہ ان کے رو بھی نہیں سکتی تھی۔ آپی تکلیف سے تڑپتیں یا پھر ان پر غشی طاری رہتی اور وہ ذرا بہتر ہوتیں تو اسے وعدہ یاد دلاتیں۔ اصرار کرتیں کہ اسے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔ "سرمد بہت اچھے انسان ہیں۔" سرمد بھائی کے متعلق باتیں کرتے ان کے لہجے میں محبت ہوتی "انہیں خوش رکھنے والا اللہ سے بڑا اجر پائے گا لڑکی بہت خوش نصیب ہوگی' جو ان کی دلہن بنے گی...."

ایک دن بیٹھے بیٹھے وہ مسکرائیں "مونا' تم پانچ سال کی تھیں تو تم نے



دلہن بننے کا عزم کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے ؟" انہوں نے پوچھا۔

میمونہ شرمندہ ہوگئی "وہ تو بچپن کی بات ہے آپی۔ معصومیت میں کہا تھا۔"

"معصومیت سچ کی تائید اور طاقت کو اور بڑھا دیتی ہے۔" آپی پھر مسکرائیں "ہمیں لگتا ہے' اللہ میاں نے اسی دن تمہیں ان کے نام لکھ دیا تھا۔"

میمونہ نے موضوع بدلنے کی بہت کوشش کی مگر آپی دیر تک یہی باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان پر غشی طاری ہوگئی۔

آپی دو ہفتے ہاسپٹل میں رہیں پھر ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا "اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ انہیں گھر لے جائیں اور ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کریں۔" بڑے ڈاکٹر نے دولہا بھائی سے کہا "ہم اب ان کے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے۔"

یوں آپی ہاسپٹل سے اپنے گھر چلی گئیں۔ وہاں بھی انہیں سب سے زیادہ مونا کے وعدے کی فکر رہی۔ تیسرے دن ان کی حالت بہت بگڑ گئی۔ اس وقت ابو بھی موجود تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ آپی کا وقت آخر ہے۔ ابو نے رقت آمیز لہجے میں آپی سے کہا۔ "معاف کرسکو تو مجھے معاف کردینا بیٹی۔ میں ہی تمہاری تباہی کا ذمے دار ہوں۔"

آپی کے چہرے پر درگزر کی روشنی پھیل گئی "ایسی بات کرکے ہمیں گناہ گار نہ کریں ابو۔ اب ہم سمجھ گئے کہ یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ سب کچھ ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔ آپ تو ہمیں دکھوں سے بچانے اور خوشیاں دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ہمارے نصیب میں تھیں ہی نہیں۔"

ابو کو اس روز پہلی بار روتے دیکھا گیا۔ آپی نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لئے "نہ روئیں ابو۔ ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔" انہوں نے دردناک لہجے میں کہا "اور ابو' ہمیں معاف کردیجئے گا۔ ہماری تمام کوتاہیوں کو' ہمارے ہر اس رویئے کو جس سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو۔"

"شہلا' اولاد کو ماں باپ سے معافی مانگنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔" ابو نے بمشکل کہا۔

آخری لمحوں میں میمونہ آپی کے ساتھ تھی "ہم نے اپنی اذیت کے ہر لمحے
تمہارے لئے خوشیوں کی دعا کی ہے مونا۔" آپی نے کہا "کہتے ہیں کہ مرتے ہوئے
آدمی کی دعا فوراً" قبول ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم نے اپنے بارے میں نہیں
سوچا۔ صرف تمہیں یاد رکھا ہے ان لمحوں میں اور ہماری دعائیں قبول بھی ہوئی ہیں۔
دیر تو ہوسکتی ہے 'اندھیر نہیں۔"

پھر آپی پر غفلت طاری ہوئی اور اس روز کے سورج کے ساتھ ان کی زندگی کا
سورج بھی غروب ہوگیا۔

یہ بڑی بے رحم حقیقت ہے کہ کسی کے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زندگی
کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں بھی زندگی کا سفر جاری رہا لیکن پتا چلتا تھا کہ ایک کمی
واقع ہوگئی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ آپی کی موت نے سب سے زیادہ ابو کو متاثر کیا
تھا۔ وہ کم سخن اور کم آمیز تھے لیکن اب بالکل ہی چپ ہوکر رہ گئے تھے اور جیسے سمٹ
کر ایک خول میں بند ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بہت سخت مزاج ہوگئے تھے۔

کبھی امی ابو کو دلاسا دیتیں تو وہ جھنجلا کر کہتے "تم کیا' کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں
شہلا سے کتنی محبت کرتا تھا۔ شہلا کو بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید باپ کو پہلی اولاد سے
ایسی ہی محبت ہوتی ہے اور شاید باپ کی محبت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے اظہار
کا سلیقہ نہیں تھا نا.... اسی لئے۔"

میمونہ نے آپی کی موت کے بعد خود کو اس کمرے میں جیسے قید کرلیا تھا' جو آپی
کا تھا اور جسے اس نے کچھ ہی دن پہلے اپنایا تھا۔ شاید وہ خود کو بوجھ اٹھانے کے لئے
تیار کر رہی تھی۔ عرصے تک ایسا ہوتا رہا کہ وہ چابیوں کا گچھا لے کر آپی کی الماری
کے پاس جاکھڑی ہوتی۔ وہ الماری کھولنے کا ارادہ کرتی لیکن پھر اس کی ہمت جواب
دے جاتی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی کی زندگی کے بے
حد ذاتی نہاں خانے میں داخل ہو رہی ہے۔ جبکہ اسے یہ حق حاصل نہیں۔ وہ لاکھ خود
کو یاد دلاتی کہ یہ سب کچھ خود آپی نے ہی اسے سونپا ہے۔ لیکن یہ دلیل بھی اسے
ہمت نہ دے پاتی۔ اکثر وہ سوچتی کہ آپی نے ایسا کیوں کیا؟ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ اس
کی سمجھ میں ایک ہی بات آتی۔ آپی اس سے اور سرمد بھائی سے ایک جیسی محبت کرتی



تھیں۔ سرمد بھائی اکیلے اور دکھی ہوکر پوری زندگی گزار دیں' یہ انہیں گوارا نہیں تھا
اور وہ کسی غیر کے ہو جائیں' یہ مرنے کے بعد بھی وہ برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ وہ
بس کے ساتھ انہیں شیئر کرسکتی تھیں' اسے ان کے جملہ حقوق سونپ گئی تھیں' یوں
جیسے وہ جیتا جاگتا آزاد اور خود مختار انسان نہیں' کوئی کتاب ہو۔

ایک اور بات ..... آپی کو یقین تھا کہ وہ کبھی کسی سے شادی نہیں کریں گے۔
ان کے حصے کی محبت کسی کو نہیں دیں گے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سے محبت
کریں۔ شادی کریں اس سے لیکن آپی نے کتنے یقین سے کہا تھا۔ تم اس کی فکر نہ
کرو۔ ہم انہیں سمجھا دیں گے۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔

اور پھر یہ سوچ کر بھی میمونہ کی نسوانی انا کو ٹھیس پہنچتی تھی کہ اسے نامعلوم
عرصے تک .... بلکہ شاید عمر بھر ایک ایسے شخص کا انتظار کرنا ہے' جو کسی اور کے کہنے
پر اس سے محبت کرے گا۔ یعنی درحقیقت اس شخص کے دل میں اس کی محبت نہیں
ہوگی بلکہ وہ کسی کے اصرار کی وجہ سے پیدا ہوگی۔ اس انداز میں تو عورت کو اپنے
پسندیدہ ترین اور محبوب ترین مرد کی محبت بھی قبول نہیں ہوتی لیکن وہ کیا کرتی۔ آپی
اس کے پیروں میں عجیب زنجیر ڈال گئی تھیں۔

ایک دن اس نے بڑی ہمت کرکے آپی کی الماری کھول ہی لی۔ اس نے الماری
کا جائزہ ہرگز نہیں لیا۔ بس سمیٹ کر چیزوں کو ذرا قرینے سے رکھ دیا۔ یوں اتنی جگہ
نکل آئی کہ اس کی اپنی چیزیں بھی الماری میں سما گئیں۔

آپی کی موت کو ایک سال گزر گیا۔ اب اس میں ایک تبدیلی آئی۔ الماری میں
رکھا ہوا آپی کا ترکہ اسے اشارے کرکے بلانے لگا۔ تاہم وہ اب بھی جھجکتی تھی پھر
ایک دن وہ کچھ ہوا' جس نے اس کے ذہن کی تمام گرہیں کھول دیں۔ ہر الجھن سلجھا
دی۔

اس روز اس نے وہ کاغذ نکالا' جس پر آپی کے ہونٹوں کا وہ نقش تھا' جسے وہ
تیرہ برسوں سے چومتی آئی تھی۔ لپ اسٹک سے ابھرا ہوا ہونٹوں کا وہ 'نقش' جو وہ سرمد
بھائی کے پاس سے چرا لائی تھی۔ اس لئے کہ سرمد بھائی کے پاس تو ایسے بہت سارے
نقش تھے۔

اس نے بڑی محبت سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے والی محبوب بہن کے ہو
کے نقش پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے مگر وہاں ہونٹ رکھے رکھے اچانک اسے ایک خیال آیا کہ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور دل سینے میں دھڑ دھڑانے لگا۔ یونہی نظریں اٹھ
اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا اور حیران رہ گئی۔ بند کمرے میں دوپہر
وقت اس کے چہرے پر ویسی ہی چاندنی اتر آئی تھی جیسی آپی کے چہرے پر اترتی تھ
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی کا رنگ گلابی ہوگیا۔ اس لمحے وہ خود کو ایسی حسین لگ
پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔

پھر اچانک وہ فرط حیا سے وہری ہوگئی۔ اس نے نقش پر سے ہونٹ ہٹائے ا
اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا!

بات صرف اتنی سی تھی کہ اس نقش کو چومتے ہوئے اس لمحے اچانک اس
ذہن میں ایک سوال' ایک خیال نے سر ابھارا تھا۔ یہ کاغذ .... اور ایسے دوسرے
سے کاغذ سرمد بھائی نے کیوں سنبھال کر رکھے تھے؟ کیا کرتے تھے وہ ان کا؟

اس سوال کا جواب اس کے شعور تک پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ لجا کر رہ گ
اسے خود سے بھی حیا آنے لگی۔

پھر جواب بھی شعور تک پہنچ گیا۔ سرمد بھائی بھی وہی کچھ کرتے تھے' جو وہ
برس سے کرتی آرہی تھی۔ انہوں نے بھی سینکڑوں بار اس نقش کو چوما ہوگا۔

اس نے بڑی مشکل سے نظریں اٹھا کر کاغذ پر لپ اسٹک کے ابھارے ہو
اس نقش کو دیکھا۔ آپی کے ہونٹوں کا دہکتا ہوا سرخ لمس پوری طرح نمایاں تھا مگر ا
مرئی نقش کے اوپر سینکڑوں غیر نمایاں اور بے رنگ لمس سرمد بھائی کے ہونٹوں
تھے' جنہیں دیکھا تو نہیں جاسکتا تھا مگر اب وہ انہیں محسوس کرسکتی تھی۔

تو وہ اب تک جو آپی کے ہونٹوں کو چومتی رہی تھی' درحقیقت ہر بار اس
ہونٹ سرمد بھائی کے ہونٹوں کے چھوڑے ہوئے غیر مرئی لمس سے متصل ہوتے ر
تھے!

وہ آگہی کا لمحہ تھا!

اس احساس کے بعد اس کے اندر کراہت' بلکہ ناپسندیدگی بھی نہیں ابھ



بلکہ خود سپردگی ابھری تھی۔ اس لمحے اس نے پوری طرح سمجھ لیا کہ وہ سرمد سے محبت کرتی ہے ورنہ اس سے پہلے وہ محبت ایک سال پہلے محرومی اور حسرتوں کی چادر اوڑھ کر موت کی آغوش میں اترنے والی بہن کا ترکہ تھا۔ وہ محبت تو بس آپی نے اسے سونپی تھی۔ تاکید کے ساتھ ... وصیت کرکے! ہاں یہ ضرور تھا کہ سرمد اس کے لئے نہایت پسندیدہ تھا۔ لہٰذا اس نے مرنے والی عزیز بہن کی تاکید کو حرز جاں بنا لیا تھا۔

مگر آگہی کے اسی لمحے میں اس نے جان لیا کہ یہ محبت تو بچپن ہی سے اس کے اندر موجود تھی بلکہ ممکن ہے' وہ قدرت نے اس کے وجود کے ساتھ ہی ودیعت کی تھی۔ یہ وہ محبت تھی جو اس کے لاشعور میں پیدا ہوئی تھی اور برسوں وہیں چھپ کر پلی بڑھی تھی اور اب شعور میں آئی تو پوری طرح جوان اور طاقت ور تھی۔

اس لمحے اسے آپی کی وہ باتیں یاد آئیں جو انہوں نے اسی کمرے میں آخری بار کہی تھیں۔ اس کے بعد وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھیں۔ آپی نے کہا تھا۔ بہت سی چیزیں' بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں کہ ان کا عقدہ کھلنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ ہم سے پوچھو تو اس وقت یہ بوجھ قبول کرکے تم ہم پر احسان کر رہی ہو لیکن آنے والے وقت میں کبھی نہ کبھی تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تم پر احساس کیا تھا اور یہ باتیں دونوں ہی سچی ہوں گی۔

اور اب اس نے جان لیا تھا۔ دونوں باتیں سچی نہیں تھیں۔ سچ بس یہ تھا کہ آپی نے احسان کیا تھا..... بہت بڑا احسان۔ وہ جاتے جاتے اس کی جھولی میں ایک نعمت عظمیٰ ڈال گئی تھیں۔ اب وہ اس احسان کی اہمیت سمجھ سکتی تھی۔ یہ اس احسان ہی کا ثمر تھا کہ سرمد بھائی کی محبت کا ادراک ہونے کے بعد وہ شرم سار نہیں ہوئی۔ اس کے وجود میں خود اپنے لئے ملامت نہیں ابھری۔ اس نے حقیقت سے نظریں نہیں چرائیں۔ اس نے اس محبت کا روپ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس لئے کہ یہ محبت کی تو آپی اسے تاکید کرکے گئی تھیں۔ اس محبت کو وہ اس کے لئے جائز بلکہ ناگزیر بنا گئی تھیں۔

یہ آپی کا احسان تھا کہ وہ اپنی محبت پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔ آپی کی ایک

بات سمجھ میں آگئی لیکن دوسری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سوچتی اور الجھتی کہ سرمد بھائی کا ذہن کیسے تبدیل ہوگا۔ وہ اس سے محبت کیسے کرسکیں گے؟ اس کا جواب خود کار انداز میں اس کے اندر ابھرتا تھا۔ جیسے وہ ان سے محبت کر رہی ہے' ویسے ہی وہ بھی اس سے محبت کریں گے۔ لیکن یہ بے دلیل جواب تھا۔ ہاں' اس کے پاس ایک دلیل تھی۔ وہ سوچتی' میری محبت میں طاقت ہے تو وہ ان کے دل میں جگہ بنالے گی۔

تو اس روز یہ ہوا کہ اس نے آپی کی الماری کو اپنا لیا۔ اس روز اس نے الماری کی ہر چیز کا جائزہ لیا۔ الماری میں آپی کے وہ تمام لباس تھے' جو وہ شادی کے بعد اپنے ساتھ نہیں لے کر گئی تھیں۔ یہ تو جائزہ لینے پر پتا چلا کہ الماری میں آپی کے صرف وہی کپڑے تھے' جن کے ساتھ سرمد بھائی کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی۔ آپی نے ہر کپڑے کے ساتھ ایک ٹیگ لگا دیا تھا۔ سفید کام دار کرتہ تھا۔ اس سے منسلک پرچے پر آپی نے لکھا تھا..... جب انہوں نے پہلی بار ہمیں دیکھا۔ ایک بہت نازک سا بسنتی سوٹ تھا' اس کے متعلق لکھا تھا۔ جب ہم نے ان کے ساتھ پہلی بار دھنک دیکھی۔

پھر الماری میں سرمد بھائی کے بھی کچھ کپڑے تھے۔ رومال تو بے شمار تھے۔ ایک قلم تھا' جس سے انہوں نے پہلی بار لکھا تھا۔ شہلا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی تحریر بھی موجود تھی۔ سرمد بھائی کی کچھ کہانیوں کے مسودے تھے' کچھ نظمیں بھی تھیں۔ وہ سب آپی کے لئے تھیں۔

میمونہ کو حیرت ہوئی کہ اسے ان چیزوں سے رقابت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ اب وہی تو شہلا تھی۔ یہ بھی آپی کا احسان تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کس کے سینے میں اتنا بڑا دل ہوتا ہے کہ اپنی پوری کائنات اپنے وجود سمیت سمیٹ کر کسی اور کی جھولی میں ڈال دے۔ خواہ وہ سگی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ مجھ میں اتنا ظرف نہیں۔ اس نے سوچا۔

پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے الماری کا سیف کھولا۔ سیف میں آپی کی ڈائریاں تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ڈائری لکھتی تھیں۔ یہ انہوں نے اس وقت موقوف کیا' جس دن وہ مایوں بیٹھیں۔ ڈائریوں کی تعداد



نی۔ میمونہ نے انہیں ایک طرف رکھ دیا۔ وہ فرصت سے پڑھنے کی چیز تھیں۔

سیف میں سے دو لفافے بھی نکلے۔ دونوں پر میمونہ کا نام تھا۔ ایک کھلا ہوا اور پتلا تھا۔ دوسرا سربند اور پھولا ہوا۔ میمونہ نے پہلے بڑے لفافے کو کھولا۔ اس میں ایک اور لفافہ تھا' جس پر ' سرمد کے لئے ' لکھا تھا۔ دوسرے لفافے کے ساتھ ایک رقعہ تھا۔ میمونہ کے نام۔ لکھا تھا۔ پیاری مونا' سرمد جب بھی آئیں' یہ لفافہ انہیں دے دینا۔ تمہاری آپی۔

میمونہ نے کھلے ہوئے لفافے میں سے کاغذ نکالا۔ اس پر ایک نظم لکھی تھی۔ نظم پڑھ کر اسے وہ خواب یاد آگیا' جو اس نے اور آپی نے شاید ایک ہی وقت میں دیکھا تھا۔ نظم کا عنوان تھا۔ "نصیحت۔"

تتلی کے پیچھے بھاگنے والے بچے سن۔
زیادہ دور تلک مت جانا۔
بعض تتلیاں دھوکا ہوتی ہیں۔
اور ان کے پیچھے پیچھے جانے والے
کبھی کبھی کھو بھی جاتے ہیں۔
اور برسوں کے بعد اچانک تتلی اوجھل ہو جاتی ہے۔
تب وہ کسی متروک' گھنے' کانٹوں سے بھرے کالے جنگل میں خود کو اکیلا پاتے ہیں۔

ہوتے ہیں کانٹے پیوست ان کے ہاتھوں میں
ان کے پیروں کے تلووں سے چسپاں ہوکر رہ جاتے ہیں۔
خون کے سرخ دہکتے پھول۔ مہک سے عاری پھول' جن کو چھالے کہتے ہیں۔
پھر جنگل میں رات اندھیری پڑجاتی ہے (کبھی نہ ڈھلنے والی رات)
تب ڈھونڈے رستہ نہیں ملتا۔
ان کی آنکھوں کو رنگوں کے بجائے ویرانی کے خواب میسر آتے ہیں۔
تتلی کے پیچھے بھاگنے والے بچے' سن!
تو نے کبھی کھوئی کھوئی آنکھیں دیکھی ہیں ؟

نظم پڑھ کر وہ دیر تک روتی رہی۔

ایک برس اور گزر گیا۔ آپی کی ڈائریاں وہ باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی۔ ڈائری کیا' وہ آپی کا طرز زندگی تھا۔ ان کی پوری شخصیت' ان کی سوچ' ان کی فکر' سب کچھ ان ڈائریوں میں موجود تھا۔ میمونہ کبھی نہیں سمجھ سکی کہ ڈائریاں اس پر کچھ اثرات مرتب کر رہی ہیں۔

زندگی اس روانی کے ساتھ نہ سہی' بہرحال بہنے لگی تھی۔ لیکن آپی کی موت ابو کو ایسا نڈھال کر گئی تھی کہ وہ زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ان میں جینے کی امنگ نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے فرائض سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کی فکر میں تھے۔ وہ ریٹائر بھی ہوگئے تھے۔ زندگی کی بے ثباتی اور بے یقینی کا انہیں اس قدر احساس تھا کہ انہوں نے اپنے ایک دوست سے خود میمونہ کے رشتے کی بات کرلی۔ پھر انہوں نے امی کو مطلع کیا کہ وہ لوگ کسی بھی دن رشتے کے سلسلے میں آجائیں گے۔

"اتنی جلدی کیوں کی آپ نے؟" امی نے شکایتاً کہا۔ "میمونہ سے تو پوچھ لیتے اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"بات یہ ہے صفیرہ بیگم کہ اپنی زندگی کا اب بھروسا نہیں۔ میں چاہتا ہوں..."

"ایسی باتیں نہ کریں" امی نے گھبرا کے کہا۔

"اور پھر کاشف بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہر طرح سے دیکھا بھالا ہے۔ میں چاہتا ہوں' مرنے سے پہلے ہلکا ہو جاؤں" انہوں نے سرد آہ بھری "اور میں نہیں سمجھتا کہ میمونہ کی کہیں دلچسپی ہے۔"

"میں میمونہ سے بات کروں گی۔"

امی نے میمونہ سے بات کی تو وہ بپھر گئی "ایک بیٹی کھو کر سبق نہیں ملا ابو کو" وہ غرائی "ابھی بیٹھے آپی کے پچھتاوے کو رو رہے ہیں اور میرے ساتھ بھی وہی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کیسے بدتمیزی سے بات کر رہی ہو" امی نے اسے ڈانٹا "وہ باپ ہیں اور تم لوگوں کی بہتری کا سوچتے ہیں۔"

"بس ایک بہتری کافی ہے' جو وہ کر چکے۔"



"میمونہ ....."

"آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم امی۔ اور سب کچھ میں بتا بھی نہیں سکتی" میمونہ نے سرد لہجے میں کہا "ابو نے سرمد بھائی کی قدر نہ کی۔ سرمد بھائی کو آپ کی' اس گھر کی عزت کا اتنا خیال تھا کہ انہوں نے اس کے لئے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی قربان کردی۔ ورنہ آپی میں اتنا حوصلہ تھا کہ ابو کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتیں۔ سرمد بھائی نے انہیں روکا تھا سختی سے۔ انہوں نے ہی سمجھایا تھا آپی کو اور مجھے یاد ہے' آپی نے جھنجلا کر انہیں بزدل بھی کہا تھا۔ میرے معاملے میں یہ یاد رکھیں امی کہ مجھے روکنے اور سمجھانے والا کوئی نہیں ہے۔"

میمونہ اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ دروازے کے سامنے ایک سایہ سرجھکائے ہوئے گزرا ہے۔ وہ ابو تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" امی نے پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ابو کو سمجھائیں ورنہ نتائج کے ذمے دار وہ خود ہوں گے۔"

امی ابو کے پاس گئیں .... اور ان کا پیغام لے آئیں۔ ابو نے کہا تھا۔ اس سے کہنا کہ اسے پورا حق ہے کہ رشتے کے لئے آنے والوں کے سامنے انکار کرکے مجھے ذلیل کرے۔ میں اسی سلوک کا مستحق ہوں۔ سمجھ لوں گا کہ شہلا والی لفظی کا کفارہ ہے یہ۔ امی نے یہ پیغام سنانے کے بعد کہا "میمونہ' اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے ابو کو خدانخواستہ کچھ ہو جائے گا۔"

چنانچہ میمونہ نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ وہ براہ راست کاشف سے ملی "آپ کو اس رشتے سے انکار کرنا ہے" اس نے دھڑلے سے کہا۔

کاشف اس کا منہ دیکھتا رہ گیا مگر تیز و طرار تھا' سنبھل کر بولا۔ "میں کیوں انکار کروں۔ مجھے تو تم بہت اچھی لگتی ہو۔"

"مگر مجھے تو آپ برے لگتے ہیں۔"

"پھر بھی گزارہ تو ہو ہی جائے گا۔"

"نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ بات بنے گی ہی نہیں۔"

"وہ کیسے ؟ انکار کا تو حوصلہ تم میں ہے نہیں۔ مجھ سے مدد مانگنے آئی ہو کاشف نے مضحکہ اڑایا۔

"میرے حوصلے کا تو آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"تو خود انکار کر دو۔"

"مجھے ڈر ہے کہ میرے انکار سے ابو کو کچھ ہو نہ جائے۔ پلیز' آپ میری مدد کریں۔"

کاشف چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے۔ لیکن میمونہ' مجھے اس انکار کا عمر بھر ملال رہے گا۔"

ادھر ابو منتظر تھے کہ شفاعت صاحب رشتہ مانگنے آئیں گے۔ خاصے دن گزر گئے تو انہوں نے فون پر ان سے رابطہ کیا۔ امی اس وقت ان کے پاس ہی بیٹھی تھیں "کیا ہوا بھئی شفاعت' ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ آئے نہیں" رابطہ ملنے پر ابو نے کہا۔

"کیا کہوں امجد بھائی' آج کل کی اولاد....."

"کیوں' کاشف تیار نہیں ؟" ابو نے تشویش سے پوچھا۔

"انکار تو نہیں کیا ہے اس نے" دوسری طرف سے شفاعت صاحب نے کہا۔

"تو پھر؟"

"بس بھائی' شرم کی بات ہے۔ کیسے زبان کھولوں ؟"

"یہ نہ بھولو کہ ہم گہرے دوست ہیں۔"

"اسی وجہ سے تو اور شرم آرہی ہے دوست۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے مگر بدبخت کار اور بنگلے کی شرط لگا رہا ہے۔ کسی صورت نہیں مانتا۔ یار امجد میں تو تمہارے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

یہ سن کر ابو اتنا ہنسے' اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کیا ہوا امجد ؟ خیریت تو ہے ؟" دوسری طرف سے شفاعت صاحب نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔



"کچھ نہیں۔ تقدیر کی ستم ظریفی پر خوش ہو رہا ہوں" ابو نے بمشکل ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا "میں خوش ہوں کہ مجھے دنیا میں سزا مل گئی۔ مگر یار' اس بات کو دل پر مت لینا۔ میں تم جیسے اچھے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔ اچھا' پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ "ابو نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا ؟" امی نے پریشانی سے پوچھا۔

"مکافات عمل" ابو نے بے حد خوش ہو کر کہا "صاحب زادے نے جہیز میں کار اور بنگلے کی شرط لگائی ہے۔"

"تو پھر؟"

"میں اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ خدا کا شکر کہ مجھے سزا اپنی بیٹی کے ہاتھ سے نہیں ملی۔ دوست کے بیٹے سے ملی۔ چلو آج کچھ بوجھ تو ہلکا ہوا۔"

اس واقعے کے تین ماہ بعد امی چپکے سے چل بسیں۔ ابو جو پہلے ہی صدمے سے نڈھال تھے' اس بار بستر سے لگ گئے۔ وہ خوف زدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امی کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلے رہ گئے ہیں۔ بچوں سے انہوں نے کبھی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ پھر ان کے یک طرفہ فیصلوں نے بچوں کو اور دور کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بچے انہیں پوچھیں گے بھی نہیں۔ بس انہیں انا بوا سے کچھ امید تھی۔ چنانچہ میمونہ اور ارشد نے بڑی محبت سے ان کی نگہداشت کی تو انہیں حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ ارشد تو خیر تعلیم کے سلسلے میں بہت مصروف تھا۔ اس کا یہ ایم بی بی ایس کا چوتھا سال تھا لیکن میمونہ گریجویشن کرکے فارغ ہوچکی تھی۔ اس نے ابو کو خوب وقت دیا۔ خوب خدمت کی ان کی۔ وہ ان کا یوں خیال رکھتی' جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔

ابو کو کوئی بیماری نہیں تھی مگر وہ ڈھیر ہوچکے تھے۔ میمونہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ابو کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ بس اپنے ہی لگائے ہوئے روگ تھے' جو انہیں ستا رہے تھے۔ ایک دن انہوں نے میمونہ سے کہا "تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو بیٹا ؟"

"یہ کیا بات ہوئی۔ آپ ابو ہیں' اس لئے۔ ہم تو خوش نصیب ہیں کہ ہمیں

آپ کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ وہ اولاد بدنصیب ہوتی ہے' جسے یہ موقع نہیں ملتا۔"

"مگر میں نے کبھی تم لوگوں کو وقت نہیں دیا۔ تمہیں قریب آنے کا موقع تک نہیں دیا۔ تم سے تمہارے مسائل نہیں پوچھے۔ نہ کبھی ڈانٹا' نہ پیار کیا' نہ گلے لگایا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے باوجود آپ نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ آپ نے ہمارے لئے محنت کی' ہمیں آسائشیں فراہم کیں' تعلیم دلائی' ہمیشہ ہماری بہتری سوچی۔"

"بہتری کیا سوچی' بس گمان کیا" ابو کے لہجے میں حقارت تھی۔ "جو سوچا' اس کا الٹ ہوا۔"

"اب یہ تو نصیب کی بات ہے۔"

"نہیں گڑیا بیٹی۔ میں جان گیا ہوں۔ مجھ میں کہیں خرابی تھی۔"

"خیر' اب پچھتاوے نہ پالیں۔ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔"

لیکن نہ تو پچھتاوے ابو کا پیچھا چھوڑتے تھے' نہ ہی ابو ان سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہ پچھتاوے ہی ان کا روگ تھے اور یہی بیماری۔

ایک دن ابو نے بڑے تاسف سے کہا "پوری عمر رائگاں کر دی میں نے۔"

"ایسی باتیں نہ کریں ابو" میمونہ نے انہیں ٹوکا۔

"نہیں .... یہ سچ ہے" ابو نے آہ بھر کے کہا "میں ساری عمر ایک خول میں بند ہو کر جیا۔ یوں سب سے زیادہ نقصان خود مجھے ہی پہنچا۔ بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی میں نے پوری عمر تنہائی میں گزاری۔ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر قہقہے بھی نہیں لگائے۔ ادھر ادھر کی باتیں نہیں کیں۔ اپنے بچوں میں کبھی نہیں گھلا ملا۔ ان کا گھوڑا کبھی نہیں بنا۔ ان کے معصوم سوال کبھی نہیں سنے اور ان سوالوں کے جواب کی جستجو میں کبھی پریشان نہیں ہوا۔ میں نے خود کو ایک بادشاہ سمجھا' جسے بس اپنی رعایا کی ضروریات پوری کرنی تھیں۔ عمر بھر میں بس ایک تخت پر بیٹھا رہا۔ رعایا کو کبھی قریب نہیں آنے دیا۔ میری پوری زندگی پہلے ایک مکان بنانے کی جدوجہد میں گزری پھر اس



مکان کے کمرے اور دفتر کے کمرے میں گزر گئی۔ میں کبھی آنگن میں جا کر نہیں بیٹھا۔"

"کبھی دل بھی نہیں چاہا؟" میمونہ نے پوچھا۔

"بہت چاہتا تھا۔ مگر میں یہ سوچ کر رک جاتا تھا کہ بچے ڈسٹرب ہوں گے .... اور پھر میرا وقار بھی کم ہو جائے گا" ابو نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "ابا جان سے یہی سب کچھ سیکھا تھا میں نے اور ابا جان بننے کی ہی کوشش کی تھی میں نے۔ اب سوچتا ہوں' ابا جان کتنی محرومیوں کا احساس لے کر گئے ہوں گے دنیا سے۔"

تو یہ بات ہے۔ میمونہ نے متاسف ہو کر سوچا۔ اسے ابو پر ترس آنے لگا۔

"میں نے فرض کو بھاری بوجھ بنا کر رکھا" ابو کہتے رہے "کبھی خواہ مخواہ ہنسنے اور مسکرانے کو جی چاہتا تو میں خود کو ڈانٹ دیتا .... ہوش کے ناخن لو' امجد حسین۔ اپنی عمر دیکھو' اپنی ذمے داریوں کا خیال کرو۔ تم ڈسپلن خراب کرو گے تو گھر میں ڈسپلن کیسے رہے گا۔ تمہیں مثال قائم کرنی ہے۔ سو میں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیتا۔ اپنے قہقہوں کو اندر ہی گھونٹ لیتا۔ اب سوچتا ہوں کہ میں کتنا محروم آدمی ہوں۔ کتنی آسانی سے ملنے والی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں' جو بانہیں پھیلائے کھڑی تھیں مگر میں نے انہیں نہیں اپنایا۔ اب اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ چھوٹی اور بظاہر غیر اہم خوشیاں وجود کو کیسے بھر دیتی ہوں گی۔ مجھے تو اپنا آپ خالی خالی لگتا ہے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے ابو" میمونہ نے انہیں تسلی دی "جو کچھ آپ نے پہلے نہیں کیا اب کر سکتے ہیں۔ آپ بھر جائیں گے۔ خوش ہو جائیں گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ گیا وقت کبھی لوٹ کر آتا ہے؟" ابو نے افسردگی سے کہا۔

"نہیں آتا۔ لیکن جو وقت میسر ہے' اس سے تو استفادہ کیا جا سکتا ہے۔"

"میرا تو وقت پورا ہو چکا ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کریں۔ آنگن میں چلیں گے؟"

"چلیں ...."

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ شام کو ارشد اور میمونہ ابو کو آنگن میں لے جاتے۔ رات تک وہ وہیں بیٹھتے۔ اس کا ایک فائدہ ہوا۔ ابو میں خوش امیدی پیدا

ہونے لگی۔ وہ خوابوں کی باتیں کرنے لگے۔ وہ ارشد سے کہتے "میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ یا امریکا جاؤ۔"

"ابو ..... ڈاکٹر تو میں یہیں بن جاؤں گا" ارشد ہنس کر کہتا۔

"نہیں۔ میری خواہش ضرور پوری کرنا۔"

اب ابو کبھی اپنا وقت پورا ہونے کے بات کرتے تو میمونہ انہیں ٹوک دیتی "نہیں ابو، خواب زندگی کی علامت ہیں۔ اب تو آپ خواب دیکھنے لگے ہیں۔"

اس دن ابو نے بڑی محبت سے کہا "میں عجب بدنصیب تھا کہ اپنی خوش نصیبی سے بھی بے خبر رہا۔ اللہ نے مجھے اتنی محبت کرنے والی، اتنی اچھی اولاد دی تھی۔ میں نے قدر نہیں کی، کبھی شکر بھی ادا نہیں کیا۔ تم لوگ مجھے معاف کر دینا۔"

"کیسی بات کرتے ہیں ابو" ارشد اور میمونہ نے بیک وقت احتجاج کیا۔

پھر ایک دن ابو نے ہچکچاتے ہوئے میمونہ سے کہا "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں" اس وقت ابو کے ساتھ صرف میمونہ تھی۔

"کہئے ابو۔"

"بیٹی ..... شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ہر وقت دعا کرتا ہوں تمہارے لئے۔"

میمونہ کو ان پر بڑی شدت سے پیار بھی آیا اور ترس بھی۔ بے چارے ابو! ساری زندگی محبت کرتے رہے لیکن اظہار محبت ان سے کبھی نہیں کیا گیا۔ الٹا وہ محبت چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ "اس میں یقین نہ آنے کی کون سی بات ہے ابو۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں" وہ بولی۔

ابو نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں میں بے یقینی تھی "کیسے؟" انہوں نے پوچھا۔

"محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی ابو۔ وہ تو خوشبو ہوتی ہے، جسے کوئی اظہار سے روک نہیں سکتا۔"

بعد میں پتا چلا کہ ابو نے اکیلے میں یہی بات ارشد سے بھی کی تھی۔

پھر ایک دن ابو نے بڑی افسردگی سے کہا "لگتا ہے، میری خواہش پوری نہیں



ہو سکے گی۔ تم میرے سامنے باہر نہیں جاسکو گے ارشد۔"

"لیکن ابو، باہر جانے میں بہت پیسہ لگتا ہے" ارشد نے بات کا رخ بدلا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔"

"آپ اس مسئلے کو کیسے حل کریں گے؟" میمونہ نے پوچھا۔

ابو چند لمحے سوچتے رہے پھر مسکرائے "ہم یہ مکان بیچ دیں گے۔"

"ہرگز نہیں" ارشد بولا۔ "یہ مکان آپ نے ہمارے لئے اتنی محبت سے بنایا ہے۔ یہ نہیں بک سکتا۔"

"تم چپ رہو بھائی" میمونہ نے سخت لہجے میں کہا "ابو کا خواب اور اس کی تعبیر سب سے اہم ہے۔"

"میری بات سنو۔ اب میں سمجھ گیا ہوں" ابو نے کہا "میں نے ہمیشہ مکان کو اہمیت دی، حماقت کی۔ اب سمجھا ہوں کہ مکان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت ہے تو گھر کی ہے اور گھر محض چار دیواری نہیں ہوتا۔ وہ مکینوں کی باہمی محبت اور خوشیوں سے بنتا ہے۔ کرائے کا مکان بھی گھر ہو سکتا ہے اور اپنا مکان بھی محض مکان رہ جاتا ہے۔ یہ تو رہنے والوں کے رویوں پر منحصر ہے کہ وہ اسے گھر کرتے ہیں یا نہیں" وہ کہتے کہتے رکے اور مستحکم لہجے میں بولے "میں اپنے خواب کی تعبیر کے لئے اس مکان کو بیچ سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں کرائے کے مکان کو گھر بنا کر اس میں خوش رہوں گا۔"

میمونہ انہیں حیرت سے دیکھتی رہی۔ کتنے بدل گئے تھے وہ۔ کاش ..... کاش ..... وقت ضائع نہ ہوا ہوتا۔

ایک دن ابو نے کہا "مجھے حیرت ہے کہ میں اتنا خوش ہوں۔ میں نے پہلی بار سمجھا ہے کہ خوشی کیا ہوتی ہے۔"

"تو حیرت کیوں ہے آپ کو؟" ارشد نے پوچھا۔

"خوشی مجھے اس وقت ملی ہے، جب ہاتھ پیر جواب دے رہے ہیں۔ جسم مٹی کا ڈھیر ہوا جا رہا ہے۔ جب میں توانائیوں سے بھرا ہوا تھا، اس وقت مجھے خوشی کا احساس کیوں نہیں ہوا؟" پھر انہوں نے خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دیا "شاید اس لئے

که چلتے ہاتھ پیروں کے گھمنڈ نے ہی مجھے خوشیوں سے دور کیا تھا اور شاید خدا دکھانا چاہتا ہے کہ خوشی بھی رزق کی طرح اسی کی دین ہے اور وہ مٹی کے ڈھیر کو بھی خوشی دے سکتا ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ رکے اور انہوں نے ایک سرد آہ بھری "کچھ بھی ہو، میں بہت خوش ہوں۔ بس ایک پچھتاوا ستاتا ہے۔ کاش صغیرہ اور شہلا کی موجودگی میں ایسا ہوگیا ہوتا۔"

ابو ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اب ان کے لئے بغیر سہارے کے اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ پھر ایک دن چپکے سے وہ چلے گئے۔

اس روز صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی۔ ابو کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھے رم جھم کا نظارہ کرتے رہے۔ شام کو وہ وہیں بیٹھے ارشد سے باتیں کر رہے تھے کہ میمونہ دوڑتی ہوئی آئی "ابو ...... ابو..... دیکھئے کتنی بڑی ساری دھنک نکلی ہے .... کتنی پیاری۔"

"بھئی آج تو ہمیں بھی دکھاؤ دھنک" ابو بولے "ہم نے تو کبھی دلچسپی نہیں لی ان چیزوں میں۔ مگر تم لوگ ہمیشہ بڑی خوشی سے بارش اور دھنک کی باتیں کرتے ہو۔ آج میں نے بارش کو بھی انجوائے کرلیا۔ دھنک بھی دکھا دو۔"

ارشد اور میمونہ انہیں وھیل چیئر پر بٹھا کر باہر آنگن میں لے آئے۔ ابو نے دھنک کو دیکھا اور بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔ "واہ بھئی، سبحان اللہ۔ لگتا ہے، سینے میں تمام رنگ اترے جا رہے ہیں۔ اپنا آپ رنگین ہوا جا رہا ہے۔ ارے .... کتنی محروم زندگی گزاری ہے میں نے۔"

وہ لوگ دھنک کو دیکھتے اور خوش ہوتے رہے۔

اچانک ابو نے کہا "کاش ...... کاش مجھے سرمد سے معافی مانگنے کا موقع مل جاتا۔ میں نے بہت زیادتی کی ہے اس کے ساتھ۔ بیٹی، ایک وعدہ کرو مجھ سے۔"

میمونہ نے دھنک سے نظر ہٹا کر استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا "جی ابو۔"

"سرمد واپس ضرور آئے گا۔ وہ آئے تو اس سے کہنا کہ میں اپنی غلطیوں پر دل سے پشیمان تھا۔ وہ مجھے معاف کر دے۔"

"ابو ...." میمونہ نے احتجاج کرنا چاہا۔



"بس تم وعدہ کرو مجھ سے۔"

میمونہ کا دل ڈوبنے لگا۔ آپی نے بھی اس سے ایک وعدہ لیا تھا۔ یہ وعدوں کا ھ بھی اس پر ہی آرہا تھا۔

ابو سر اٹھا کر دھنک کو دیکھنے لگے تھے۔ اچانک وہ بولے۔ "ارے .... یہ کیا۔ ک کے رنگ پھیکے ہوئے جا رہے ہیں۔ ارے۔ یہ غائب ہو رہی ہے۔"

میمونہ اور ارشد بھی دھنک کو دیکھنے لگے۔ میمونہ نے سر گھما کر ابو کو دیکھے بغیر ہتہ سے کہا "دھنک ایسے ہی تحلیل ہوتی ہے ابو۔ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔ جیسے بھی تھی ہی نہیں۔"

دھنک کو تحلیل ہوتے دیکھتے ہوئے میمونہ کی عجیب کیفیت ہو جاتی تھی۔ اسے یا لگتا تھا، جیسے کسی بہت خوب صورت خواب کے بعد آنکھ کھل گئی ہو۔ ویسا ہی بے ی کا احساس ہوتا تھا، جیسے خوب صورتی ہاتھ آکر نکل گئی ہو۔ اس کیفیت میں اس نے بو کی بڑبڑاہٹ سنی مگر اس پر دھیان نہیں دیا۔ وہ زیر لب کہہ رہے تھے۔ "ابھی ہے ۔ اور ابھی نہیں۔"

دھنک تحلیل ہونے کے بعد وہ ابو کی طرف مڑی اور بولی۔ "دیکھا ابو؟"

لیکن ابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ وھیل چیئر کی پشت گاہ سے سر ٹکائے مان کو تکے جا رہے تھے۔ اس کے کئی بار پکارنے پر بھی انہوں نے جواب نہیں دیا تو س نے انہیں ہلایا۔ ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ جا چکے تھے .... ابھی تھے اور بھی نہیں۔

ویران گھر کی ویرانی کچھ اور بڑھ گئی لیکن زندگی کا سفر جاری رہا۔ ارشد کی تعلیم مل ہوئی تو میمونہ نے اس کے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانے کا مسئلہ اٹھایا۔

"مگر کیسے؟ پیسہ کہاں رہا ہے ہمارے پاس؟" ارشد نے احتجاج کیا "اور پھر اس ضرورت بھی نہیں۔ مجھے ہاؤس جاب کرنی ہے۔ بے روزگار نہیں رہوں گا میں۔"

"ضرورت اس لئے ہے کہ یہ ابو کی سب سے بڑی خواہش تھی۔"

"لیکن وسائل۔"

"اس کا حل بھی ابو نے ہی بتایا تھا۔ مکان بیچ دو۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ کتنے بچھڑے ہوؤں کی نشانی ہے یہ گھر" ارشد خفا ہونے لگا "مجھے اس گھر سے بہت محبت ہے۔ میں اسے کیسے بیچ سکتا ہوں۔"

"تمہیں مجھ سے زیادہ محبت نہیں ہے اس گھر سے" میمونہ بولی۔ "لیکن ابو کی خواہش زیادہ اہم ہے اور نشانیوں کی بات بھی مت کرو۔ بچھڑنے والوں کی اصل نشانیاں میں اور تم ہیں۔ کسی جانے والے کے خواب کی تعبیر کے لئے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے" اس بات کو میمونہ سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ "اور ابو نے تو کبھی کوئی خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ وہ واحد خواب ہے' جس کی تعبیر کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ سمجھا جو ساری زندگی نہیں سمجھ سکے تھے۔"

خاصی بحث و تمحیص کے بعد ارشد مان گیا۔ مکان بکا لیکن ارشد نے اصرار کرکے میمونہ کو اس کا حصہ دیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکا چلا گیا۔ یوں میمونہ کو بھی اس کے ایک خواب کی تعبیر مل گئی۔ دھنک اکیڈمی۔ اس نے سرمد کے انتظار کو آسان کرنے کے لئے خود کو اسکول میں کھپا دیا مگر وہ انتظار بے حد طویل تھا اور وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کا کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں۔ سرمد آئے گا بھی یا نہیں۔

اور اب اختر نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کیسی کیسی اور کتنی زیادہ زنجیروں میں بندھی ہوئی ہے اور وہ اسے سمجھا نہیں سکتی تھی۔ جن کے رازوں کی وہ امین تھی' انہیں کیسے رسوا کرسکتی تھی اور رازوں کا افشاء رسوائی ہی تو تھی۔

"اے اللہ!" اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا۔ "میری مدد فرما۔ تو سب کچھ جانتا ہے۔"

عجیب بات ہوئی۔ یہ دعا کرکے اس کے دل کو سکون مل گیا!



امتحان کے دنوں میں اسے اپنا ہوش بھی نہیں رہا۔ امتحانوں کے بعد وہ نتائج کو ترتیب دینے میں مصروف ہوگئی۔ مہینہ یوں گزر گیا کہ پتا بھی نہیں چلا۔ نتائج کا اعلان



اور نئی کلاسوں کی پڑھائی شروع ہوگئی۔

ذرا فرصت ملی تو اسے اختر کے الٹی میٹم کا خیال آیا اور وہ ہراساں ہوگئی۔ اس میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ اختر نے جو کچھ کہا ہے' نہایت سنجیدگی سے کہا ہے رہ خدانخواستہ اس پر عمل بھی کرگزرے گا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس دن کے ے وہ اب تک ملنے بھی نہیں آیا تھا۔

میمونہ کی پریشانی اپنی جگہ درست تھی۔ یہ صورت حال بہت عجیب تھی۔ جو اختر چاہتا تھا' وہ اس کے لئے ناممکن تھا۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اختر کو کوئی نقصان پہنچے۔ اختر اسے بہت عزیز بھی تھا۔ دوسرے اس نے زندگی میں نقصانات کے وا دیکھا ہی کیا تھا۔

اب اسکول کی گرمیوں کی چھٹیوں کا عرصہ قریب آرہا تھا۔ چھٹیوں کے وہ دو ہینے اس کے لئے ہمیشہ سخت ہوتے تھے۔ وہ اسکول کی مصروفیت اور بچوں کی قربت ے محروم ہو جاتی تھی۔ کرنے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جن سوچوں سے وہ دس مہینے بچے کی کوشش کرتی رہتی تھی' وہ ان دو مہینوں میں اسے گھیر لیتی تھیں اور اس کے لئے کہیں اماں نہیں ہوتی تھی۔ زندگی کے تمام دکھ اور محرومیاں گویا خود کو دہراتے تھے۔ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ وہ بوجھل اور دکھی ہوکر رہ جاتی تھی۔ وہ اس کے لئے جسم و جاں پر مسلسل عذاب اترنے کے ساٹھ دن ہوتے تھے۔ وہ ایک ایک ان اور ہر دن کا ایک ایک پل گن کر کاٹتی۔ چھٹیاں ختم ہوتیں تو وہ سکون کا سانس لیتی۔

لیکن اس بار موسم گرما کی چھٹیوں کا تصور کرکے وہ یوں لرز رہی تھی' جیسے وہ آنے والے دن نہ ہوں' موت ہو۔ ان دو مہینوں کی عذاب ناکی کو اس حقیقت نے اور بڑھا دیا تھا کہ پانچ جون کو اختر کے دیئے ہوئے الٹی میٹم کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ پہلے صرف اتنا تھا کہ ان ساٹھ دنوں میں اسے کانٹوں پر چلنا اور کانٹوں پر سونا ہوتا تھا۔ اذیت تو ہوتی تھی لیکن بے یقینی کا عذاب نہیں ہوتا تھا۔ اس بار اسے یہ عذاب بھی اٹھانا تھا۔ اور ابھی اسے اٹھانا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پانچ جون کے بعد کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے گی؟ اختر کیا کرے گا؟ اسکول کی چھٹی کے بعد وہ یہی سب کچھ سوچ کر

ہلکان ہوتی رہی۔

مسئلہ یہ تھا کہ اختر نے یک طرفہ فیصلہ کرلیا تھا اور وہ کوئی جذباتی آدمی نہ تھا۔ ایسے لوگ کوئی فیصلہ کرلیں تو اس پر عمل ضرور کرتے ہیں اور اختر کا فیصلہ اس کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ کچھ اور لوگوں کے وعدے بھی اسے نبھانے تھے' جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ پھر وہ خواب دیکھنے والی لڑکی اپنے دل کے معاملے میں بے ایمانی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور اختر کچھ کر بیٹھتا تو یہ اس کے لئے مر جانے کے برابر ہوتا۔ خوامخواہ کے اس پچھتاوے کا بوجھ لے کر وہ پہاڑ جیسی زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ لیکن اختر اس کی سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔

وہ گھنٹوں گم صم بیٹھی رہتی۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ میں ڈنک چبھو رہتا کہ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ تن بہ تقدیر ہو بیٹھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ بے بسی کا یہ شدید احساس اس کے جسم کو شل کرکے رکھ دیتا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے' اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اس کی بھوک پیاس بھی ختم ہوکر رہ گئی۔ ساتھ ہی اس کی جھنجلاہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر اختر پر غصہ آیا۔ اسے اس عذاب میں مبتلا کرکے وہ خود سکون سے بیٹھا تھا۔ نہ آیا' نہ فون کیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے میں کس قدر سنجیدہ ہے۔ وہ اس معاملے میں کچھ سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔

مئی کا مہینہ شروع ہوا تو اسے ہول چڑھنے لگا۔ بچوں تک نے محسوس کرلیا کہ اس کی توجہ ان پر اور ان کی پڑھائی پر نہیں ہے۔ وہ کھوئی کھوئی رہتی۔ کچھ بتاتے بتاتے بھول جاتی۔ یاد ہی نہ رہتا کہ کیا کہہ رہی تھی۔ گم صم بیٹھی رہ جاتی۔ بچے کچھ پوچھتے تو اول تو وہ جواب ہی نہیں دیتی۔ دیتی تو بچوں کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس کے جواب سے ان کے سوال کا کیا تعلق ہے۔

بے بسی کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ بڑھتی گئی۔ ایک دن جھنجلاہٹ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ جھنجلاہٹ ختم ہوہی گئی۔ اس نے سوچا' یوں خوامخواہ خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ اس سے مسئلہ تو حل ہونے سے رہا۔ یہ خیال آتے ہی اس پر بے نیازی



ماری ہوگئی۔ ڈپریشن پھر بھی رہا مگر اس کی شدت بہت کم ہوگئی۔

ڈپریشن سے لڑنے کے لئے اس کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔ مطالعہ۔ چنانچہ وہ اق احمد کی "سفر در سفر" لے کر بیٹھ گئی۔ یہ خوب صورت کتاب اسے بہت پسند اتنی کہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہر بار اسے نئی لگتی تھی۔ یہ اس کے ڈپریشن کا ین علاج تھا۔ وادی کاغان اور جھیل سیف الملوک کا یہ سفرنامہ درحقیقت ایک سفر ر سفر کی روداد تھی' جو بہت خوب صورت پیرائے میں بیان کی گئی تھی۔ خوب رت وادی اور جھیل کا حسین سفر کرنے والے نے اس سفر کے دوران میں اپنے ل کی دنیا کا سفر بھی کیا تھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہی میمونہ کو جھیل سیف الملوک ے عشق ہوا تھا۔

میمونہ کبھی کراچی سے نہیں نکلی تھی مگر سفر در سفر پڑھتے ہوئے اس کی کیفیت ب ہو جاتی۔ پہلے تو وہ سفرنامے کے کرداروں کے ساتھ خود کو متحرک محسوس کرتی۔ کتاب کا صفحہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ سفرنامے کے کردار کہیں پیچھے رہ جاتے اور وہ تنہا ل کی طرف بڑھتی رہتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا مگر ایک فرق کے ساتھ۔ پہلے وہ ہمیشہ اکیلی ہی ہوتی تھی ر اس بار وہ کتاب کے کرداروں کو چھوڑ کر آگے بڑھی تو اکیلی نہیں تھی۔ سرمد بھی کے ساتھ تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جھیل کے راستے میں پڑے لیشیئر پر چل رہے تھے۔

"آپ نے اتنی دیر لگا دی آنے میں" میمونہ نے اس سے شکایت کی "پتا ہے' ے کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔"

"وقت سے پہلے کوئی کیسے آسکتا ہے" سرمد نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "ملنے کا تو ت مقرر ہوتا ہے۔"

"اس کا تو مطلب ہے کہ وہ تکلیفیں بھی پہلے سے مقرر کر دی گئی تھیں' جن ے میں گزری ہوں۔"

"یہی بات ہے" سرمد نے سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن تمہیں گزری ہوئی تکلیفوں اد کرنے اور ان پر افسوس کرنے کے بجائے ان خوشیوں کا خیال کرنا چاہیے' جو

تمہیں عطا کی گئیں اور ان پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"وہ تو میں کرتی ہوں۔ لیکن اپنی ان دنوں کی بے بسی یاد کر کے مجھے رلاتا ہے۔ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی اکیلی تھی۔"

"میں سمجھتا ہوں" سرمد نے زور دے کر کہا "اس لئے کہ میں خود بہت اکیلا ہوں۔ تم سے بھی زیادہ۔"

انہوں نے گلیشیئر عبور کرلیا "اب کتنی دور رہ گئی ہے جھیل؟" سرمد نے پوچھا۔

"بس تھوڑی دور رہے۔ یہ پہاڑ عبور کرنا ہے۔ اس کے بعد ایک پہاڑی ہے اس پر چڑھ کر ہم مڑیں گے تو جھیل نظر آئے گی۔"

"یہ تو بہت فاصلہ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ ہم ساتھ جو ہیں" میمونہ نے طمانیت سے کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں ہوتی" سرمد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میمونہ کا دل اجنبی انداز میں دھڑکنے لگا "یہ کیسی بات کی آپ نے۔ کہئے نا" اس کے لہجے میں التجا تھی اور نگاہیں بھی اصرار کر رہی تھیں۔

"ڈر ہے کہ تمہاری نظروں سے گر نہ جاؤں۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ میرے لئے جو آپ ہیں، ہمیشہ وہی رہیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ آپ میرے لئے کیا ہیں" میمونہ نے شرمیلے پن سے کہا۔

"آئی ..... آئی ....." سرمد اب بھی گڑبڑا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز بھی کر رہا تھا "آئی ل ..."

عین اس لمحے جب سرمد وہ جملہ کہنے والا تھا، جسے سننے کی وہ برسوں سے منتظر تھی، دروازے پر دستک ہوئی اور طلسم جیسے ٹوٹ گیا۔ میمونہ نے جھنجلا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ دروازے کے سامنے ہی رخ کئے بیٹھی تھی۔ نظریں اٹھاتے ہی اسے کمرے کا کھلا دروازہ اور دروازے میں کھڑا اختر نظر آیا۔ انداز بتاتا تھا کہ اس نے پہلے دروازہ کھولا ہوگا، کچھ دیر تک اسے محویت کے عالم میں دیکھا ہوگا اور اس کے بعد



چونکانے کے لئے دستک دی ہوگی۔ وہ چور سی ہوگئی۔ ان آخری لمحوں میں اس کے چہرے پر نہ جانے کیسے کیسے رنگ ہوں گے۔ کیا اختر نے بھی وہ رنگ دیکھ لئے؟ یہ سوچ کر وہ اور چڑ گئی۔

وہ جھنجلا کر کہنے ہی والی تھی کہ اختر نے پہل کر دی "میں اندر آسکتا ہوں کزن میمونہ؟"

"تم اندر آچکے ہو۔ تم نے دستک بھی دروازہ کھولنے کے بعد دی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے دروازہ کھولنے کے ٹھیک دو منٹ بعد دستک دی تھی" اختر نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"تم حد درجہ بداخلاق اور غیر مہذب آدمی ہو" میمونہ نے کہا۔ اسے خود پر بھی غصہ آرہا تھا اور اختر پر بھی۔ کہاں تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی، دعا کر رہی تھی کہ وہ آئے اور اسے بات کرنے کا موقع ملے اور اب وہ آیا تھا تو اس انداز میں کہ لڑائی شروع ہوگئی تھی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔

"تعریف کا شکریہ۔ میں حقیقت پسند آدمی ہوں۔ اس لئے برا نہیں مانوں گا" اختر نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ، کر کیا رہی تھیں تم؟"

میمونہ اور چڑ گئی "بغیر دستک کے تم دروازہ کھول کر کمرے میں گھس آئے تھے۔ آنکھیں نہیں ہیں تمہاری؟ نظر نہیں آتا تمہیں؟"

"آنکھیں بھی ہیں اور خدا کے فضل سے نظر بھی آتا ہے" اختر نے ڈھٹائی سے کہا "پھر بھی پوچھ رہا ہوں تو کوئی وجہ ہوگی۔ بعض اوقات جو دکھائی دیتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کوڑھ مغز ہونے کی دلیل ہے" میمونہ نے بھنا کر کہا "میں پڑھ رہی تھی۔"

"میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسی لئے پوچھ رہا تھا" اختر نے نہایت اطمینان سے کہا "تمہارے سامنے کھلی کتاب تھی لیکن تمہاری نظریں کتاب پر نہیں، کہیں اور تھیں۔ اور جہاں تمہاری نظریں تھیں، وہاں دروازے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا مگر میں نے دروازہ کھولا تو تمہیں پتا نہیں چلا۔ میں دروازے میں دو منٹ کھڑا رہا۔ تمہیں میری موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ آخر مجھے تمہیں چونکانے کے

لئے دستک دینے کی بداخلاقی کرنی پڑی۔"

"میں پڑھتے پڑھتے کچھ سوچنے لگی تھی" میمونہ نے اس کے مشاہدے سے گو کر صفائی پیش کی۔

"ہاں' یہ کچھ حقیقت سے قریب جواب ہے" اختر نے مربیانہ انداز میں کہا۔

"تم وہ کچھ تو بتاؤ' جو تمہاری آنکھوں کو نظر آیا تھا۔"

اختر نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دیکھتا رہا۔

"بتا دوں ؟" چند لمحے بعد اس نے چیلنج کیا۔

اب میمونہ کو احساس ہوا کہ وہ اختر کو بے حد خطرناک دعوت دے بیٹھی ہے لیکن اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی "بتاؤ۔ یہ کہہ تو رہی ہوں۔"

اختر چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "چھوڑو۔ جو میں بتاؤں گا' وہ تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے چڑو اور لڑو۔ اس لئے میں بس اتنا کہوں گا کہ میں نے بہت بروقت مداخلت کی۔ بڑے صحیح وقت پر آیا میں۔"

میمونہ نے دستک کے لمحے کے بارے میں سوچا۔ یہ یاد کرکے کہ اس لمحے اس کے تصور میں کیا ہو رہا تھا' اس کا چہرہ تمتما اٹھا' "جی نہیں" اس نے کہا۔ "تم بہت غلط وقت پر آئے ہو۔"

"یہ تو اپنے اپنے نقطہ نظر کا فرق ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ اچھا چھوڑو اس بات کو۔ دکھاؤ تو' کیا پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں تم۔"

میمونہ نے بے دلی سے کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔ اختر نے ادھر ادھر سے تھوڑا تھوڑا پڑھا۔ پھر بے زاری سے کتاب بند کرتے ہوئے کہا' یہی تو مصیبت ہے تمہارے ساتھ۔ تم کتابیں بھی ایسی پڑھتی ہو' جو حقیقت سے دور' خواب و خیال کی وادیوں میں لے جائیں" اس نے ایک سرد آہ بھری' اس مطالعے کے نتیجے میں زندگی کے لئے تمہاری اپروچ ہی درست نہیں رہی۔ سامنے کی حقیقتیں چھوڑ کر موہوم خوابوں کے پیچھے دوڑتی ہو۔"

خلاف معمول میمونہ یہ سن کر بھڑکی نہیں "تمہیں غلط لگتی رہے مگر میری اپروچ



کیا ہے۔ درحقیقت میں اور تم ضد ہیں ایک دوسرے کی۔ تم یہ بات سمجھتے ہی نہیں۔"

اختر کو افسوس ہوا۔ میمونہ اس کے لفظوں سے فائدہ اٹھا رہی تھی "مکمل ہم آہنگی تو کہیں ہوتی ہی نہیں۔ کچھ ہوتی ہے اور کچھ پیدا کی جاتی ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

"مگر جہاں اپروچ ہی بالکل مختلف ہو ..."

"جسے محبت ہو' اسے سمجھوتے کرنے خوب آتے ہیں" اختر نے اس کی بات کاٹ دی "میری اس خوبی کا تمہیں اندازہ ہی نہیں۔"

"اختر میں تمہارا انتظار کر رہی تھی" میمونہ نے گفتگو کا رخ بدلا۔

"زہے نصیب۔ علامات تو اچھی نظر آ رہی ہیں۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری اور بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"ہو جائیں گی مگر ایسے نہیں۔ چائے کے بغیر مجھے کچھ سجھائی نہیں دے گا" اختر نے اٹھتے ہوئے کہا "میں بوا کو سلام کر آؤں۔ جواب میں شاید چائے مل جائے۔"

میمونہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔



پریشانی انا بوا کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ عمر بھر وہ پریشان ہوتی رہی تھیں۔ وہ بھی دوسروں کے لئے مگر ان دنوں وہ بہت زیادہ پریشان تھیں۔ سبب یہ تھا کہ وہ اس پریشانی کو دور کرنے کے سلسلے میں کچھ کر نہیں پا رہی تھیں۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں ورنہ وہ پریشان ہوتیں تو ہاتھ پیر ضرور مارتی تھیں۔ اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔

پریشانی کا سبب ایک ہی تھا۔ میمونہ .. کبھی کبھی تو وہ سوچتیں کہ اب ان کے ہاں پریشان ہونے کے لئے میمونہ کے سوا کچھ اور ہے بھی نہیں۔ اس کی طرف سے پریشان نہ رہیں تو کیا ہوگا۔ اس کا جواب انہیں فوراً" ہی مل جاتا۔ انہیں خیال آتا کہ موت آکر کہے گی۔ چلو بڑی بی' اب تم کسی کام کی نہیں رہیں۔ تمہارا بلاوا آگیا ہے۔

اور وہ کیونکہ زندگی سے بیزار بیٹھی ہوں گی لہٰذا فوراً" ہی چل بسیں گی۔

میمونہ سدا کی محروم لڑکی تھی مگر انہوں نے اسے محرومیوں پر جلتے کڑھتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پریشان بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسکول میں وہ بہت اچھی طرح وقت گزارتی تھی۔ بچوں میں گم ہوکر رہ جاتی تھی۔ کوئی اسے دیکھ کر کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی روح دکھوں سے بوجھل ہے۔ بوا کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی۔

مگر پچھلے کچھ عرصے سے میمونہ بہت پریشان تھی۔ حد یہ تھی کہ وہ اسکول میں بھی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ پیشانی پر سوچ کی لکیروں کا جال ہوتا۔ کلاس کے بچوں کو بھی وہ توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس بار کی پریشانی کم از کم اس کے لئے بہت سنگین ہے اور میمونہ پریشان تھی تو سدا کی دوسروں کے لئے پریشان ہونے والی بوا پریشان کیوں نہ ہوتیں۔

اور بوا جب بھی پریشان ہوتیں تو ہر چیز سے باتیں شروع کر دیتیں۔ اس وقت وہ کچن میں موجود رات کا کھانا پکانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا دھیان کھانے کی طرف نہیں تھا۔ وہ میمونہ کی پریشانی میں الجھی ہوئی تھیں "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی کو ہوا کیا ہے" انہوں نے اس دیگچی سے شکایت کی' جسے وہ دھو رہی تھیں "منہ سے کچھ بتاتی بھی تو نہیں۔"

انہوں نے دیگچی کو کھنگال کر ایک طرف رکھا اور پیاز کاٹنے بیٹھ گئیں "لیکن کوئی بات ضرور ہے۔ اور وہ بھی بڑی بات" انہوں نے بیک وقت پیاز اور چھری کو مطلع کیا "ورنہ پہلے کبھی ایسا حال نہیں ہوا اس کا۔"

"کچھ بھی نہیں۔ ٹھیک ٹھاک تو ہے" انہوں نے پیاز کو کہتے سنا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی بے جان چیز نے جوابی تبصرہ کیا ہو۔ مگر وہ اتنی پریشان بھی تو کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

"اے خاک ٹھیک ٹھاک ہے۔ اور تمہارا کیا' تم تو ہو ہی اذیت پہنچانے والی۔ ہمیں بھی رلا رہی ہو۔ تمہیں تو لوگوں کی پریشانی میں' ان کے رونے میں مزہ آتا ہے۔" بوا نے بھنا کر بی پیاز کو پھٹکارا۔ یہی نہیں' ان کے ہاتھ میں موجود چھری گویا



انتقاماً" پیاز پر ٹوٹ پڑی۔

"مگر بوا..." پیاز منمنائی۔

"بس چپ ہی رہو تم۔ تمہارا تو میں ٹنٹا ہی ختم کئے دیتی ہوں۔"

پیاز کٹ چکی تو بوا نے اپنی حلیف چھری کو بڑے پیار سے سہلایا اور بولیں "اس سے تو کچھ اگلوانا ممکن ہی نہیں۔ کتنے دن ہوگئے دیوار سے ٹکراتے ہوئے" ذرا سے توقف کے بعد وہ پھر بولیں "ایسے میں سرمد بہت یاد آتا ہے۔ وہی اسے سمجھا سکتا تھا۔ اس سے شاید یہ دل کی بات بھی کہہ دیتی۔"

انہوں نے دھلی ہوئی دیگچی کو چولھے پر چڑھایا۔ اس میں گھی ڈالا اور پھر پیاز ڈالی "اب پتا چلے گا تمہیں" انہوں نے کٹی ہوئی پیاز سے کہا۔ "کھولتے ہوئے گھی میں تلی جاؤ گی تو دماغ درست ہو جائے گا۔ بہت بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔"

مگر اگلے ہی لمحے پیاز چھن چھن کرنے لگی' جیسے بوا کو چھیڑ رہی ہو۔

"اللہ رے زبان درازی" بوا نے جل کر کہا "اے تم تو بڑی منتقم مزاج ہو پیاز بی بی۔ مرتے مرتے بھی ہمیں جلا رہی ہو۔"

پیاز چھن چھن کرکے انہیں جلاتی رہی۔ بوا نے دیگچی میں جھانک کر دیکھا۔ پیاز براؤن ہو رہی تھی۔ اچانک انہیں ایک خیال آیا اور انہوں نے بڑی شدت سے سر پیٹ لیا "ارے ہمارا دماغ چلا دیا تم نے اور اس نامعقول مونا ہے" انہوں نے دیگچی چولھے سے اتارتے ہوئے بے حد غصے سے کہا "بھلا بتاؤ۔ دماغ چل گیا ہے ہمارا۔ کلیجی پکا رہے ہیں اور بگھار پیاز کا دے رہے ہیں۔ بگھار تو میتھی دانے کا لگنا چاہیے۔"

انہوں نے تلی ہوئی پیاز اور گھی کو ایک پیالے میں نکالا اور چولھے پر دوسری دیگچی چڑھا دی "اب تم ہی بتاؤ' ہم کیا کریں" انہوں نے چولھے کو اپنے خطاب سے نوازا "ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارے بھئی' ہر مسئلے کا ایک حل ہوتا ہے مگر پتا تو چلے کہ مسئلہ کیا ہے اور ہم اپنی پریشانی کس سے کہیں۔ سرمد میاں ہوتے تو..." وہ کہتے کہتے رکیں "اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ اس پریشانی کا تعلق اختر میاں سے ہے۔ یاد ہے' اس روز ہم اختر میاں کی عیادت کو گئے تھے" اس بار انہوں نے میتھی دانے سے کہا' جسے انہوں نے برنی سے نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا "وہیں کچھ ہوا تھا۔ اسی

دن سے پریشان ہے بٹیا۔ اتنے نادان تو ہم نہیں ہیں نا۔ سب کچھ سمجھ میں آتا ہے ہماری۔ اب یہ نہیں معلوم کہ بات کیا ہے؟" انہوں نے میتھی دانے کو دیگچی میں جھونک دیا۔

"اب اختر میاں ہی کچھ بتائیں تو بتائیں" انہوں نے دیگچی سے کہا۔

اور اسی لمحے انہیں اختر کی لہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ پیاری انا بوا۔ آداب عرض کرنے کی جسارت کرسکتا ہوں؟"

بوا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دروازے میں کھڑا تھا "وعلیکم السلام میاں۔ جسارت تو آپ طول دینے کی کرچکے ہیں ...."

بوا کچھ اور کہنا چاہ رہی تھیں کہ اختر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اب آپ صاحب کا .... یعنی میرے تایا مرحوم کا حوالہ دیں گی کہ وہ کہتے تھے ...."

اس بار بوا نے اس کی بات کاٹ دی "نہیں میاں، ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ تمہاری عمر ماشاء اللہ بڑی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے" اختر نے سر ہلا کر کہا "شیطان سے لمبی عمر کس کی ہوتی ہے اور وہ نام لیتے ہی حاضر ہو جاتا ہے۔ یہی کہتے تھے نا تایا جان مرحوم۔"

"ہاں، یہی کہتے تھے۔" بوا نے آہ بھر کے کہا۔

"اچھا، تو آج آپ کس سلسلے میں یاد کر رہی تھیں مجھے؟"

"چائے پلانا چاہتے تھے بہت اچھی سی۔"

اختر نے دانت نکال دیئے "خدا کی قسم انا بوا، میرے اور آپ کے درمیان اتنی ہم آہنگی ہے کہ کبھی کبھی مجھے اپنے بہت لیٹ پیدا ہونے پر افسوس ہونے لگتا ہے۔"

"ہماری سمجھ میں اس کا مطلب تو نہیں آیا لیکن لگتا ہے کہ تم کوئی بہت ایسی ویسی بات کر رہے ہو" بوا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"ارے نہیں بوا۔ ایسی کون سی بات ہوسکتی ہے" اختر جلدی سے بولا "یہ تو بتائیں کہ آپ ہمیں اچھی سی چائے کس سلسلے میں پلانا چاہتی تھیں۔"

"تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں میاں۔"



"یہی تو کہوں کہ کوئی بات ضرور ہے۔ یوں اس زمانے میں کون کسی کو چائے پلانے کے لئے یاد کرتا ہے۔"

بوا کھسیا گئیں "مطلب تو آج آن پڑا ہے میاں ورنہ ہم تو ہمیشہ تمہیں یاد کرتے ہیں اور محبت سے تواضع بھی کرتے ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بوا" اختر جلدی سے پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ "میں تو آپ کی محبت کا قائل ہوں اور یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔"

"بوا نے چائے کا پانی چولھے پر رکھا۔ اس دوران میں اختر انہیں مستفسرانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ بوا اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح شروع کریں۔ انہوں نے کہا "میاں، ہم مونا کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھ سے؟" اختر نے حیرت سے کہا۔

"تو اور کس سے کریں۔ سرمد میاں ہوتے تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔"

سرمد کا نام سنتے ہی اختر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کے ذہن میں ایک موہوم سا خیال ابھرا۔ پھر اس کے خدوخال ابھرنے لگے۔ ایک پل میں بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ بات وہ پہلے کیوں نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر بھی اس کے ذہن نے تردید کی کوشش کی۔ لیکن اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ الجھتا رہا تھا کہ میمونہ اسے کیوں مسترد کرتی ہے جب کہ بظاہر وہ کسی میں دلچسپی بھی نہیں رکھتی۔ اس نے جان لیا کہ میمونہ سرمد سے محبت کرتی ہے۔ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اب بھی وہ اس خیال کو حقیقت تسلیم کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

بوا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "مجھ سے کیا چاہتی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ، بٹیا سے کوئی بات ہوئی تھی تمہاری؟"

"باتیں تو ہوتی رہتی ہیں" اختر نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔

"کوئی ایسی بات، جس سے بٹیا پریشان ہوئی ہو" بوا اب اس کی آنکھوں میں دیکھ

رہی تھیں۔

"میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی" اختر نے ڈھٹائی سے کہا "ویسے آپ خود میمونہ سے کیوں نہیں پوچھتیں۔"

"ارے ' وہ کچھ بتاتی ہے کبھی" بوا جھنجلا کر بولیں۔

"تو کیا بہت پریشان ہے میمونہ؟" اختر کو خوشی ہوئی۔ میمونہ کی پریشانی اس بات کا ثبوت تھی کہ اس نے اختر کی بات کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ گویا اچھے نتائج کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

"ہاں' بہت زیادہ۔ بالکل بدل کر رہ گئی ہے۔"

"بس تو فکر نہ کریں بوا۔ نتیجہ اچھا ہی نکلے گا انشاء اللہ۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تعمیر تو تخریب کے بعد ہوتی ہے نا۔ پرانی عمارتیں گرتی ہیں تو وہاں نئی عمارتیں بنتی ہیں۔"

بوا نے اسے یوں دیکھا' جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو "تم بھی سنکی ہو.... اسی کی طرح۔ جاؤ میاں' میں چائے لے کر آتی ہوں" ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"شکریہ بوا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہ کرسکا" اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لو دیکھو۔ یہ اس سے بھی زیادہ گہرے ہیں" بوا نے اس کے جانے کے بعد چائے کی پیالی کو اطلاع دی۔



میمونہ نے چائے کی پیالی خالی کرکے ایک طرف رکھ دی۔ اختر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد مضطرب نظر آرہی تھی۔

"چائے پیونا۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے" میمونہ نے اسے ٹوکا۔ اس کے لہجے میں بھی اضطراب تھا۔



"مجھے حیرت ہے کہ تم بول کیسے رہی ہو" اختر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے

"کیا مطلب؟"

"اتنی گرم چائے ایک گھونٹ میں پی ہے۔ حلق تک جل گیا ہوگا۔"

"چائے اتنی گرم نہیں ہے۔ پی کر تو دیکھو۔"

"پی رہا ہوں۔ وہ بھی مزے لے لے کر۔ میں زہر مار کرنے کا قائل ہیں۔"

"دیکھو' مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میمونہ نے سخت لہجے میں

"ضرور کرنا مگر میرے چائے پینے کے بعد۔"

میمونہ نے جھنجلا کر کتاب اٹھالی اور یونہی دیکھنے لگی۔ اس کیفیت میں وہ پڑھ تو ہ سکتی تھی۔ اختر اسے دیکھتا رہا لیکن اس کا انداز ایسا تھا' جیسے اسے کمرے میں اختر موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اختر مسکرایا اور پیالی کی تمام چائے ایک ہی گھونٹ پی گیا۔ چائے واقعی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

"ہاں کزن میمونہ' اب کہو' کیا بات ہے۔" اس نے میمونہ کو پکارا۔

میمونہ گڑبڑا گئی۔ کب سے بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔ اب موقع ملا تو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح کی جائے' کزن میمونہ' نے اسے مہلت فراہم تا "یہ تمہیں پھر کزن کا لاحقہ لاحق ہوگیا۔" اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

"یہ تو ایک بین الکائناتی سچائی ہے کزن کہ ہم کزن ہیں۔" اختر نے بڑے سکون کہا "ویسے میرا خیال ہے کہ تم بات کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تقدیر کے لکھے کا اعلان کرنے رورت نہیں۔"

"میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ اب کام کی بات کرو۔"

"پچھلی بار جو تم نے مجھے الٹی میٹم دیا تھا' میں اس پر بات کرنا چاہتی ہوں۔" ے ایک دم سے اسٹارٹ لیا۔

"اور میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس پر مزید بات کی گنجائش نہیں۔" اختر

کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم کوئی ایسا فیصلہ یک طرفہ طور پر نہیں کرسکتے جس کا تعلق تمہارے علاوہ کسی اور کی زندگی سے ہو۔" میمونہ نے بھڑک کر کہا" یہ طرز عمل نہ تو اخلاقی طور پر درست ہے نہ ہی شرعاً جائز ہے۔"

"تم مجھ پر بہتان لگا رہی ہو۔" اختر نے بے حد سکون سے کہا۔ "میں نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا' جو میرے علاوہ کسی اور کی زندگی کے متعلق ہو اور اپنی زندگی کے متعلق میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔"

"کیسی بات کرتے ہو۔" میمونہ کو طیش آگیا "تم کھلم کھلا بلیک میلنگ کر رہے ہو۔"

"یہ اور بڑا بہتان ہے مجھ پر۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر میں کہتا کہ خود کو ختم کرتے ہوئے میں ایک رقعہ چھوڑوں گا' جس میں تمہیں اپنی موت کا ذمے دار ٹھہراؤں گا تو یہ بلاشبہ بلیک میلنگ ہوتی مگر میں نے تو تمہاری زندگی کا فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔ اب میں اپنی زندگی کا کچھ بھی کروں' تمہیں اس سے کیا۔"

میمونہ لاجواب ہوگئی' "مگر اس کے بارے میں مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"غلطی ہوگئی۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ویسے میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم میرے ساتھ ہی نہیں' اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہو۔ جو اتنے برسوں میں لوٹ کر نہیں آیا' اس کی واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی ہے اور اگر وہ واپس آ آگیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسے دیکھ کر' اس سے مل کر تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ بچپن کا چاند سپنا جوانی میں بیکار کھلونا ہی لگتا ہے آدمی کو۔ بہتر یہی ہے حقیقت پسند بن کر سوچو اور درست فیصلہ کرو۔"

میمونہ کا چہرہ سپید پڑگیا "یہ تم کہاں کی ہانک رہے ہو؟"

"میں سب کچھ جان گیا ہوں کزن میمونہ۔ تم جس کے پیچھے بھاگ رہی ہو وہ سایہ بھی نہیں' سائے کا وہم ہے۔ بچپن کی حماقت سے پیچھا نہ چھڑائے تو آدمی عمر بھر بچہ ہی رہتا ہے۔"



میمونہ شیر ہوگئی۔ سب کچھ سامنے آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت بڑی الجھن بھی اب اسے بڑی نہیں لگ رہی تھی "تمہیں محبت کا دعویٰ ہے لیکن تم محبت کو سمجھتے ہی نہیں ہو۔"

"سمجھتا ہوں۔ اسی لئے محبت اور حماقت میں فرق کرسکتا ہوں۔"

"دوسروں کے جذبوں کی ناپ تول کون کرسکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ البتہ کوئی احمق ہی یہ دعویٰ کرسکتا ہے۔" میمونہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے اور اپنے حق میں دعا ہی کرسکتا ہوں۔" اختر نے اٹھتے ہوئے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں خوش کیسے رکھا جاسکتا ہے اسی لئے اس کہانی کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ کب تک تمہیں ایک وہم کا پیچھا کرتے دیکھتا رہوں۔ اس لئے جو فیصلہ کیا ہے' اس پر پوری طرح عمل بھی کروں گا۔ مقررہ وقت تک تمہارا وہم حقیقت میں بدل گیا تو میں بڑے خلوص اور محبت سے تمہیں مبارک باد دوں گا اور خود بھی کہیں اور سے خوشیاں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن جانے والا واپس نہ آیا تو سب کچھ تمہارے فیصلے پر منحصر ہوگا۔"

"لیکن اختر۔"

"بس کزن' اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی اور اب میں اسی دن آؤں گا' جب مہلت ختم ہو رہی ہوگی۔ اس دوران میں تم مجھے فون بھی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔



میمونہ سوچتی اور الجھتی رہی۔ اختر نے جو مسئلہ کھڑا کر دیا تھا' اس کا کوئی حل اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ بس وہ ایک بات جانتی تھی۔ جو کچھ اختر چاہتا تھا' وہ اسے قبول نہیں کرسکتی تھی۔ مہلت کے بارے میں سوچ کر اسے غصہ آنے لگتا۔ اختر کون ہوتا ہے مجھے مہلت دینے والا۔ ایسے ہی غصے اور جھنجلاہٹ کے ایک لمحے میں اس نے ایک اہم بات سمجھ لی۔ وہ حقیقت پسند نہیں تھی۔ وہ تو خوابوں میں رہنے والی تھی

لیکن اگر وہ حقیقت پسند ہو بھی جائے تو یہ طے ہے کہ نہ اختر اس کے لئے ہے، نہ وہ اختر کے لئے ہے۔ اختر اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کی فطرت ددھیالی تھی۔ ظاہر کی نرمی کے پیچھے چھپی وہی مردانہ حاکمیت۔ اپنا فیصلہ دوسروں پر تھوپ دینے کی خو۔ وہی ابو والا مزاج۔ اس کا ثبوت یہ فیصلہ تھا، جو وہ محبت کے نام پر اس پر تھوپ رہا تھا۔ وہ اسے پسند کرتی تھی۔ وہ اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کی موت کا تصور ہی اس کے لئے روح فرسا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

اس کے بعد وہ پرسکون ہوگئی۔ اس ضد کا انجام جو بھی ہو، خود اختر ہی اس کا ذمے دار ہوگا یا پھر مقدر لکھنے والا جانے۔ ہاں، اپنی دی ہوئی مہلت ختم ہو جانے پر وہ آئے گا تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کرے گی۔ وہ اسے بتائے گی کہ یہ اس کا حقیقت پسندانہ فیصلہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس کے بعد احمقانہ الٹی میٹم پر عمل کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ آگے اس کی مرضی۔

اس کا اضطراب اور بے قراری تو دور ہوگئی لیکن ایک خلش اب بھی کبھی کبھی ستاتی تھی۔ وہ یہ کہ اب کیا ہوگا؟ مگر اب وہ خوفزدہ بہرحال نہیں تھی۔

پھر اسکول کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ چھٹیوں سے وہ ڈر رہی تھی مگر ہوا یہ کہ چھٹیاں اس کے لئے سکون اور طمانیت کا سبب بن گئیں۔ ایک ایسا مشغلہ ہاتھ آگیا جسے وہ پریشانیوں میں بھول ہی گئی تھی۔

گرمی کی چھٹیوں کے پہلے دن وہ گھبرائی ہوئی تھی کہ اب وقت کیسے کٹے گا۔ وہ دیر تک سوئی۔ ناشتہ بھی دیر سے کیا۔ اس کے بعد وہ بولائی بولائی پورے گھر میں پھرتی پھری۔ کہیں ٹکا نہیں جا رہا تھا۔ لان دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ گرمی بہت شدید تھی۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ایسے میں اس کی نظر آپی کی الماری پر پڑی۔ وہ خوش ہوگئی۔ اسے خود پر حیرت ہوئی۔ یادوں کے خزانے تھے اس کے پاس۔ یادوں کے اس عجائب گھر میں تو وہ مہینے گزار سکتی تھی۔ کوئی پریشانی اسے چھو کر بھی نہ گزرتی۔

اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور آپی کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ الماری کھولتے ہوئے اسے ڈراور کا خیال آیا۔ ڈراور سرمد بھائی کی یادوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سوچا، کھانے کے بعد ڈراور کو دیکھے گی۔



پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور ے کھیلتی رہتی۔



گرمیوں کی چھٹیاں بوا کے لئے بھی بہت سخت ہوتی تھیں۔ ان کے لئے یہ اپنے ہوئے دکھوں میں جینے کا موسم ہوتا تھا۔ اسکول کے بچوں میں الجھی رہتیں تو زندگی میں کچھ کرنے کا خوش کن احساس رہتا۔ انہیں لگتا کہ وہ اپنے بچے پال ہیں۔ چھٹیاں شروع ہوتیں تو وہ جبرا" خود کو اسی دن میں موجود پاتیں، جب ان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ان کے بچوں کو موت نے اپنے بے رحم پنجوں میں دبوچ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتیں کہ ملبہ ہٹایا جا رہا ہے۔ اور ان کے بچوں کی نکالی جا رہی ہیں۔ وہ منظر انہیں تصور نہیں، حقیقی لگتا تھا۔ لگتا تھا، وہ ان کی وں پر مرتسم ہوگیا ہے مگر وہ نقش جیسے شفاف تھا۔ وہ ان آنکھوں سے دنیا کو تو وہ ان کی دید میں کبھی خارج نہ ہوتا لیکن دیکھنے کو کچھ نہ ہوتا تو وہ منظر بن منظر ہی رہتا۔

چھٹیوں میں بوا کو یہ احساس بھی ستاتا کہ وہ کارآمد نہیں رہی ہیں اور ناکارہ کو وہ موت سمجھتی تھیں۔ زندگی بھر وہ کسی نہ کسی کے لئے کچھ کرتی رہی تھیں۔ تو شاید زندہ بھی نہ رہ پاتیں۔ اس لئے چھٹیوں کے ان دو مہینوں میں وہ جی رتی تھیں۔ اور مرمر کے جیتی تھیں۔

اس بار کی چھٹیاں اور بھاری لگ رہی تھیں۔ ہمیشہ میمونہ بھی اس کیفیت میں ساتھی ہوتی تھی۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے میں پناہ ڈھونڈتی تھیں۔ میمونہ کے قریب آتی، جیسے کئی دنوں کا ماں سے بچھڑا بچہ مل جانے پر ماں کی طرف یوں دونوں کا وقت جیسے تیسے گزر ہی جاتا تھا مگر اس بار میمونہ نے خود کو رے تک محدود کرلیا تھا۔ بس ناشتے اور کھانے کے لئے وہ باہر آتی اور اس کے پھر دروازہ بند کرکے بیٹھ جاتی۔

بوا کے لئے اچھا یہ تھا کہ وہ پہلے ہی سے میمونہ کی پریشانی پر پریشان تھیں۔ اس

کے یوں گوشہ نشین ہو جانے نے انہیں اور پریشان کر دیا۔ گویا انہیں جینے کا بہانہ گیا۔ ویسے تو ان کے خیال میں ہر پریشانی کا حل مصروفیت میں تھا اور وہ خود کو ہر زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ لیکن فرصت تو آدمی کو ملتی ہی ہے۔ چنا اپنی فرصت کے لمحوں میں بوا' میمونہ کے متعلق سوچ کر حسب توفیق پریشان ہوتی اور جلتی کڑھتی رہتیں۔

کچھ نہ ملا تو باغیچے پر ملتفت ہوگئیں۔ کیاریاں ٹھیک کرتیں' پودوں کی چھ کرتیں۔ حسب ضرورت پھولوں' پتوں اور گھاس سے مکالمے بھی ہوتے۔ اس با میں انہیں دھوپ کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی۔

اسکول کی چھٹیاں شروع ہوئے تیسرا دن تھا۔ بوا پھولوں سے میمونہ کے شکایتی مکالمے بول رہی تھیں۔ اچانک گھنٹی بجی۔ انہوں نے جاکر دیکھا۔ ایک خا کھڑی تھیں "جی فرمایئے ؟" بوا نے بے حد خوش اخلاقی سے کہا۔

"میں اپنے بچے کی فیس جمع نہیں کرا سکی تھی۔ وہ دینے آئی ہوں۔"

بوا اس سے پہلے ہی چھوٹا گیٹ کھول چکی تھیں "تشریف لے آیئے لیکن ا فیس کہاں جمع ہوگی۔ دفتر تو اب چھٹیوں کے بعد ہی کھلے گا۔"

خاتون اندر آچکی تھیں "میں چھٹیوں ہی کی فیس کی بات کر رہی ہوں۔" انہ نے کہا "آپ ہی لے لیجیے۔"

اب وہ دفتر کے قریب تھیں' جو نچلی منزل پر ہی تھا۔ بوا ٹھٹک گئیں "جی نہیں یہ ہمارے بس کا کام نہیں۔ ہم پیسے کے لین دین میں نہیں پڑتے۔"

"تو اسکول کی منتظمہ تو یہیں رہتی ہیں۔" خاتون بولیں آپ مجھے ان سے دیجیے۔"

"یہ ممکن ہے۔" بوا نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا "لیکن آپ کو ذرا انت کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے' وہ سو رہی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔"

بوا نے دفتر کا دروازہ کھولا۔ جھاڑن سے ایک کرسی کو صاف کیا اور ان طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ "تشریف رکھئے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"



خاتون بیٹھ گئیں۔ بوا میمونہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ دروازے پر پہنچ کر ہیں اور انہوں نے ہینڈل گھما کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ انہوں نے دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اسی لمحے ٹھٹک گئیں۔

کمرے کے اندر سے انہیں واضح طور پر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی!

بوا استعجاب سے شل ہوکر رہ گئیں۔ پہلے لمحے میں انہیں خیال آیا کہ یہ اختر ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا مگر فوراً ہی انہیں خیال آیا کہ اس صورت میں دروازہ نہیں ہوسکتا۔

آواز اب بھی آرہی تھی۔ اس بار بوا کو احساس ہوا کہ آواز اختر کی ہرگز نہیں اختر کی آواز تو وہ خوب پہچانتی تھیں مگر عجیب بات یہ تھی کہ غور سے سننے پر بھی واز انہیں اجنبی اور نامانوس نہیں لگی تھی مگر وہ اسے پہچان بھی نہیں پا رہی

درحقیقت بوا شاک میں تھیں۔ میمونہ کے بند کمرے سے کسی مردانہ آواز کو کے متعلق انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن وہ آواز ایک ناقابل حقیقت تھی۔

انہوں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا جو دستک دینے کے لئے بڑھا تھا اور دروازے ذرا ہی دور منجمد ہوکر رہ گیا تھا' اسی لمحے انہیں احساس ہوا کہ اندر سے سنائی والی مردانہ آواز باتیں نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ گنگناتی ہوئی آواز ہے۔

ان کا رکا ہوا ہاتھ بے اختیار بڑھا اور دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اس نہیں خود پر قابو نہیں تھا۔ دستک بھی انہوں نے بلا ارادہ دی تھی۔ دستک ہوتے اندر سے سنائی دینے والی آواز موقوف ہوگئی تھی۔

یونہی چند لمحے گزر گئے۔ بوا بت بنی کھڑی رہیں۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل تھیں۔ دروازہ کھلا اور میمونہ نظر آئی "کیا بات ہے بوا ؟ خیریت تو ہے ؟" اس بے حد پریشان ہوکر پوچھا۔ بات پریشانی کی تھی۔ بوا بلا ضرورت اسے ڈسٹرب نہیں تھیں۔ پھر اس وقت ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"وہ .... کوئی خاتون بچے کی فیس جمع کرانے آئی ہیں۔ ہم نے انہیں دفتر میں بٹھا

دیا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں ابھی مل لیتی ہوں ان سے۔"

میمونہ چلی گئی۔ بوا ویسے ہی بت بنی کھڑی رہیں۔ میمونہ کے کمرے کا در کھلا ہوا تھا۔ تجسس کے مارے انہوں نے کمرے میں جھانکا۔ بظاہر کمرے میں نہیں تھا۔ تو پھر وہ آواز کیسی تھی؟ وہ بے اختیار کمرے میں داخل ہوئیں اور ا نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اچانک شرمندگی کی ایک تند لہر نے ان کے پورے کو شل کر کے رکھ دیا۔ ارے۔ میمونہ کے بارے میں ایسے سوچا جا سکتا ہے! ا ٹانگیں جواب دینے لگیں تو وہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ یونہی بیٹھے ہوئے وہ کو گھورتی رہیں۔

میمونہ خاتون کو نمٹا کر واپس آئی تو بوا اسے اسی طرح بیٹھی ملیں۔ اس حیرت اور پریشانی سے بوا کو دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے بوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے

بوا چونکیں "آں ...... ہاں ..... طبیعت ٹھیک ہے۔"

"لگتا تو نہیں۔ بتایئے نا کیا بات ہے؟" میمونہ اور پریشان ہوگئی۔

"کچھ بھی نہیں۔ ہم تو بس تمہاری طرف سے پریشان رہتے ہیں۔" بوا گفتگو کا رخ بدلا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آواز کے بارے میں کیسے پوچھیں

"میری طرف سے! مجھے کیا ہوا ہے؟"

"تم پچھلے کچھ عرصے سے بہت زیادہ پریشان نظر آتی ہو۔ بتاتیں بھی نہیں۔"

"کچھ ہو تو بتاؤں۔ بات یہ ہے بوا کہ صورت ہی ایسی ہے۔"

"صورت تو بہت پیاری ہے۔" بوا کہتے کہتے رکیں پھر انہوں نے بڑا حو کر کے پوچھا "تمہارے کمرے سے کسی کی آواز آرہی تھی۔ کس کی تھی؟"

ایک لمحے کو میمونہ کی رنگت متغیر ہوگئی مگر فوراً ہی اس نے سنبھل کر

"میرے کمرے میں تو بس میری ہی آواز ہو سکتی ہے۔"

"نہیں۔ ہم مردانہ آواز کی بات کر رہے ہیں۔" بوا نے زور دے کر کہا۔

"آپ کو وہم ہوا ہوگا۔ میرے کمرے میں مردانہ آواز کا کیا کام؟"



"وہ وہم نہیں تھا لیکن تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" میمونہ کو ان پر ترس آنے لگا۔

"تمہیں ناراض تو نہیں کر سکتے۔" بوا نے بے بسی سے کہا۔ "نہیں چاہتے کہ تم برا مانو۔ اسی لئے کچھ بتانا نہ چاہو تو ہم زور نہیں دیتے۔"

میمونہ بوا سے لپٹ گئی "کیسی باتیں کرتی ہیں بوا۔ میرا آپ کے سوا کون ہے۔ آپ ہی سب کچھ ہیں میری۔ ماں، باپ، بہن بھائی ... میری تو پوری فیملی آپ ہیں۔ میں آپ سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں بے پایاں محبت تھی "وہ سرمد بھائی ایک غزل گاتے تھے نا 'ہمیشہ' میں وہی سن رہی تھی۔ وہ ٹیپ ہے میرے پاس۔"

انا بوا کا دماغ جیسے ایک دم سے روشن ہوگیا۔ اسی لئے تو آواز مانوس سی لگ رہی تھی۔ پہچانی اس لئے نہیں گئی کہ برسوں بعد سنی تھی وہ آواز۔ اور پھر آواز دھیمی بھی بہت تھی۔ ہاں، وہ سرمد کی جانی پہچانی آواز ہی تو تھی۔ سرمد کی آواز .... اور مونا کے کمرے میں!

بوا کی نظروں کے سامنے کی دیوار میں جیسے جادو کے زور سے کوئی دروازہ کھل گیا۔ ان کی سمجھ میں جیسے خودبخود ہی سب کچھ آگیا۔ تمام اسرار کھل گئے۔ انہوں نے خیالوں میں اپنا سر پیٹ لیا۔ بعض اوقات سامنے کی نہایت واضح چیز بھی نظر نہیں آتی۔ جیسے آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہو۔ وہ حیران ہوتی تھیں کہ بٹیا کو اختر کیوں نظر نہیں آتا۔ اب سمجھ میں آرہا تھا کہ ایسا کیوں تھا۔ نظروں میں سرمد میاں کی تصویر تھی تو اختر بے چارہ کیسے نظر آتا۔

بوا، سرمد کے متعلق میمونہ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن اس کے مزاج سے انہیں ڈر لگ رہا تھا۔ جو لڑکی اتنی گہری ہو کہ برسوں محبت کی خوشبو کو یوں اپنے اندر چھپا کر رکھے کہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دے، وہ یہ کب پسند کرے گی کہ اس کا بھرم کھل جائے اور اس سے اس موضوع پر بات کی جائے۔ پھر وہ بہت نازک اور حساس بھی تھی۔ بوا نے ہمیشہ اسے پھولوں کی، آئینوں کی طرح برتا تھا۔ وہ اس کا ٹوٹنا گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے تفتیش کے ارادے کو اندر ہی اندر گھونٹ لیا۔

"سرمد میاں ہمیں بھی بہت یاد آتے ہیں۔" انہوں نے سرد آہ بھر کر آہستہ سے کہا "ہمیں بھی بہت محبت ہے ان سے۔" انہوں نے لفظ بھی' پر خصوصاً" زور دیا اور اس دوران میں میمونہ کو بہت غور سے دیکھتی رہیں۔ میمونہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"وہ ہیں ہی ایسے۔" میمونہ نے والہانہ لہجے میں کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کیسا راز کھولنے والا جملہ بول گئی ہے۔

بوا نے ہر لفظ غور سے سنا۔ میمونہ نے' وہ تھے ہی ایسے' نہیں کہا تھا' ہیں ہی ایسے کہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں کی چمک اور لہجے کا والہانہ پن گواہی دے رہا تھا کہ بوا نے حقیقت کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے "ہم تو ہر سانس کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ سرمد میاں لوٹ آئیں۔" وہ بولیں "اور اب تو اور شدت سے دعا کریں گے۔"

میمونہ ان کے دوسرے جملے کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکی "میں بھی بہت دعا کرتی ہوں بوا۔" اس نے کہا۔

بٹیا' ذرا ہمیں بھی وہ غزل سنوا دو۔" بوا نے التجا کی "آواز تو سن لیں ان کی۔"

میمونہ نے پلیئر آن کر دیا۔

چند لمحے بعد فضا میں سرمد کی آواز گونج رہی تھی۔ چراغ طور جلاؤ' بڑا اندھیرا ہے۔ انا بوا کے کان سرمد کی آواز پر لگے تھے۔ اور نظریں میمونہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ میمونہ کے چہرے کے تاثرات نے ان کے اندازے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ وہ محبت بھری نظروں سے میمونہ کے چہرے کو تکتی رہیں۔ ان کے ذہن میں اس لمحے بس ایک خیال تھا۔ مونا بٹیا' سرمد میاں سے محبت کرتی ہے۔

اس لمحے دل کی گہرائیوں سے ایک دعا ابھری اور ان کے لبوں پر آ گئی۔ دھڑکنوں میں سما گئی۔ "اے اللہ' سرمد میاں کو آج ہی بھیج دے۔"



میمونہ کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ ٹائم پیس میں وقت



تو درکنار ٹائم پیس ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے خیال میں ابھی رات ہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن احساس ہوا کہ وہ نیند پوری کر چکی ہے۔ اب سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔

کئی کروٹیں بدلنے اور سونے میں ناکامی کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے سمجھنے کی کوشش کی کہ اس طرح جاگنے کا سبب کیا ہے مگر اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ دل پر گھبراہٹ سی ہے۔ لیکن وہ پریشانی والی گھبراہٹ نہیں تھی۔ بس ایک بے کلی سی تھی۔ اس کے علاوہ ہیجانی کیفیت بھی تھی۔ ایکسائٹ منٹ تھا' جیسے توقع ہو کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے' اس کے متعلق اس کے پاس کوئی قیاس بھی نہیں تھا۔

جب اسے اندازہ ہوگیا کہ اب وہ سو نہیں سکے گی تو وہ بستر سے اتر آئی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پردے سمیٹے۔ اور حیران رہ گئی۔ پردے سمٹنے سے پہلے کمرے کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ابھی رات ہی ہے لیکن باہر تو دن نکلا ہوا تھا۔ دھوپ اگرچہ ابھی بہت نرم تھی پھر بھی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ سورج طلوع ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔ اس نے کھڑکی کھول کر ایک گہری سانس لی۔ تازہ ہوا نے جیسے سینے کو روشنی سے بھر دیا۔ تازگی کا وہ احساس بہت خوش کن تھا۔

اس نے پلٹ کر ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ چھ بجنے والے تھے۔ وہ بوکھلا گئی۔ اس وقت تو وہ ان دنوں میں بھی نہیں اٹھ پاتی تھی' جب اسکول کھلا ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کا جی چاہتا تھا اور وہ سونے سے پہلے چھ بجے کا الارم بھی لگاتی تھی مگر وہ الارم بھی اسے جگانے میں ناکام رہتا تھا اور گرمی کی چھٹیوں میں تو اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ صبح ہوتی کس وقت ہے۔ یہی اس کی اس وقت کی بوکھلاہٹ کا سبب تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ صبح چھ بجے اتنی دھوپ کیسے ہو سکتی ہے۔

باتھ روم سے نکل کر وہ لان کی طرف جا رہی تھی کہ بوا سے سامنا ہو گیا۔ بوا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ارے۔ اتنی صبح اٹھ گئیں بٹیا۔" ان کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

"جی بوا۔ بس آنکھ کھل گئی۔ پھر نیند ہی نہیں آئی۔ سوچا' لان میں ٹہل لوں۔"

"ہم ناشتہ بناتے ہیں۔ تم ٹہل آؤ۔"

لان میں وہ پھرتی پھری۔ بہت اچھا لگ رہا تھا مگر ایک خلش سی تھی' جو ستا رہی تھی۔ موہوم سا احساس ہو رہا تھا کہ وہ بے سبب بیدار نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور کوئی بہت اہم دن ہے مگر اس کی اہمیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بوا کے آواز دینے پر وہ ناشتے کے لئے اندر گئی۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں کیلنڈر پر نظر پڑتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ اوہ--- تو یہ بات ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ آج پانچ جون ہے۔ پانچ جون! اس نے کیلنڈر پر اس تاریخ کے گرد سرخ دائرہ بنا رکھا تھا۔

اس کی خلش دور ہو گئی اور اس کی جگہ پریشانی نے لے لی۔ آج اختر کی دی ہوئی مہلت ختم ہو رہی تھی۔

چند لمحے وہ پریشان بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ جب وہ فیصلہ کر ہی چکی تو پریشانی کیسی؟ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ پریشانی اسے اختر کے الٹی میٹم کے حوالے سے نہیں ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اس کے اپنے اندر کے الٹی میٹم کے تحت یہ اس کی عبادت جیسی محبت کی آخری آزمائش کا دن ہے۔ حالانکہ آزمائش کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ اپنی محبت سے وہ خوب واقف تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ آج اس کی محبت سرخرو ثابت ہو۔ اس کے لئے وہ مسلسل دعا بھی کرتی رہی تھی۔ بے شک' عزت اللہ کی عطا ہی ہوتی ہے۔

آج آپ، کو آنا ہے۔ آج آپ کو آنا ہوگا سرمد بھائی! اس نے خود کلامی کی۔

وہ اٹھی اور بوا کے پاس پہنچ گئی "بوا" آج تو جی چاہ رہا ہے کہ کھانے میں اہتمام کیا جائے۔" اس نے کہا۔

بوا تو نہال ہو گئیں "کیوں نہیں بیٹا' جو تم کہو۔"

"بریانی' شامی کباب' کوفتے اور بگھارے بینگن۔" میمونہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میٹھے میں انڈے کا حلوا اور شاہی ٹکڑے۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے بٹیا۔" بوا نے کہا لیکن ان کا دل کٹنے لگا۔ یہ سب چیزیں سرمد میاں



کی پسند کی تھیں "ہو جائے گا۔ ہم آم بھی لے آئیں گے۔" انہوں نے خود سے اضافہ کیا۔ میمونہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

چند لمحے وہ اپنے ڈراور اور آپی کی الماری کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر پلیئر آن کیا۔ کمرے کی محدود فضا میں سرمد کی آواز گونج اٹھی۔ پھر اس نے ڈراور کھولی اور اس میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سب سے پہلے اس نے ہونٹوں کے نقش والا کاغذ نکالا اور ہونٹوں کے نقش سے چپکے ہوئے غیر مرئی لمس کو گھورتی رہی۔ آج آپ کو آنا ہی ہوگا' وہ نقش پر جھکتے ہوئے بڑبڑائی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے نقش پر ہونٹ رکھ دیئے۔

دیر تک وہ یونہی کھڑی رہی۔ سرمد کی آواز گنگنا رہی تھی۔ میرے قریب نہ آؤ' بڑا اندھیرا ہے۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نقش والے کاغذ کو صندوقچی میں رکھ کر اس نے پریوں والی کتاب نکالی۔ اس کی ورق گردانی کرتے اور سوکھے ہوئے پھولوں سے گزرتی وہ آپی کے بالوں تک پہنچی۔ پھر سرمد کے بال کو دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ بڑبڑائی' آج آپ کو آنا ہی ہوگا' یہ جیسے کوئی تنویمی مشورہ تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ کامیاب بھی رہے گا۔ سرمد جہاں بھی ہوگا' اس کی پکار سنے گا اور اس بازگشت کی ڈور سے بندھا' کھنچا چلا آئے گا۔

گھڑی دیکھ کر وہ چونکی۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ بات ہی حیرت کی تھی۔ صبح وہ اتنی جلدی اٹھی اور اس نے کچھ کیا بھی نہیں۔ دوپہر ہو گئی اور پتا بھی نہیں چلا۔ ابھی اس کا کمرے سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ نہ جاتی تو بوا دوپہر کے کھانے کے لئے بلانے آ جاتیں۔ چنانچہ وہ خود ہی چلی گئی۔

کھانا کھا کر کمرے میں واپس آئی تو اس نے پلیئر دوبارہ آن کیا اور آپی کی ڈائری لے کر بستر پر دراز ہو گئی۔ ڈائری پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ گئی۔ رات کی نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے خبر سو گئی۔

بوا کھانے کے سلسلے میں اس سے کچھ پوچھنے آئیں۔ انہوں نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اندر سے سرمد کی آواز آ رہی تھی۔ بوا کا دل بوجھل ہو گیا

"اے اللہ' میری بچی کو خوشیاں عطا فرما۔" انہوں نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔ "یہ ہمیشہ خوشیوں سے محروم رہی ہے۔ اب اس کے دن پھیردے۔"

انہوں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ جواب نہ ملا تو وہ لوٹ آئیں۔ جو وہ پوچھنا چاہ رہی تھیں' وہ اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔



اس پورے دن بس بوا تھیں اور ان کی تنہائی لیکن مصروفیت کی وجہ سے وہ تنہائی انہیں اتنی بری نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کھانے کے اہتمام میں لگی ہوئی تھیں۔ کام بھی کم نہیں تھا۔

اس روز بوا نے کسی سے بھی بات نہیں کی۔ نہ کسی دیگچی سے' نہ چولھے سے۔ وہ بس اللہ سے باتیں کرتی رہیں۔ سرمد کی واپسی کی دعا کرتی رہیں "آپ نے ہم سے سب کچھ لے لیا۔ ہم نے شکایت نہیں کی کہ سب آپ کی امانت ہے۔" وہ اللہ سے کہہ رہی تھیں "پھر آپ نے ہمیں یہ گھر دیا۔ اس گھر اور اس کے لوگوں کی محبت دی۔ ہم ہر سانس کے ساتھ اس پر آپ کا شکر ادا کرتے رہے۔ ہم نے آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ سب کچھ آپ خود ہی دے دیتے ہیں پھر یہ گھر اجڑا۔ کچھ کو آپ نے واپس بلالیا۔ باقی سب بکھر گئے۔ ارشد میاں ایسے گئے کہ کبھی کبھار کے خط کے سوا کوئی آسرا ہی نہ رہا۔ بس مونا بٹیا رہ گئی ہمارے پاس۔ ہم آپ کا شکر ادا کرتے رہے۔ اب ایک عمر ہوگئی بٹیا کو ناخوش دیکھتے ہوئے۔ اس بار آپ نے بن مانگے کچھ نہیں دیا۔ سو آج مانگ رہے ہیں۔ ہماری مونا کو سچی خوشیاں دے دیجئے۔ وہ خوشیاں دے دیجئے' جو وہ مانگتی ہے۔"

کہتے کہتے وہ رکیں اور انہوں نے کچن سے باہر دیکھا "ارے۔ دھوپ اترنے لگی۔" وہ بڑبڑائیں "چائے بنانے کا وقت ہوگیا۔"

چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر وہ میمونہ کے کمرے کی طرف گئیں۔ دروازہ اب بھی لاک تھا۔ کمرے میں اب کوئی آواز نہیں تھی۔ تین چار بار انہوں نے ہلکی سی دستک دی۔ جواب نہ ملا تو انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ نہ ہی



میمونہ نے کوئی جواب دیا۔ کم از کم وہ یہی کہہ دیتی کہ بوا' مجھے ڈسٹرب نہ کرو لیکن وہاں تو کوئی آواز ہی نہیں تھی۔

بوا کا دل گھبرانے لگا۔ الٰہی خیر..... الٰہی خیر... وہ زیر لب دہراتی رہیں اور دروازہ پیٹتی رہی۔

بالآخر اندر سے میمونہ کی نندا سی آواز سنائی دی "کیا بات ہے بوا؟"

بوا نے سکون کی سانس لی۔ اسی لمحے میمونہ نے دروازہ کھول دیا۔ بوا نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سوتے سے اٹھی تھی۔ آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بوا؟"

"چائے کا کہنے آئے تھے پانچ بج گئے ہیں۔" بوا نے کہا۔ انہیں اس وقت افسوس ہو رہا تھا کہ خوامخواہ میمونہ کی نیند خراب کی۔ رات کو تو وہ دیر سے سوتی ہی ہے۔ آج صبح بھی جلدی ہی اٹھ گئی تھی۔

"پانچ بج گئے!" میمونہ نے حیرت سے کہا اور پلٹ کر گھڑی میں وقت دیکھا "آپ نے اچھا کیا کہ جگا دیا۔" بوا پلٹ کر جانے لگیں تو اس نے پکارا "بوا!" پھر لہجے میں التجا بھرتے ہوئے بولی "مجھے چائے یہیں دے دیجئے۔"

بوا پلٹ کر مسکرائیں اور بولیں "یہ کون سی بڑی بات ہے' جو اتنا گھبرا کر کہہ رہی ہو۔"

پانچ منٹ بعد بوا چائے لے آئیں۔ میمونہ نے کہا "اب میں نہا دھو کر کپڑے بدلوں گی۔ بوا کھانے کے وقت تک مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے گا۔"

"ہم کب ڈسٹرب کرتے ہیں تمہیں۔ خود ہی ڈسٹرب ہوتے رہتے ہیں۔" بوا نے بھنا کر کہا۔

چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے میمونہ سوچتی رہی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ صبح سویرے اٹھنے کے باوجود اس دن کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ انتظار کے دن کا تو ایک ایک لمحہ بھاری ہوتا ہے۔ یہ خیال مایوسی سی لاد دینے والا تھا۔ دن کا آسانی سے گزرنا تو یہ بتاتا ہے کہ یہ انتظار کا دن تھا ہی نہیں۔

لیکن وہ دن واقعی عجیب تھا۔ اس کے اندر یقین اور خود اعتمادی کی روشنی اتنی

زیادہ تھی کہ یہ مایوس کن خیال اندھیرا کرنا تو درکنار' روشنی کو کم بھی نہیں کر سکا۔ اس نے سوچا' جس نے انتظار کے ہزاروں دن کرب سہا ہو' اس کی آخری دن کی مشکل تو اللہ آسان کر ہی دیتا ہے۔

چائے کی پیالی خالی کرکے اس نے ایک طرف رکھی۔ پھر اس نے بڑھ کر آپی کی الماری کھولی۔ اس میں سے اس نے وہ جوڑا نکالا' جو منسلک پرچی کے مطابق آپی نے اس روز پہنا تھا' جب انہوں نے سرمد بھائی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ساتھ ہی وہ خوشبو بھی رکھی تھی' جو آپی نے اس روز لگائی تھی۔

وہ کپڑوں پر استری کرکے نمٹی تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو بال سلجھانے کی غرض سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ آئینے میں اس نے اپنے عکس کو دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی حسین ہے۔

برسوں مردوں کی توجہ سے بچنے کے لئے وہ خود کو ایک بے حد معمولی لڑکی ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اپنے متعلق دوسروں کو کسی بات کا یقین دلانے میں یہ تو ہوتا ہی ہے کہ پہلے خود اس بات پر پوری طرح یقین کرنا پڑتا ہے۔ ان برسوں میں اس نے دل سے تسلیم کرلیا تھا کہ وہ ایک معمولی اور بے کشش لڑکی ہے۔ اسی لئے آئینے نے اس وقت اسے حیران کر دیا تھا۔

چند لمحے وہ خود کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے شرما کر نظریں جھکالیں۔ ذرا نظریں اٹھا کر دیکھا تو رخسار فرط حیا سے دہک رہے تھے۔

اس کی بے توجہی کے باوجود اس کے بالوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی بے حد لمبے اور گھنے تھے۔ انہیں سلجھانے اور چوٹی باندھنے میں بہت وقت لگا۔ برسوں بعد اس نے بالوں کو اتنا وقت دیا تھا۔

اس نے ہلکا سا میک اپ کیا اور مطمئن ہو کر سرہلایا لیکن اس کی نظروں سے حیرانی چپک کر رہ گئی تھی۔ پچھلے عرصے میں اس نے عمر اوڑھنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور خود کو اپنی عمر سے بہت بڑا سمجھنے لگی تھی لیکن اس وقت آئینے میں اس کے سامنے ایک نوخیز لڑکی کا چہرہ تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم لگ رہی تھی۔



وہ اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔ سفید کام دار کرتہ سفید ساٹن کا تنگ پاجامہ اور چنا ہوا دوپٹا۔ دیکھتے دیکھتے اچانک اس کے چہرے پر آپی کا چہرہ ابھر آیا۔ اسے آپی کا لباس نہیں تھا۔ اس نے آپی کو یہ لباس پہنے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دن اس کی یادداشت میں نہیں تھا' جب سرمد بھائی نے پہلی بار آپی کو دیکھا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وقت آج پھر اس منظر کو دہرانے والا ہے۔ آج وہ آپی ہے۔ آج سرمد بھائی اسے پہلی بار دیکھیں گے۔

اسے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ بے حد ناممکن بات سوچ رہی ہے۔ جسے گئے ہوئے اٹھارہ برس ہوگئے۔ جس نے کبھی اپنی خیریت کی خبر بھی نہیں بھیجی۔ جو اتنے برسوں میں کبھی پلٹ کر نہیں آیا' اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ واپس آئے گا۔ اور وہ بھی آج ہی۔

لیکن نہیں۔ اس کے پاس ضمانت موجود تھی۔ وہ پراعتماد قدموں سے ڈراور کی طرف بڑھی۔ دراز کھول کر اس نے پریوں والی رنگین کتاب کھولی اور اس میں سے سرمد کا بال نکال لیا۔ پھر اس نے ڈراور پر رکھی ہوئی شمع کو روشن کیا اور بال کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ "آج آپ کو آنا ہی ہوگا" وہ بڑبڑائی۔

چند لمحے وہ بال کو شمع کی لو کے سامنے رکھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بال کو بڑھا کر اوپر رکھ دیا۔ بال ایک ثانیے میں چرمرا کر رہ گیا۔ فضا میں ہلکی سی چراند پھیل گئی۔

میمونہ مڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے پر تھیں۔ وہ ساکت وصامت تھی۔ وہ سانس بھی بہت دھیرے دھیرے لے رہی تھی۔ اس ڈر سے کہ سانسوں کے شور میں آنے والے کے قدموں کی چاپ سننے سے محروم نہ رہ جائے۔ درحقیقت اس لمحے وہ سحر زدہ تھی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح استادہ تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک ہی اس سحر کو توڑ سکتی تھی۔

اور اگر دستک نہ ہوئی تو؟ اس کے دل میں خیال آیا۔ تو میں یہیں کھڑی رہوں گی۔ قیامت تک ہل بھی نہیں سکوں گی۔ ذہن نے جواب دیا۔

"لیکن ایسا نہیں ہوگا۔" دل نے یقین دلایا۔

پانچ منٹ ہوگئے۔ جیسے پانچ صدیاں گزر گئیں۔ دل پر مایوسی کی سیاہی کا پہلا قطرہ ٹپکا۔ اس سے پہلے کہ سیاہی پھیل کر پورے دل پر قبضہ کرتی، راہداری کی طرف سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

وہ ہمہ تن سماعت ہوگئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ قدموں کی چاپ مردانہ تھی۔ بھاری جوتوں والی۔ ورنہ وہ یہی سمجھتی کہ بوا آرہی ہیں۔ وہ .... وہ سرمد بھائی آگئے۔ اس کی دھڑکنیں خوشی سے چلائیں۔

"ہوسکتا ہے" اختر ہو۔ آج اس کی دی ہوئی مہلت بھی تو ختم ہو رہی ہے۔ بے اعتبار ذہن نے بدگمانی کی۔

اس نے اس خیال کو جھٹک دیا مگر وہ اب بھی ساکت و صامت تھی۔ سحرزدہ پتھر کی مورتی۔ اس نے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ صرف دستک ہی اسے اس سحر سے آزاد کرسکتی تھی۔ وہ بے بس کھڑی ہوئی تھی۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی!

اس کے پاؤں زمین کی گرفت سے آزاد تو ہوگئے لیکن پیر اب بھی من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ لپک کر جائے اور جلدی سے دروازہ کھول دے لیکن قدم بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ وہ اس بار دستک دینے والے کی بے صبری کی غمازی کر رہی تھی۔

ٹھیک تیسری دستک کے وقت میمونہ دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھولا اور وہ چہرہ نظر آیا!

وہ چہرہ سرمد کا تھا ... یا اختر کا ..... میمونہ کی آنکھوں میں جانے کہاں سے آنسوؤں کا سمندر اتر آیا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ زمین آسمان گھوم رہے تھے۔ کمرا گھوم رہا تھا۔ وہ چہرہ گھوم رہا تھا۔ نگاہیں اسے فوکس نہیں کر پارہی تھیں۔ وہ چہرہ آنسوؤں میں تیر رہا تھا۔ وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔

اچانک زمین آسمان کی گردش بہت تیز ہوگئی۔ اس کے لئے کھڑا رہنا ناممکن



تھا۔ وہ ایک طرف گرنے لگی۔ آخری احساس بس یہ تھا کہ آنے والے نے اسے گرنے سے پہلے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا ہے۔

اس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔



اس نے پورا بلاک چھان مارا تھا اور اب مایوس تھا۔ اتنے بڑے شہر میں پتے کے بغیر کوئی کسی کو کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔ اب وہ موٹر سائیکل کو اس سڑک پر دوڑا رہا تھا، جو آگے جاکر مین روڈ سے جاملتی تھی۔

وہ تھک بھی بہت گیا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ ہوٹل جاکر آرام کرے۔ اس تھکن میں مایوسی کا بہت دخل تھا۔

اچانک موٹر سائیکل دھچکے لینے لگی۔ اس نے پر تشویش نظروں سے فیول انڈی کیٹر کو دیکھا۔ پیٹرول ختم ہوچکا تھا۔ اب ریزرو بھی جواب دے رہا تھا۔ یہ اور مصیبت ہوئی۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ پیٹرول پمپ نجانے کتنی دور ہو۔ اب نہ صرف پیدل چلنا پڑے گا بلکہ موٹر سائیکل کو بھی گھسیٹنا پڑے گا۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگا، جب اس نے اپنی کار چھوڑ کر موٹر سائیکل پر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"سر، آپ کے پاس تو گاڑی ہے۔ آپ موٹر سائیکل کا کیا کریں گے۔" زبیر نے حیرت سے کہا تھا۔

"دیکھو بھائی، مارے مارے پھرنے کے لئے موٹر سائیکل سے اچھی کوئی سواری نہیں۔" اس نے زبیر کو سمجھایا تھا۔ "کار تو ایسے میں بوجھ لگنے لگتی ہے۔"

زبیر نے موٹر سائیکل کی چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

یہ درست تھا کہ موٹر سائیکل بہت کام آئی تھی۔ یہ بڑی آسانی تھی کہ کسی بھی گلی میں گھس جاؤ۔ اب یہ اس کی حماقت تھی کہ اس نے پیٹرول کا خیال نہیں رکھا۔ سو حماقت کی سزا تو بھگتنی ہی پڑے گی۔

اس احساس نے تھکن کو اور بڑھا دیا کہ پیدل چلتے ہوئے موٹر سائیکل کو بھی گھسیٹنا پڑے گا مگر کیا کیا جاسکتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ موٹر سائیکل کو لات مار کر پھینکے

اور کوئی رکشا پکڑ کو ہوٹل چلا جائے لیکن یہ زبیر کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

قہراً" جبراً" وہ چل پڑا۔ بمشکل بیس قدم چلا ہوگا کہ ایک بورڈ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بورڈ پر لکھا تھا۔ دھنک اکیڈمی۔ نیچے تحریر تھا۔ ہم مستقبل کے معماروں کو مستقبل کے خواب دیتے ہیں۔ بورڈ پر تیر کا نشان بھی بنا تھا' جو اسی طرف اشارہ کر رہا تھا' جدھر وہ جا رہا تھا۔ یہ انداز لگانا مشکل تھا کہ دھنک اکیڈمی کیا چیز ہے۔

وہ آگے بڑھا۔ تجسس نے اس کی تھکن دور کر دی تھی۔ کوئی بیس میٹر آگے اسے ایک بنگلا نظر آیا۔ وہاں دھنک اکیڈمی کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ تب پتا چلا کہ وہ اسکول ہے۔ پرائمری اسکول' جہاں نرسری اور کے جی بھی ہے۔

اسے دن میں تجربہ ہوچکا تھا کہ گرمی کی چھٹیاں اس کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں۔ اسکولوں کی زیادہ تر عمارتیں خالی پڑی تھیں۔ اگر وہ دھنک اکیڈمی نہ ہوتی تو وہ اسے نظرانداز کرکے آگے بڑھ جاتا لیکن اب بڑھنا ناممکن تھا۔

اس نے موٹر سائیکل بنگلے کے گیٹ کے سامنے کھڑی کی اور دھڑکتے دل سے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔



کھانا تقریباً" تیار ہوچکا تھا۔ بریانی دم پر تھی۔ کباب تیار تھے۔ بس تلنا تھا انہیں۔ روٹی وہ پکا چکی تھیں۔ شاہی ٹکڑے آپ ہی آپ تیار ہو جاتے۔ انہیں تو بس پھولنا تھا۔ مگر بوا افسردہ تھیں۔ "یہ کھانا کون کھائے گا آخر؟" انہوں نے چولھے سے پوچھا۔ "اتنا سارا پکالیا اور آنے والا آیا بھی نہیں۔ اختر میاں ہی آجاتے۔"

اسی وقت گھنٹی بجی "لو .... وہ آہی گئے۔" انہوں نے شاہی ٹکڑوں کو مطلع کیا "صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ ادھر شیطان کا نام لو' ادھر وہ حاضر۔"

گھنٹی دوبارہ بجی تو انہیں خیال آیا کہ میمونہ تو اپنے کمرے میں بند ہے۔ دروازہ انہیں ہی کھولنا ہوگا۔" وہ تو کہہ چکی ہیں کہ کھانے سے پہلے انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ تم یہاں پڑے مفت کا کھاؤ پیو اور پھولتے رہو۔ ہم جاکر دیکھتے ہیں۔" انہوں نے بھنا کر شاہی ٹکڑوں کی خبرلی۔ پھر اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیں۔



دروازہ کھول کر انہیں مایوسی ہوئی۔ دروازے پر اختر نہیں' کوئی اجنبی تھا "جی فرمائیے۔" انہوں نے کہا۔

"جی ... مجھے اس اسکول کے منتظم سے ملنا ہے۔" دروازے پر کھڑے شخص نے ا۔

"مگر یہاں داخلے تو بند ہوچکے ہیں۔" بوا نے کہا اور دروازہ بند کرنے لگیں۔

"بات تو سنئے۔" اجنبی نے پکارا "مسئلہ داخلے کا نہیں۔ مجھے بس ان سے ملنا ہے۔"

"اسے یونہی ملنا ہے۔ جانتے بھی ہو انہیں؟"

"جانتا تو نہیں ہوں مگر بہت دور سے .... ہزاروں میل سے آیا ہوں۔ کسی کی تلاش ہے مجھے۔" اجنبی نے پرسوز لہجے میں کہا۔

بوا نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ باوقار مرد تھا۔ کنپٹیوں پر بال سفید ہوچکے تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ مونچھیں اس کی خوب روئی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ بلاشبہ وجیہہ تھا۔ "میاں' آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔ یہ تلاش گمشدہ کا دفتر نہیں۔"

مرد نظریں جھکا کر بات کر رہا تھا۔ بوا کی بات سن کر اس نے نظریں اٹھائیں۔ بوا کو اس کی نگاہوں میں التجا نظر آئی "اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں ...." اس نے جملہ پورا نہیں کیا۔ اچانک اس کی نگاہوں میں حیرت .... اور پھر مسرت کی چمک نظر آئی۔ وہ بوا کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"اے میاں' گھور کیوں رہے ہو ہمیں۔" بوا نے جھنجلا کر کہا۔

"اتنا حق تو ہمیں ہے نا بوا۔" اجنبی نے کہا۔ اس کی آواز اب لرز رہی تھی۔

بوا چونکیں۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا۔ آواز انہیں شروع سے ہی جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا غور سے دیکھا تو خدوخال بھی پکارنے لگے۔ وہ کچھ زیادہ بدلا نہیں تھا مگر مونچھوں نے اسے اجنبی بنا دیا تھا "تم .... تم ......؟" بوا ہکلائیں "ہاں' سرمد ہی ہو تم۔ آؤ اندر آجاؤ ...."

"میرے پاس بائیک بھی ہے بوا۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اندر لے آؤ۔"

وہ بائیک اندر لے گیا۔ بوا نے گیٹ بند کر دیا۔ وہ اسے مسلسل دیکھ رہ تھیں۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ انہیں پہچانتے ہی اس کی رنگت بدل گئی تھی۔ چہ سپید پڑ گیا تھا اس کا۔ جسم لرز رہا تھا۔ شاید یوں ملنا اس کے لئے توقع کے خلاف تھا۔

اسے کیا کہتیں۔ بوا کا اپنا حال بھی بہت برا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس سے لپ کر اتنا روئیں، اتنا روئیں کہ پوری دنیا ان کے آنسوؤں میں ڈوب جائے۔ لیکن انہیں آنسو روکنا خوب آتا تھا۔ زندگی اسی میں گزری تھی۔ حالت اگرچہ بہت بری تھی لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ انہیں تو اسے بھی ٹھیک کرنا تھا اور اس کا علاج سختی سے ہی کرنا تھا۔

بائیک کھڑی کر کے وہ ان کی طرف مڑا "بوا ..... بوا....." اس سے بولا نہیں جا رہا تھا "میں .... میں ....."

"میاں، پہلے تمہیں اس سے ملنا چاہیے، جس نے برسوں تمہارا انتظار کیا ہے۔" بوا نے ذرا سخت لہجے میں کہا "اور برسوں کے بعد واپس آنے کے آداب بھی ہوتے ہیں۔"

وہ ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"جو صورت لے کر گئے تھے، وہی لے کر واپس آنا چاہیے تھا۔" بوا کا لہجہ اب بھی سخت تھا "مگر تم تو وہ صورت لے کر آئے کہ ہم بھی تمہیں نہیں پہچان سکے۔ لمبے انتظار کے بعد آدمی وہی صورت دیکھنا چاہتا ہے، جو بچھڑی تھی۔ تم تو چہرے پر پورا جھاڑ اگا لائے ہو۔"

"معاف کیجئے گا بوا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" سرمد نے شرمندگی سے کہا۔

"یہ یاد رکھنا میاں، اس گھر کے لوگوں نے تم سے زیادہ دکھ اٹھائے ہیں۔ انہوں نے تو تمہارے دکھ بھی سہے ہیں۔"

"جانتا ہوں بوا۔" سرمد نے کہا۔ پھر وہ جانے کے لئے مڑا۔

بوا پریشان ہو گئیں "کہاں جا رہے ہو؟" وہ سمجھیں، سرمد کو ان کی بات بری لگی



"ریزر لینے۔" سرمد نے کھسیائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بوا وہیں کھڑی رہیں۔ دو منٹ بعد سرمد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریزر تھا ں بوا۔"

بوا اسے اندر لے گئیں۔ سرمد نے باتھ روم میں مونچھیں صاف کیں اور ا جھینپی نظروں سے بوا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو ٹھیک ہے؟"

"ابھی کہاں ٹھیک ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ہم سے تو تم ملے ہی نہیں۔ پہلے جا کر بٹیا ل لو۔ وہ ہے اس کا کمرا۔" بوا نے اشارے سے بتایا۔

"آپ بھی چلیں نا۔"

"نہیں بھئی۔ باورچی خانے میں پھیلاوا چھوڑ کر آئے ہیں۔ اسے سمیٹ کر ہیں۔"

سرمد راہداری میں چل دیا۔ "قبولیت کی گھڑی تھی" بوا بڑبڑائیں "آج تو جو ل جاتا۔ خدا کا شکر ہے۔ اس سے بہتر کچھ ہم مانگ بھی نہیں سکتے تھے۔" پھر وہ کی طرف چل دیں۔ راستے میں وہ مسکرائیں "تو یہ اہتمام کھانے کا بے سبب تھا۔" انہوں نے سامنے والی دیوار سے خوش ہو کر کہا۔

سرمد نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ نہیں کھلا تو چند لمحے بعد ہی اس نے ی دستک دی۔ وہ بہت بے تاب ہو رہا تھا۔ اٹھارہ برس دور رہنے والے سے اب لمحے بھی برداشت نہیں ہو رہے تھے۔

دروازہ اب بھی نہیں کھلا تھا۔ اس نے تیسری دستک دی۔ اس بار ہینڈل گھوما ہ کھلا اور وہ نظر آئی۔

سرمد اس منظر کو، اس کی پہلی دید کو کبھی نہیں بھول سکا تھا۔ بھول بھی نہیں تھا۔ وہ سفید کرتہ، جس پر موتیوں کا بہت خوب صورت کام تھا۔ سفید ساٹن کا پاجامہ، چنا ہوا دوپٹا، کانوں میں موتیوں کے آویزے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس نے ہ کی سی کیفیت میں سوچا۔ کیا اسے میری آمد کا علم تھا؟ یا یہ اتفاق ہے کہ اس نے

یہ لباس پہنا ہے۔ ارے۔ انہی کپڑوں میں تو میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ چونکا۔ اسے ان آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ پھر اس نے اسے جھولتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک طرف گرنے لگی۔ اس نے جھپٹ کر اسے بانہوں میں تھام لیا "شہلا .... شہلا' کیا ہو رہا ہے تمہیں؟" وہ اسے ہلا جلا رہا تھا لیکن وہ بے سدھ تھی۔

"بوا..... انا بوا...." وہ دروازے کی طرف رخ کر کے چلایا لیکن اس بات کا امکان نہیں تھا کہ بوا تک اس کی آواز پہنچ سکے گی۔ وہ اسے بیڈ کی طرف لے چلا۔ آہستگی سے اس نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

اسی لمحے بوا کمرے میں داخل ہوئیں۔ میمونہ کو اس حال میں دیکھ کر وہ ہڑبڑا گئیں "کیا ہوا میاں؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"شہلا بے ہوش ہوگئی ہے بوا۔ کچھ کریں۔" سرمد اب نیچے بیٹھ کر میمونہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے سہلا رہا تھا۔



بوا گھبرائی ہوئی تھیں۔ انہیں سرمد کی بات میں کسی غیر معمولی پن کا احساس تو ہوا لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکیں۔ باتھ روم میں جاکر وہ پانی لائیں اور میمونہ کے چہرے پر چھینٹے دینے لگیں "بٹیا رانی .... بٹیا ...." وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے پکار رہی تھیں۔

پہلا احساس جو اسے ہوا' وہ یہ تھا کہ جیسے وہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر سانس لی۔ اسے بوا کی آواز سنائی دی' بوا ہو اسے بٹیا کہہ کر پکار رہی تھیں۔ کوئی اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ پھر اسے وہ آواز سنائی دی' جسے سننے کو وہ ترس گئی تھی مگر وہ آواز کیا کہہ رہی تھی "شہلا' شہلا.... ہوش میں آؤ شہلا۔"

اسے حیرت ہوئی۔ یہ سرمد بھائی آپی کو کیوں پکار رہے ہیں۔

پانی میں ڈوبنے کا احساس پھر ابھر آیا۔ اس بار اس نے کوشش کر کے آنکھیں



کھول دیں۔ اسے بوا کا چہرہ نظر آیا۔ ان کی نگاہوں میں تشویش تھی اور وہ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھیں۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ سرمد بھائی فرش پر گھٹنوں بیٹھے اس کا ہاتھ سہلا رہے تھے۔ اسے ہوش میں دیکھ کر انہوں نے سکون کی سانس لی "شہلا .... تم ٹھیک تو ہو۔"

میمونہ کا دل ایک انجانی مسرت کی پھوار سے بھیگ گیا۔ سرمد بھائی آگئے تھے۔ ان کے جذبے کی صداقت ثابت ہوگئی تھی۔ اس کی محبت سرخ رو ہوگئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسے شہلا کہہ کر پکار رہے تھے۔

میمونہ کو ہوش آیا تو بوا پرسکون ہوئیں۔ ذرا سکون ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ سرمد ابتدا ہی سے میمونہ کو شہلا کہہ کر پکار رہا ہے۔ وہ اسے ٹوکتے ٹوکتے رہ گئیں۔ انہوں نے سوچا' میمونہ خاموش ہے تو وہ کیوں بولیں لیکن انہوں نے میمونہ کو غور سے دیکھا۔ وہ حیران ہوئیں کہ اس میں شہلا کی ذرا سی بھی مشابہت تو نہیں ہے۔ شہلا میں صاحب کی جھلک تھی۔ کچھ باجی کا رنگ بھی تھا۔ وہ بہت پیاری تھی لیکن میمونہ تو باجی کی تصویر تھی۔ اور بہت حسین تھی۔ پھر سرمد کو دھوکا کیوں ہو رہا ہے۔

"اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شہلا۔ میں آگیا ہوں۔" سرمد میمونہ کو دلاسا دے رہا تھا اور میمونہ مسکرا رہی تھی۔

"مونا بٹیا' تیار ہو کر باہر آجاؤ۔ ہم کھانا لگا رہے ہیں۔" بوا نے بڑی نزاکت سے سرمد کو احساس دلایا۔ پھر وہ سرمد کی طرف مڑیں "سرمد میاں' تم بھی چل کر ہاتھ منہ دھو لو۔"

سرمد کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس نے ایک نظر میمونہ کے چہرے پر ڈالی اور نظریں جھکالیں "ٹھیک ہے بوا۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

تینوں کھانے کی میز پر یکجا ہوئے "یہ .... کھانے کا اتنا اہتمام۔" سرمد نے حیرت سے کہا "کوئی آنے والا ہے؟"

"جی نہیں۔ آچکا ہے۔" میمونہ نے شوخ لہجے میں کہا۔ بوا خوش ہوگئیں۔ پہلی

بار اس کی چہکتی ہوئی آواز سن رہی تھیں۔

اس وقت کال بیل بجی۔ بوا نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ اختر میاں ہوں گے۔" وہ گیٹ کی طرف چل دیں۔

"یہ تو سبھی میری پسند کی چیزیں ہیں۔" سرمد بولا۔

"یہ اہتمام آپ ہی کے لئے کیا گیا ہے۔" میمونہ نے کہا۔

"سرمد نے حیرت سے اسے دیکھا "تمہیں کیسے پتا تھا کہ میں آرہا ہوں۔"

"پتا تو نہیں تھا۔ ہاں یقین تھا کہ آج آپ کو آنا ہے۔ کبھی کبھی دعا کی قبولیت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔"

سرمد کچھ کہتا' کچھ پوچھتا مگر اسی لمحے بوا اختر کو ساتھ لئے آگئیں۔ اختر سرمد کو دیکھ کر بت بنا رہ گیا۔ بوا نے کہا "یہ سرمد میاں ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں۔ انہیں جانتے ہو اختر میاں؟"

"تذکرہ تو بہت سنا ہے ان کا۔ ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔" اختر نے کہا اور بڑھ کر سرمد سے ہاتھ ملایا "بہت خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر.... اور میں یہ رسماً نہیں کہہ رہا ہوں۔ خصوصاً" آپ کی آج آمد کی بہت ہی خوشی ہے۔"

"شکریہ۔" سرمد نے کہا۔

"سرمد بھائی .... یہ اختر ہیں .... چھوٹے چچا کے بیٹے۔" میمونہ نے تعارف کرایا "چلو اختر۔ شروع ہو جاؤ۔"

کھانے کے دوران میں اختر نے سرمد سے کہا "آپ بہت خوش نصیب ہیں سرمد بھائی۔ بہت لوگوں نے بہت بے تابی سے آپ کا انتظار کیا ہے۔"

"میں اللہ کا شکرگزار ہوں اس خوش نصیبی پر۔"

"آپ اتنا عرصہ رہے کہاں؟"

"کینیڈا چلا گیا تھا۔ پندرہ برس کے بعد کل ہی واپس آیا ہوں۔"

سرمد ہاتھ دھونے کے لئے اٹھا اور بوا گرم بریانی لانے کے لئے کچن میں گئیں تو اختر' میمونہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "بہت بہت مبارک ہو کزن میمونہ۔"

میمونہ نے سر اٹھا کر اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔



"میں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دے رہا ہوں۔" اختر بولا "میں تمہیں ں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہے۔ اب میں تمہیں دکھاؤں گا کہ مجھے کتنی محبوب ہو۔ میں کتنا اچھا دوست ہوں تمہارا۔"

میمونہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں ایک ہفتے بعد شادی کررہا ہوں۔ اگرچہ میں اس لڑکی سے محبت نہیں کرتا ں میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ یوں تم پر کوئی دباؤ ں رہے گا۔"

میمونہ نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اختر نے اسے ل دیا "کچھ مت کہو۔ میری نیک تمنائیں اور دلی دعائیں تمہارے ساتھ رہیں ۔"

اسی لمحے سرمد واپس آگیا پھر بوا بھی آگئیں۔

کھانے کے بعد بوا نے کہا "تم لوگ لان میں چل کر بیٹھو .... ہم چائے لے کر تے ہیں۔"

وہ سب لان میں چلے گئے۔ وہاں بے حد خوشگوار خنکی تھی۔ "آپ یہاں تک کیسے؟" اختر نے سرمد سے پوچھا "پتا تھا آپ کے پاس۔"

"نہیں بھئی۔ یہ تو معجزہ ہوا ہے۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو پرانے پر گیا تھا۔ وہاں سے بہت کچھ معلوم ہوا۔ دل بوجھل ہوگیا۔ مونا کے متعلق بس یہ علوم ہوسکا کہ یہ این بلاک میں کوئی اسکول چلا رہی ہیں ..."

"تو آپ کہتے ہیں کزن میمونہ کو مونا؟" اختر نے اچانک کہا۔ میمونہ کا چہرہ تمتما

"کیا ... کیا مطلب؟" سرمد گڑبڑا گیا۔

"کچھ نہیں۔ میری بکواس کی عادت ہے۔ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ ہاں آپ کیا کہہ ہے تھے۔"

"یہی کہ پورے دن میں این بلاک کا ایک ایک اسکول ٹٹولتا پھرا۔ یہاں تک کہ ک کا پٹرول ختم ہوگیا۔ مایوسی کے عالم میں بائیک گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا کہ دھنک

اکیڈمی کا بورڈ نظر آیا۔ اس نام نے مجبور کیا کہ یہاں بھی ٹرائی کروں ورنہ ہمت جواب دے گئی۔ بیل دی تو بوا آئیں اور بس ...“

”گویا فلمی کہانی ہوگئی۔“ اختر نے تبصرہ کیا۔

بوا چائے لے آئی تھیں۔ چائے پینے کے دوران میں اختر نے سرمد سے پوچھا ”تو آپ کی بائیک پٹرول سے محروم کھڑی ہے؟“

”دیکھا جائے گا۔“ سرمد نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

چائے پیتے ہی اختر اٹھ کھڑا ہوا ”سرمد بھائی، جی تو چاہتا تھا کہ آپ کے پاس بیٹھوں اور باتیں کروں لیکن مصروفیت ہے۔ اگلے ہفتے میری شادی ہو رہی ہے۔“

اوہ .... مبارک ہو بھئی۔“

”شکریہ ۔ بھائی، مختصر سی تقریب ہوگی۔ چند احباب ہوں گے ... اور گھر کے لوگ .... یہ گھر بھی میرا گھر ہے اور آپ بھی میرے اپنے ہیں ... ضرور آیئے گا۔“

”کیوں نہیں۔“

”اور گھر واپسی پر دلی مبارک باد۔ آپ تو اب یہیں ہوں گے؟“

سرمد نے چونک کر اسے دیکھا لیکن اس کے چہرے پر خلوص ہی خلوص تھا۔

”اب چلتا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سرمد نے خود کلامی کے انداز میں کہا ”اچھا لڑکا ہے ... بے حد خلوص والا۔“

بوا باورچی خانہ سمیٹنے کے لئے چلی گئیں۔ سرمد اور میمونہ اکیلے رہ گئے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ میمونہ کو وہ خاموشی بوجھ لگنے لگی ”آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں سرمد بھائی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہوٹل میں۔“ سرمد نے مختصراً کہا۔

”گھر ہوتے ہوئے؟“ میمونہ نے شکایت کی۔

”گھر ہی تو تلاش کر رہا تھا۔“ سرمد کے لہجے میں افسردگی تھی ”مگر مجھے اپنا گھر کبھی ملا ہی نہیں۔“

”آپ ابھی جاکر ہوٹل سے سامان لے آئیں۔ اب میں آپ کو کہیں نہیں



انے دوں گی۔“

”صبح دیکھیں گے۔ اس وقت تو بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”نہیں سرمد بھائی .... ابھی ... اسی وقت۔ اتنی دیر میں میں آپ کے لئے کمرا یک کردوں گی۔“

اسی لمحے اطلاع گھنٹی بجی ”میں دیکھتا ہوں۔“ سرمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میمونہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا، کوئی خواب کھ رہی ہے۔ بے یقینی نے غالباً اسے شادی مرگ سے بچالیا تھا۔ حالانکہ دن بھر سے یقین رہا تھا کہ سرمد آئے گا اور اب وہ آیا تھا تو اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ یسا یقین اور کیسی بے یقینی! اس نے سوچا۔

سرمد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پٹرول کا ٹن تھا ”بھئی یہ اختر بھی خوب ہے۔ ٹرول لاکر دے گیا۔ پیسے بھی نہیں لئے۔ بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”چلیں .... آپ کو ہوٹل جانے میں آسانی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آؤں گا۔“ سرمد پٹرول کا ٹن لئے س طرف چلا گیا، جہاں اس کی بائیک کھڑی تھی۔ ذرا دیر بعد میمونہ نے موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر وہ اندر چلی گئی۔



سرمد کے لئے کمرا ٹھیک کرتے ہوئے میمونہ کو ایسا ہی ایک اور دن یاد آگیا۔ ب خالہ جان کے انتقال کے بعد سرمد بھائی ان کے ہاں رہنے کے لئے آرہے تھے۔ ی روز تو اس نے آپی سے کہا تھا کہ وہ ایک دن سرمد بھائی کی دلہن بنے گی۔

کمرے کی صفائی کے دوران میں اس نے خود کو، اپنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش ی۔ سرمد کی واپسی اس کی زندگی کا اہم ترین موڑ تھی۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش! مگر تنی نہیں، جتنا ہونا چاہیے تھا۔ کیوں؟ شاید وہ خوف زدہ تھی۔ ایک ناموجود شخص کی بت میں زندگی تمام کردینا تکلیف دہ ضرور ہوتا ہے مگر مشکل نہیں ہوتا لیکن اب جبکہ رمد واپس آگیا تھا تو اسے یہ پریشانی لاحق ہوگئی تھی کہ وہ اس سے محبت کیسے کرسکے

گا۔ وہ اسے کیسے قبول کرے گا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔

اسے یاد تھا۔ اس نے آپی سے بھی یہی کہا تھا مگر آپی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کام خود بخود ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ سرمد ان سے زیادہ اسے چاہے گا۔ اور یہ کہ وہ سرمد کو سمجھا دیں گی۔

یہ سب باتیں اس وقت تک تسلی بخش تھیں، جب تک سرمد کے آنے کا امکان بھی نہیں تھا مگر اب سرمد جیتی جاگتی حقیقت بن کر آگیا تھا تو آپی کی بات طفل تسلی، ریت کا گھروندا محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بات ابھی اسے امید دلا رہی تھی۔ سرمد نے اسے شہلا کہہ کر پکارا تھا۔ حالانکہ وہ آپی سے مشابہ نہیں تھی مگر سرمد بھائی کو اس میں ان کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ بات امید افزا تھی۔

لیکن ایک زاویئے سے یہی بات مایوس کن بھی تھی۔ سرمد بھائی کے دل سے آپی نہیں نکلی تھیں .... نکلیں گی بھی نہیں .... گویا اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

چھوڑو اس بات کو۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ میرے پاس ہیں۔ میں ان کو دیکھ سکتی ہوں۔ ان سے باتیں کرسکتی ہوں۔ مجھے کوئی الجھن نہیں ہے۔ پہلے بغیر امکان کے انتظار کرتی رہی ہوں۔ اب تو صورت حال بہتر ہے۔ کون جانے۔ وقت تو ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔" اس نے الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا۔



سرمد ہوٹل سے سامان لے آیا تھا۔ کمرا اسے بے حد اپنا اپنا لگ رہا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا، جہاں اس نے گرتی ہوئی میمونہ کو سنبھالا تھا۔ گویا میمونہ نے اپنا کمرا اسے دے دیا تھا۔ اسے یہ احساس ستانے لگا کہ وہ باعث زحمت بن رہا ہے۔

اس نے یہ بات میمونہ سے بھی کہی تھی "کیسی بات کرتے ہیں۔" میمونہ نے خفگی سے کہا تھا۔ "آپ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ میرے لئے یہ کتنی بڑی خوشی ہے۔ یہ تصور کہ آپ میرے کمرے میں رہ رہے ہیں، بہت اچھا لگتا ہے۔"



لیکن سرمد بہت الجھا ہوا، بہت کھسیایا ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ بہت ساری باتیں کرے گا۔ کتنی تو تعزیتیں کرنی تھیں۔ آنسو پونچھنے تھے مونا کے۔ اس سے اٹھارہ برسوں کی کہانی سننا تھی لیکن وہ شروع ہی میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے مونا کو شہلا سمجھا کیسے۔ اگرچہ اس پر ردعمل نہ مونا نے ظاہر کیا تھا نہ بوا نے لیکن یہ بات دونوں کو ناگوار .... اور ناگوار نہیں تو عجیب ضرور لگی ہوگی۔ اب اس سلسلے میں کیسے صفائی پیش کرے۔

وہ اسی الجھن اور ادھیڑبن میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی "آجایئے۔" اس نے کہا۔

دروازہ کھلا اور میمونہ اندر آئی۔ "میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ دیکھ لو، میں تو یونہی بیٹھا ہوں۔"

"نیند نہیں آرہی ہے؟"

"کیسے آسکتی ہے۔" سرمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اتنے برسوں کے بعد آیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔"

"اٹھارہ برس بہت ہوتے ہیں۔ دنیا زیر و زبر ہوجاتی ہے۔"

میمونہ بولی "باہر نہیں چلیں گے .... آنگن میں ۔ چاند نکلا ہوا ہے۔ ابھی پورا تو نہیں ہے۔ پھر بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

سرمد اٹھ کھڑا ہوا "کیوں نہیں۔ چلو۔"

وہ دونوں لان میں آگئے۔ وہاں کرسیاں اب بھی بچھی ہوئی تھیں۔ چاندنی نے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ وہ بیٹھ گئے لیکن اس بار بھی خاموشی ان کے درمیان دیوار کی طرح حائل تھی۔ میمونہ سے رہا نہیں گیا "آپ اتنے کم گو تو نہیں تھے۔" اس نے سرمد کو ٹوکا۔

"نہیں۔ میں تو بہت بولتا تھا۔" سرمد نے دل گرفتگی سے کہا۔ "ہاں، کبھی کبھی چپ کے دورے پڑتے تھے۔"

"تو اب اتنے گم صم کیوں ہیں؟"

"آدمی بدل جاتا ہے مونا۔ وقت بڑی بے رحمی سے آدمی کو بدل دیتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا۔" سرمد نے آہ بھر کر کہا۔

"آپ کو پرانا والا اپنا آپ اچھا لگتا ہے یا یہ والا؟"

"پرانا والا' جسے وقت کچل کر گزر گیا۔"

"مگر مجھے تو آپ ویسے ہی لگے۔"

آدمی بدلتا تو اندر سے ہے۔ بعض اوقات ظاہر میں تو کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ میں بہت بدل گیا ہوں۔ مجھے پرانا سرمد بہت یاد آتا ہے۔ اب میں نے سوچا تھا کہ پرانا والا سرمد بننا افورڈ کر سکتا ہوں۔ وہ میں یہاں واپس آکر ہی بن سکتا تھا لیکن یہاں تو مجھے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔ سب کچھ بدلا ہوا ہے۔"

"سب کچھ کبھی نہیں بدلتا سرمد بھائی۔" اس وقت میمونہ خود کو سرمد سے بڑا محسوس کر رہی تھی۔ اسے راستہ یاد تھا "میں وہی ہوں سرمد بھائی۔ میں نہیں بدلی۔ وقت نے کچلنا چاہا تو میں نے خود کو پتھر بنالیا۔ آپ اپنے گزرے ہوئے روز و شب' مہینے سال تلاش کر رہے ہیں نا۔"

"ہاں .... وہ وقت' جو میں نے امی کی موت سے لے کر یہاں سے رخصت ہونے تک گزارا تھا' میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں مگر پہلی کڑی ہی نہیں ملتی۔"

"میں نے آپ کے دو ماہ دو سال' وہ روز و شب اپنے پاس محفوظ کر لئے ہیں۔"

"جب وہ جگہیں نہیں رہیں' وہ لوگ نہیں رہے تو یہ کیسے ممکن ہے۔" سرمد کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"سب کچھ میرے تصور میں ہے۔ میں آپ کو دکھا سکتی ہوں۔" میمونہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

سرمد نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا "مونا" تم .... تم تو بڑی ہو گئی ہو۔" وہ حیرت سے بولا "تصور تو میرے پاس بھی ہے۔ اگرچہ عملی زندگی نے اسے دھندلا دیا تھا مگر میں تصور میں ہمیشہ تمہیں ویسا ہی دیکھتا رہا' جیسی تم آخری بار نظر آئی تھیں۔"

"یہ تو ہوتا ہے میں خوش نصیب ہوں کہ آپ مجھے ویسے ہی ملے' جیسے میرے تصور میں محفوظ تھے۔"



"مگر میں ویسا نہیں ہوں۔ میں بہت بدل گیا ہوں۔"

"بدلنا تو ارتقا ہے۔"

"تنزلی بھی ہے۔"

پھر سوگوار خاموشی چھا گئی۔ سرمد کہیں کھو گیا "آپ پھر گم صم ہو گئے۔" میمونہ نے کہا "واپسی اچھی نہیں لگی؟" اس بار اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"یہ بات نہیں۔" سرمد نے جلدی سے کہا "مجھے ایک معذرت کرنی ہے تم سے۔ اس کے بغیر ہلکا نہیں ہو سکوں گا۔ میں نے آج تمہیں دیکھا تو نجانے کس کیفیت میں تھا کہ دیر تک .... بہت دیر تک تمہیں شہلا سمجھتا رہا۔ تمہیں یقیناً برا لگا ہوگا کہ میں تمہیں پہچان نہ سکا۔"

"محبت اور معذرت کا آپس میں کوئی میل نہیں سرمد بھائی۔" میمونہ کہا "پھر آپ نے یہ کیوں سوچا کہ آپ کا مجھے آپی سمجھنا مجھے برا لگا ہوگا۔ الٹا مجھے تو بہت اچھا لگا۔ فخر کا احساس ہوا۔"

"یہ تو تمہارا ظرف ہے ورنہ ہر آدمی کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ تمہاری بھی ہے۔"

"یقیناً ہوتی ہے۔ اور میری بھی ہے لیکن آپ یہ بات سمجھ لیں کہ آپی میرے وجود کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ میری انفرادیت میں شامل ہیں وہ۔ ان کے بغیر میں مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کی خواہشیں' ان کے رنگ' ان کی خوشیاں' ان کا انداز فکر' ان کے دکھ' ان کی مایوسیاں' محرومیاں' سب کچھ میرے اندر موجود ہے۔ پھر میرا اپنا سب کچھ بھی ہے۔ دونوں ملتے ہیں تو میری اکائی بنتی ہے۔" میمونہ نے ایک گہری سانس لی "آپ کو مجھ میں آپی نظر آئیں' مجھے خوشی ہوئی اس بات سے۔ فخر ہوا خود پر کہ میری محبت ضائع نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ سطح پر دیکھنے والے کو مجھ میں آپی نظر نہیں آتیں۔ میرے خدوخال آپی سے مختلف ہیں۔ جو اندر دیکھنے والا ہوگا' اسی کو مجھ پر ان کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے آپی کو یاد رکھا۔ آپ ہی کی خاطر میں نے آپی کو سنبھال کر رکھا۔ صرف ان کا جسم خاک ہوا۔ اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔ آپی کا باقی سب کچھ میں نے محفوظ کر لیا۔"

سرمد اب سحر زدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ میں سمجھ گیا تمہار بات۔ مگر مجھے دھوکا کھانے پر شاک اس لئے لگا کہ ان برسوں میں میں نے شہلا کو ک اور تمہیں زیادہ یاد رکھا۔" اس نے نہیں دیکھا کہ اس کی بات سن کر میمونہ کے چہر پر رنگ دوڑ گیا تھا۔ وہ اپنی کہتا رہا "میں ہمیشہ تمہیں سوچتا رہا۔ میں نے تمہارے قد قامت میں ہمیشہ گزرا ہوا برس جمع کیا اور پھر تصور میں تمہیں دیکھا۔ مجھے مان تھا ک میں ہزاروں کے مجمع میں بھی تمہیں پہچان لوں گا۔ لیکن میں تمہاری تنہائی میں بھی ن پہچان سکا۔" اس کا لہجہ متاسفانہ ہوگیا۔

"اس لئے کہ آپ مجھ میں آپی کے ہونے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔"

"کمال ہے۔ تم کیا بن گئی ہو مونا گڑیا۔ مجھے رشک آرہا ہے تم پر۔"

"حالانکہ نہیں آنا چاہیے۔ کم از کم میرے کچھ بننے پر تو ہرگز نہیں۔" میمو نے جلدی سے کہا "اس لئے کہ میں کچھ بنی نہیں۔ مجھے کچھ بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ جب گئے تو میں کچھ بن چکی تھی۔ آپ نے اور آپی نے مل کر مجھے بنا تھا۔ ایک خاص نقشے کے مطابق تعمیر کیا تھا مجھے۔ میں نے پچھلے برسوں میں کچھ بھ نہیں کیا۔ بس اس اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد کی۔ وقت سے لڑی۔ اپنا نقش تبدیل نہیں کرنے دیا وقت کو۔ آپ نے سکھایا تھا۔ سو میں نے خواب دیکھے' انہیں محفوظ رکھا' محترم جانا۔ ان پر یقین رکھا اور تعبیر دینے والے سے لو لگاتی رہی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں بہت بودا ثابت ہوا مگر مجھے تم پر فخر ہے مونا گڑیا۔"

"آپ کیا کرسکتے تھے۔ وقت نے آپ کو بپھرے ہوئے' چڑھے ہوئے سمندر م دھکیل دیا تھا۔"

"تم میرا اعتماد بحال کر رہی ہو مگر مجھے عمر کے ایک حصے کو دوسرے سے جو ہے اور یہ ممکن نہیں۔ وہ گھر ہی نہیں رہا۔ وہ لوگ ہی نہیں رہے۔"

"سب موجود ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں اور وقت کے ہر لمحے کو میں نے محفو رکھا ہے۔ میں حال میں کم اور ماضی میں زیادہ جیتی رہی ہوں۔ شاید میں آپ کی کرسکتی ہوں۔" میمونہ نے کہا۔ "یہ مکان کیسا لگا آپ کو؟ یہ لان ..."

"مگر یہ وہ آنگن نہیں .... وہ گھر نہیں۔" سرمد نے تاسف سے کہا۔



"ابو کی خواہش پوری کرنے کے لئے میں نے وہ گھر اصرار کرکے بکوایا۔ مگر وہ سب کچھ یادداشت پر نقش کرلیا۔ ابھی تین سال پہلے بہت جی چاہا گھر جانے کو۔ میں گئی بھی' سوچا تھا کہ ایک ایک جگہ دیکھوں گی' ہر کونے میں پھروں گی۔ ہر گوشے سے باتیں کروں گی مگر وہ ملا ہی نہیں۔ مکان کے نئے مالکوں نے پرانا مکان گرا کر نیا تعمیر کرلیا تھا۔ مجھے باہر سے ہی اندازہ ہوگیا کہ کچھ بھی نہیں بچا۔ آنگن بھی نہیں۔ آبادی بڑھی ہے تو زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ انسانوں کے لئے۔ اب گھروں میں آنگن نہیں رکھے جاتے۔" وہ اداس ہوگئی "میں واپس آکر بہت روئی مگر پھر جیسے کسی نے میرے آنسو پونچھ دیئے۔ میں نے سوچا' وہ سب کچھ تو میرے پاس محفوظ ہے۔ جب چاہوں' وہاں جاسکتی ہوں۔ پھر سکون آگیا۔"

"مجھے بھی لے چلو۔ ان بچھڑے ہوؤں سے ملوا دو مجھے' جن سے میں دور ہوگیا تھا۔"

"چلیں .... دیکھیں' یہ وہی آنگن ہے نا ...."

"ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ نظر آرہا ہے مجھے۔" سرمد نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"آپ چلے گئے تو آنگن اجڑ گیا۔ گھر جیسے قبرستان ہوگیا...."

میمونہ کہتی رہی' وہ سنتا رہا۔ وہ یادوں کی انگلی تھام کر ماضی کی گلیوں میں گھومتے پھرے۔ سرمد میمونہ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کتنی بار اس کی آنکھیں بھیگیں' کتنی بار خشک ہوئیں۔ وقت کی پٹی میں لمحوں کی خالی جگہیں بھرتی جا رہی تھیں۔

وہ گھومتے پھرے۔ درمیان میں وقفے بھی آتے تھے۔ ذرا دیر بعد سفر پھر شروع ہو جاتا تھا۔



"شہلا کی شادی کا علم تھا مجھے۔" سرمد نے کہا "میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن مجھے خوف تھا...."

"اپنے ٹوٹ جانے کا خوف؟" میمونہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ ڈر تھا کہ کہیں شہلا بغاوت نہ کر بیٹھے۔"

"ان سے تو ہتھیار آپ نے ہی رکھوا دیئے تھے۔"

"ہاں۔ میں نے کم عمری میں ہی سمجھ لیا تھا کہ آدمی سب کچھ کرسکتا ہے، مقدر سے نہیں لڑسکتا۔ مقدارات اٹل ہوتے ہیں۔"



"یہ بات آپی نے بھی سمجھ لی تھی۔ ابو نے ان سے معافی مانگی تو ...."

"خالو جان نے شہلا سے معافی مانگی؟" سرمد نے حیرت سے کہا۔

"وہ باپ تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر بہتری سوچی تھی آپی کی۔ پھر آپی نے ان کی عزت کرنا چھوڑ دیا۔ ان سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ ابو کو اندازہ ہوگیا کہ وہ زیادتی کر بیٹھے ہیں اور آخر میں ثبوت بھی مل گیا۔ جیتی جاگتی آپی چند برسوں میں دیکھتے ہی دیکھتے خاک ہوگئیں۔" میمونہ نے کہا پھر آہ بھر کر بولی "آخری وقت میں ابو نے اعتراف کیا کہ آپی کی تباہی کے وہی ذمے دار ہیں۔ اس وقت آپی نے کہا کہ وہ مقدر کے کھیل سمجھ گئی ہیں۔ کوئی کسی کو وہ خوشیاں دینے کی کوشش کرے جو اس کے نصیب میں ہی نہ ہوں تو کیا ہوسکتا ہے اور کوئی کسی کو اس کے مقدر کے دکھوں سے نہیں بچاسکتا۔"

"شروع میں چاہے نہ سمجھے، مگر آخر میں یہ بات سمجھ میں آہی جاتی ہے۔"

"پھر آپی نے ابو سے معافی مانگی۔" میمونہ کا گلا رندھنے لگا۔ "آپ کو تو شاید پتا ہی نہیں ہوگا آپی کا۔ اسی لئے مجھے آپی سمجھے تھے ....؟"

"پتا چلنا تو نہیں چاہیے تھا، لیکن چل گیا۔ میں ٹورنٹو میں تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ شہلا میرے پاس آئی ہے اور اس نے سوتے سے مجھے اٹھایا ہے، سرمد ..... سو رہے ہیں۔ اٹھیں اور ہمیں الوداع کہیں۔ ہمیں رخصت نہیں کریں گے؟

میں نے دیکھا، وہ بہت اداس اور مضمحل تھی۔ آنکھوں میں ناتوانی تھی۔ میں نے کہا جا رہی ہو؟ کہنے لگی، بہت پہلے چلا جانا چاہیے تھا لیکن بلاوا ہی نہیں تھا۔ اب آگیا ہے۔ مکتی ہو رہی ہے ہماری، میں نے کہا، مجھے بھی لے چلو۔ اکیلا کیوں چھوڑتی



وہ بولی، تم تو بہت لمبی عمر جیو گے اور ہم تمہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ کچھ کیا ہے ہم نے تمہارے لئے۔ بے شمار خوشیاں جمع کی ہیں .... خواب سونپے پیاری پیاری آنکھوں کو۔ بہت خوب صورت دھنک سونپی ہے تمہارے لئے۔ بھی جاؤ گے، تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔ اتنی خوشیاں ہیں کہ تمہارا دامن چھوٹا بہت چھوٹا پڑ جائے گا۔ تم سے سمیٹی بھی نہیں جائیں گی۔ دیکھو ہماری قسم، کبھی س نہ ہونا۔ میں نے کہا، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کہنے لگی، جاؤ گے تو ھو گے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں، میں نے کہا، ذرا رکو تو ... وہ بولی افسوس، نہیں رک ئے۔ بہت دیر ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ یوں تحلیل ہوگئی۔ جیسے خوشبو۔

میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تمام جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ تھا میرے سینے میں خلا تھا، جیسے دل ہی نہ رہا ہو۔ میں نے اٹھ کر وقت دیکھا۔ صبح کے ڑیا" چھ بج رہے تھے اور وہ ۲۶ اگست تھی۔ سال ۸۷ء تھا۔ میں نے حساب لگایا۔ وقت پاکستان میں شام کے ساتھ بج رہے ہوں گے۔"

میمونہ سناٹے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ چند لمحے بعد اس نے کہا "آپ کا خواب یا تھا۔ آپی ۲۶ اگست ۸۷ء کو مغرب کے وقت ہمیں چھوڑ گئی تھیں۔" وہ سسکنے ی۔

"مگر اس کی خوشیوں والی بات میں آج تک نہ سمجھ سکا۔" سرمد نے افسردگی ے کہا۔

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو وقت آنے پر آپ ہی آپ سمجھ میں آجاتی ہ۔" میمونہ نے دھیرے سے کہا "کوئی سمجھا سکتا ہو، تب بھی نہیں سمجھا سکتا۔"



..... "تم نے کیسے کرلیا یہ سب کچھ؟" سرمد نے حیرت سے کہا "شہلا کو تو میں ا ہوں۔ وہ ضدی بھی تھی اور ہمت والی بھی۔ وہ سر اٹھا کر کھڑی ہونے والی تھی میرے خیال میں تم ڈرپوک ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ لیکن آپی کچھ بھی نہ کرسکیں۔ اسی لئے کہ انہیں

روکنے والے آپ تھے اور مجھے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ پھر میرے پاس روحانی طاقت بھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپی کی کہانی دہرائی نہیں جاسکتی۔ یہ تو ہونا ہی نہیں ہے ....''

''کس روحانی طاقت کی بات کر رہی ہو؟'' سرمد کے لہجے میں الجھن تھی۔

''ایک وعدے کی۔ کسی نے ایک وعدہ لیا تھا مجھ سے اور وہ مجھے جان کی قیمت پر بھی وفا کرنا تھا۔''

''تو تم بھی کسی سے ...''

''میمونہ نے اقرار میں سرہلایا اور نظریں جھکالیں۔

''تو رکاوٹ کیا ہے؟ شادی کیوں نہیں ہوئی اب تک؟''

''رکاوٹ وہ خود ہیں۔ مجھے کیا۔ اب وعدہ لینے والے جانیں۔ میں تو وعدہ نبھا رہی ہوں۔''

''مجھے بتاؤ۔ میں دور کروں گا رکاوٹ ... میں تمہارا شہلا والا حشر نہیں ہونے دوں گا۔''

''بے شک' رکاوٹ تو آپ ہی دور کریں گے۔ لیکن میں کچھ بتا نہیں سکتی۔''

سرمد اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ''اور جس کا رشتہ آیا تھا تمہارے لئے' وہ کیسا تھا؟''

''بہت اچھا تھا .... ہر لحاظ سے اچھا۔ مگر وہ میرے لئے نہیں تھا.....''



''خالہ جان بہت محبت کرتی تھیں مجھ سے۔'' سرمد نے ہتھیلی سے آنکھوں کے کنارے پونچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابو کا بہت احترام کرتی تھیں۔''

''مثالی بیوی تھیں وہ .... مکمل عورت ...''

''لیکن اولاد کی خوشیوں کا دفاع نہیں کرسکتی تھیں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ دکھ ہی دکھ ملے انہیں۔ خوشیاں نصیب نہیں ہوئیں۔''



''جو تری بزم سے نکلا' وہ پریشان نکلا۔'' میمونہ نے مصرع پڑھا۔ ''اس گھر کا ہر والا دکھی ہی گیا۔ جو رہ گئے' وہ بھی آج تک خوشیوں کی راہ تک رہے ہیں ....''



''مجھے خالو جان ہمیشہ بہت اچھے لگے تھے۔'' سرمد نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ان کے قریب ہوسکتا تھا مگر میں ڈرتا تھا .... ان سے نہیں۔ اپنی مجبوریوں سے ی خود داری سے۔ ورنہ ان میں میرے لئے بہت کشش تھی۔ لیکن میں کبھی مجھ سکا کہ وہ اتنے تنہا' اتنے محروم آدمی ہیں۔''

''ابو نے بہت جدوجہد کی لیکن خواب اس وقت دیکھے جب عمر کا پیمانہ بھرچکا ر بھی انہوں نے آخری وقت اچھا گزارا۔''

''مجھے خوشی ہوئی ہے یہ سن کر۔''

''ایک دن ابو نے کہا .... کاش' مجھے سرمد سے معافی مانگنے کا موقع مل جاتا۔ میں ت زیادتی کی ہے۔ اس کے ساتھ۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''ابو کو یقین تھا کہ آپ ایک دن واپس ضرور آئیں گے۔ انہوں نے آپ کے ب پیغام چھوڑا تھا ...'' میمونہ کی آواز بھرا گئی۔

سرمد ڈبڈبائی آنکھوں میں سوال لئے اسے دیکھتا رہا۔

''انہوں نے کہا تھا .... سرمد واپس ضرور آئے گا۔ آئے تو اس سے کہنا کہ میں لیوں پر دل سے پشیمان تھا۔ مجھے معاف کردے۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر سرمد نے کہا ''خدا گواہ ہے کہ مجھے کبھی ان سے نہیں رہی۔ پھر بھی ان کی آخری خواہش کے احترام میں میں انہیں معاف کرتا ''

''اور جانتے ہیں' سب سے زیادہ پرسکون موت ابو کو ہی آئی۔ وہ دھنک دیکھ کر ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے دھنک کے رنگ پھیکے پڑنے کی شکایت کی۔ اور کے ساتھ ساتھ خود بھی تحلیل ہوگئے۔ ابھی تھے ... اور ابھی نہیں۔'' ضبط کا

بند ٹوٹ گیا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

سرمد اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے دھیرے سہلاتا رہا۔ "نہ رو میری مونا.... نہ رو مونا جان۔ اب میں جو آ گیا ہوں۔"



"ارشد کی کوئی خیر خبر؟"

"کبھی سال چھ مہینے میں ایک خط آجاتا ہے۔ انہوں نے امریکا میں شادی کرلی۔ وہاں کی شہریت بھی لے لی گئی۔ یہاں آنے کا شاید وہ سوچتے بھی نہیں۔"

"دور جاکر آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔ وطن کے ... گھر کے حقائق سے خوف آنے لگتا ہے۔" سرمد نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"اچھا ہی ہے۔ یہاں رکھا بھی کیا ہے۔"

اسی وقت اذان کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا "ارے فجر ہو گئی۔" میمونہ نے کہا "پوری رات گزر گئی۔"

"ماضی کا سفر بھی تمام ہوا۔" سرمد نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں شکرگزار ہوں کہ وقت کا ہر کھویا ہوا لمحہ تم نے مجھے منتقل کردیا۔"

"آپ کی سب امانتیں سنبھال کر رکھی ہیں۔ میں نے۔"

"شکریہ۔ بہت اچھی امین ہو تم۔"

"کتنی اچھی امین ہوں' یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن سوچ اور سمجھ نہیں سکتے۔"

سرمد عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "شہلا' میں...." وہ کہتے کہتے رکا اور مجوب نظر آنے لگا "سوری مونا۔ کسی کسی لمحے تم بالکل شہلا کی طرح لگتی ہو۔"

"محبت میں نہ کوئی احسان ہوتا ہے' نہ معذرت کی ضرورت اور آپی تو مجھ... ہیں۔ آپ مجھے ان کا نام لے کر پکارتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے مجھے۔"

سرمد اسے بے حد محبت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میمونہ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر فوراً ہی شرمندہ نظر آنے لگا۔ اس نے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔



پہلو سے جا لگا۔

موذن اب نماز کے نیند سے بہتر ہونے کا اعلان کررہا تھا۔

"میں نماز پڑھ لوں۔" میمونہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ناشتے کے بعد آپ سو جایئے گا۔"

"سونا کیا۔ عمر گزری ہے سوتے ہوئے۔"

میمونہ وضو کرنے چلی گئی۔ سرمد کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔ کسل مندی سی تھی۔ اس کا بہترین علاج غسل ہے۔ اس نے سوچا۔

غسل خانے میں جاتے ہوئے کچن سے کھسر پھسر کی آواز سنائی دی تو وہ کچن میں چلا گیا۔ انا بوا ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں السلام علیکم بوا۔"

"وعلیکم السلام بیٹے۔ جیتے رہو' خوش رہو۔"

"کیا ہو رہا ہے بوا؟"

"ناشتے کی تیاری۔" بوا مسکرائیں "ہم جانتے تھے کہ رات بھر جاگو گے۔ صبح سویرے بھوک لگی ہوگی۔"

"چھوڑیں ناشتے کو۔" سرمد نے بچوں کی طرح کہا "اب تو موقع ملا ہے آپ سے ملنے کا۔ آپ بھی سوچیں گی کہ میں کتنا بے مروت ہوں۔"

"نہیں میاں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز وقت پر ملتی ہے۔ ہم سے ملنے کا یہی وقت تھا۔ مونا نے کتنا انتظار کیا ہے تمہارا۔"

"میں اس سے مل لیا بوا۔ سب کچھ سن لیا' جان لیا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ اسی لئے تو تمہارے آنے کی دعا کرتے تھے ہم۔"

"اور سنائیں بوا۔"

"ہم کیا سنائیں۔ سب کچھ تو تم نے سن لیا۔ ہم تو خوش ہیں کہ ہمارا بیٹا۔ ہمارا سرمد واپس آگیا۔" "بوا نے کہا۔" جاؤ' تم ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو کر آؤ۔ اتنی دیر میں ہم ناشتہ تیار کرلیں گے۔"

"آپ نے ہمیشہ میرے کھانے کی فکر کی بوا...."

"محبت کا کوئی اور طریقہ آتا ہی نہیں ہمیں۔ اچھا پکا کر کھلانے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں ہم۔ آج باجی زندہ ہوتیں تو ..." بوا آبدیدہ ہوگئیں۔ آواز بھرا گئی۔

سرمد نے ہاتھ بڑھا کر انگلی کی اوپری پور سے بوا کی آنکھیں پونچھ دیں۔ یہ بس غضب ہوگیا۔ بوا کے سینے میں برسوں کا سویا ہوا آنسوؤں کا سمندر بپھرا اور ساری رکاوٹیں توڑ کر باہر آگیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

سرمد بوکھلا گیا "ارے بوا' یہ کیا .... کیا ہوگیا؟ کیا کرتی ہیں؟" اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے بوا کو بانہوں میں بھرلیا۔ وہ بھی اس سے یوں لپٹیں' جیسے ڈوبتے کو سمندر میں تنکے کی جگہ کوئی شہتیر مل گیا ہو۔

سرمد کا سینہ بھیگتا رہا۔ وہ بوا کو بچوں کی طرح تھپکتا' دلاسے دیتا رہا "نہ روئیں بوا' اب تو میں آگیا ہوں۔"

میمونہ بھی آکھڑی ہوئی تھی لیکن اس نے مداخلت نہیں کی۔ وہ دونوں بھی اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔

پھر طوفان کا زور ٹوٹنے لگا۔ بوا سسکیوں کے درمیان کہتی رہیں۔ "ایک ایک کرکے جانے والے جاتے رہے میاں۔ مگر ہر بار ہم نے اپنے آنسوؤں کا رخ آنکھوں کے بجائے اندر کی طرف موڑ دیا۔ ہم تو آنسو پونچھنے والے تھے۔ اور آنسو پونچھنے والے کبھی نہیں روتے۔ ہمارے آنسو پونچھنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ آج آیا ہے تو رو دیئے ہیں۔ اب یہ بوجھ اٹھتا نہیں تھا میاں۔"

طوفان تھم گیا تو بوا نے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر بڑی محبت سے سرمد کو دیکھا پھر کھسیائے ہوئے لہجے میں بولیں "لو .... ہم بھی مل لئے۔"

سرمد نے رومال نکال کر انکا چہرہ خشک کیا۔ "جی ہاں بوا۔ دیر آید درست آید۔"

"یقین کرو' آج سے پہلے ہم روئے ہی نہیں تھے۔"

"جانتا ہوں بوا اور فخر ہے کہ آپ نے مجھے اتنا مان دیا۔"

اسی وقت ان دونوں کی نظر کچن کے دروازے میں کھڑی میمونہ پر پڑی "بٹیا۔ تم" بوا نے شرمندگی سے کہا۔



"تم کب آئیں مونا؟" سرمد نے پوچھا۔

"طوفان کے ساتھ۔" میمونہ نے مسکراتے ہوئے کہا پھر معنی خیز لہجے میں بوا سے بولی "رشک آرہا تھا آپ پر۔"

"تمہیں کسی پر رشک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" بوا نے کہا۔ "تم پر تو دنیا رشک کرے گی انشاء اللہ۔"

"کون جانے۔" میمونہ نے آہ بھر کے کہا۔

"بوا .... میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ آپ ناشتہ تیار کرلیں جلدی سے۔" سرمد نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔



دس دن ہوا کی طرح گزر گئے۔ پتا بھی نہیں چلا!

سرمد کی آمد کے چوتھے دن اختر اپنی شادی کا کارڈ لے آیا تھا۔ ۱۲ جون کو شادی تھی اور ۱۴ کو ولیمہ۔ ۱۴ تاریخ تک ان لوگوں کو فرصت ہی نہیں ملی۔ سرمد اور میمونہ انتظامات میں لگے رہے۔ شادی واقعی سادگی سے ہوئی۔ میمونہ' سرمد اور بوا کے علاوہ اختر نے صرف اپنے چار پانچ دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ البتہ ولیمے کی تقریب بہت بڑی تھی۔ اختر خوش بھی بہت نظر آرہا تھا۔

میمونہ' فوزیہ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔

ولیمے کے اگلے روز میمونہ نے چچی جان سے اجازت چاہی۔ اسی وقت اختر بھی آگیا۔ چچی جان کے ہٹتے ہی اس نے میمونہ کو چھیڑا "لو بھئی کزن میمونہ' ہم نے پہل کردی۔ اب تم بھی تقلید کرو۔"

"دعا کیا کرو میرے لئے۔" میمونہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اختر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ "جس طرح تم میری خوشی میں شریک ہوئی ہو' اس کا صلہ دے ہی نہیں سکتا میں۔ ہاں' ہر سانس کے ساتھ سچی خوشیوں کی دعا دیتا ہوں تمہیں۔"

"شکریہ۔"

اختر کے ہاں سے واپسی کے بعد سرمد نے میمونہ اور بوا کے ساتھ صحیح معنوں

میں وقت گزارا۔ شروع کے ایک ہفتے میں وہ لوگ خوب گھومے پھرے۔ بوا صبح ہی کھانے پینے کا سامان تیار کرتیں اور دس بجے تک وہ گھر سے نکل جاتے۔ ہاکس بے' کلری جھیل' گڈانی بیچ' آبشار' حب ڈیم' کلفٹن ' منوڑا .... انہوں نے کوئی جگہ چھوڑی نہیں۔ ہاکس بے' حب ڈیم اور کلری جھیل پر انہوں نے رات کو قیام بھی کیا۔ وہ بے فکرے بچوں کی طرح انجوائے کرتے پھرے۔

پھر ایک دن یہ تھکن دور کرنے کی نذر ہوگیا۔ شام کو ان کا معمول تھا کہ رات دیر تک وہ لان میں بیٹھے رہتے۔ کبھی اختر اور فوزیہ بھی آجاتے۔ چائے کا دور چلتا رہتا اور بوا ہمیشہ چائے کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ رکھتیں۔

ایک دن سرمد نے کہا "لان بہت خوب صورت ہے تمہارا۔"

"پرانے گھر کے آنگن جیسا؟" میمونہ نے پوچھا۔

"حقیقت کی آنکھوں سے دیکھوں تو اس سے زیادہ خوب صورت اور دل کی آنکھوں سے دیکھوں تو اس سے کم تر۔"

"میرے پاس تو حقیقت کی آنکھ ہے ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" سرمد نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں نے اس لان کو اس پرانے گھر کے آنگن کی طرح ترتیب دینے کی کوشش کی لیکن کوئی جگہ کسی دوسری جگہ کی طرح نہیں بنائی جاسکتی۔"

"کیوں بھئی؟"

"اس آنگن کو ہی لیجئے۔ وہ ہمارے اس گھر کا حصہ تھا۔ پھر وہ گھر ایک خاص علاقے میں تھا۔ دو مخصوص مکانات کے درمیان۔ سامنے والے مکان بھی مخصوص تھے۔ وہ گلی اپنی جگہ ایک منفرد گلی تھی' جہاں ہمارا گھر تھا۔ اب اس لان کو لیجئے۔ یہ اس آنگن کے مقابلے میں بہت بڑا ہے لیکن اس لان کو سائز میں ان آنگن کے برابر کرکے اور اسے بالکل ویسا بنا کے بھی وہ Effect حاصل نہیں کرسکتی۔ یہ مکان اس مکان سے مختلف ہے۔ اگر اس پورے مکان کو بھی آنگن سمیت ویسا ہی بنوالوں تو باہر نکلتے ہی سب کچھ اجنبی لگے گا۔ دوسرے مکانات تو تبدیل نہیں کرواسکتی میں اور مین روڈ کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میرے خیال میں کوئی جگہ کسی دوسری جگہ کا متبادل



نہیں ہوسکتی۔ ہاں' تصور میں سب کچھ محفوظ کیا جاسکتا ہے۔"

"تم تو بھئی باقاعدہ فلسفی بن گئی ہو۔" سرمد نے ہنس کر کہا "یہ بتاؤ' تمہیں یہ لان اس آنگن سے اچھا نہیں لگتا۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے پاس حقیقت کی آنکھ نہیں ہے۔ وہ آنگن تو کہیں مل ہی نہیں سکتا۔"

سرمد کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کہا "یہ بتاؤ' تمہیں اسکول کا خیال کیسے آیا؟"

"آپ ہی نے تو سکھایا تھا۔ خوابوں کی اہمیت بتائی تھی۔ میں خوش نصیب تھی کہ مجھے آپ ملے' آپ ملیں مگر میں نے دیکھا کہ بچوں کو خواب دیئے ہی نہیں جاتے .... نہ گھر میں نہ اسکول میں۔ تعلیم کا مطلب زندگی سکھانا نہیں۔ وہ بوجھ کی طرح لادی جاتی ہے۔ ہر نئی کلاس میں بوجھ کچھ بڑھ جاتا ہے۔ کمر اور کندھے کچھ اور جھک جاتے ہیں۔ اسکول کے زمانے سے ہی میں سوچنے لگی تھی کہ اسکول قائم کرنا ہے۔ لیکن وسائل نہیں تھے' پھر جب ابو کی وفات کے بعد ارشد بھائی کو باہر بھیجنے کے لئے مکان بکا تو ارشد بھائی نے زبردستی میرا حصہ مجھے دے دیا۔ یوں وسائل بھی میسر آگئے اور میرے اس خواب کو تعبیر مل گئی۔"

"ہاں' بغیر خواب کے تعبیر کہاں ملتی ہے۔" سرمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر پوچھا "یہ مکان تمہارا اپنا نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ کرائے کا ہے۔"

سرمد پھر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "تم کبھی میری کہی ہوئی کوئی بات نہیں بھولیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے آپ سے محبت ہے۔ بے حد' بے حساب۔ آپ میرے آئیڈیل ہیں۔"

کہتے کہتے میمونہ کو احساس ہوا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

سرمد نے اس کے چہرے کے رنگ نہیں دیکھے۔ عین اسی لمحے اس نے شرمندگی

سے نظریں جھکالیں۔ "مجھے رشک آتا ہے تم پر۔ تم نے خواب نہیں چھوڑے۔ تمہیں تعبیر بھی ضرور ملے گی۔"

"آپ نے خواب چھوڑ دیئے؟"

"نہ چھوڑے ہوتے تو مرجاتا۔ خوابوں کے ہر گلاب کے ساتھ بہت بڑے اور نکیلے کانٹے تھے۔ دل بھی لہولہان ہوچکا تھا اور آنکھیں بھی۔"

"آپ ہمیں بھول گئے تھے نا؟"

"کوشش تو بہت کی لیکن بھول نہیں سکا۔ ہاں' میرا خیال تھا کہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ میں تو لٹا ہوا مسافر تھا۔ یادوں سے ڈرتا تھا۔ خودکشی کا قائل نہیں تھا اور زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔"

"آپ ..... آپ مجھے بھول گئے تھے۔" میمونہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میں سب کو بھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ کم از کم میرا گمان یہی تھا لیکن تمہارے بارے میں تو میں یہ گمان بھی نہ کرسکا۔ تمہیں میں کبھی نہ بھول سکا۔ نجانے کیوں۔"

اس لئے کہ میں نے آپ کے سوا کچھ یاد نہیں رکھا۔ میمونہ کہنا چاہتی تھی لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ "آپ کو وہ دن یاد ہے' جب آپ جا رہے تھے..."

"ہاں' یاد ہے۔ تم نے پوچھا تھا ... آپ کب آئیں گے؟"

"اور آپ نے کہا تھا .... دیکھو' کیا کہہ سکتے ہیں۔ دنیا اتنی بڑی ہے۔ راستہ بھولتے دیر نہیں لگتی۔"

"اور تم نے اداسی سے کہا تھا .... میرا دل نہیں لگے گا آپ کے بغیر۔"

"اس پر آپ نے کہا تھا۔ دل لگانا بھی نہیں مونا۔ یہ دل بڑا دکھی کر دیتا ہے۔"

"اور تم نے کہا تھا .... میں بہت اداس رہوں گی۔"

"اور آپ نے کہا تھا .... ہم سے زیادہ؟ تم تو کچھ عرصے کے بعد ہمیں بھول جاؤ گی۔ پھر اداسی بھی مٹ جائے گی۔ ہمارا تو اب انت یہی ہے۔"

"اور تم نے بڑی مشکل سے آنسو روکے تھے .... اور کہا تھا .... آیئے گا ضرور بھائی جان۔"



"اور آپ نے مسکرا کر کہا تھا ..... آئیں گے .... مگر بلانے پر۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سرمد نے کہا "بھئی تمہاری یادداشت کو تو ہم مان گئے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" میمونہ نے کہا "آپ سچ مچ مجھے نہیں بھولے۔"

سرمد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا مونا گڑیا۔ ہم جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔"

"یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی بات غلط ہوگئی۔ نہ میں کبھی آپ کو بھولی۔ نہ اداسی مٹی۔"

"اور ہمیں دیکھو۔ ہم نے کہا تھا کہ بلانے پر آئیں گے مگر بن بلائے ہی آگئے۔"

"جی نہیں۔ یہ آپ کا خیال ہے۔" میمونہ نے کہا "آپ خود نہیں آئے۔ میں نے بلایا تھا آپ کو۔"

"غلط .... بالکل غلط۔"

"آپ کو یاد نہیں کہ کھانے کا کیسا اہتمام تھا اور سب چیزیں آپ کی پسند کی تھیں۔"

"اتفاق .... محض اتفاق۔ اس سے تمہارا بلانا کہاں ثابت ہوتا ہے۔"

"جی نہیں۔ بوا سے پوچھ لیں۔ اس صبح ہی میں نے بوا سے کہہ دیا تھا کہ یہ سب پکانا ہے اور بوا نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔"

"ماننے والی بات تو نہیں ہے۔"

میمونہ کا چہرہ تمتما اٹھا "پورے ایک مہینے سے میں آپ کو پکار رہی تھی۔ بلا رہی تھی۔ مگر اس صبح میں نے سوچ لیا کہ آج دن ختم ہونے تک آپ ضرور آئیں گے۔ آپ کو آنا ہی ہوگا۔ اس روز میں نے بال جلایا تھا آپ کو بلانے کے لئے ...."

"ہاں!" سرمد نے حیرت سے دہرایا۔

"آپ کو شاید یاد نہیں۔ آخری بار آپ رخصت ہوئے تھے تو میں نے پوچھا سے آپ کا پتا ہے آپی کے پاس؟"

"یاد ہے .... میں نے کہا تھا .... ہمارا پتا ہمارے اپنے پاس بھی نہیں ہے۔"
سرمد نے کہا اور چند لمحے سوچتا رہا' جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے کہا "ہاں ... یاد آیا۔ میں نے سر سے بال توڑ کر تمہیں دیا تھا اور کہا تھا .... مجھے بلانا ہو تو اسے جلا دینا۔"

"جی ہاں۔ اس روز میں نے وہ بال جلایا تھا۔"

سرمد سنجیدہ نظر آنے لگا "وقت یاد ہے تمہیں۔"

"جی ہاں ۔ سات بج کر پچیس منٹ۔" "ٹھیک اسی وقت میری بائیک کا پٹرول ختم ہوا تھا اور مجھے دھنک اکیڈمی کا بورڈ نظر آیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے۔"

"اتفاق نہیں۔ یہ جذبوں کی سچائی کا کرشمہ ہے۔"

"اچھا .... اگر میں اس روز نہ آپاتا تو؟" سرمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو کچھ ہو جاتا۔" میمونہ نے بے حد یقین سے کہا "کیا؟ یہ تو میں نہیں بتا سکتی لیکن بہت برا ہوتا۔"

سرمد اسے بہت غور سے ... بہت عجیب نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" میمونہ نے پوچھا۔

"تم عجیب لڑکی ہو۔" سرمد نے پر خیال لہجے میں کہا "کبھی چھوٹی سی بچی لگتی ہو اور کبھی بہت جہاندیدہ۔"

"خواب دیکھنے والوں میں تو یہ نیرنگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔" میمونہ نے جواب دیا پھر بولی "سرمد بھائی' آپ نے اپنے متعلق تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"بتانے کو ہے ہی کیا۔ عمر رائگاں کی بے کیفی سنانے کی چیز تو نہیں ہوتی۔ ارے ہاں.... چائے پلواؤ جلدی سے۔"



"کیا چھن چھن کئے جا رہے ہو۔ سوچنے ہی نہیں دیتے۔" بوا نے توے پر پڑے پراٹھے کو ڈانٹا۔ اس سے تسلی نہیں ہوئی تو انہوں نے اس بے چارے کو پراٹھا پلٹنے والا کرچھا بھی رسید کردیا "بے حسی ہے۔ تمہیں کیا درد کسی کا؟"



سرمد کے آنے کے بعد پندرہ دن سکون کے گزرے تھے۔ بوا نے کسی چیز سے خطاب نہیں کیا تھا۔ ایسا تو صرف پریشانی میں ہی ہوتا تھا۔

"ہم خوش تھے کہ پہلی بار گھر میں سچی خوشیاں آئیں گی۔" بوا نے چکلے اور بیلن سے کہا۔ "اتنی اچھی جوڑی بنی تھی۔ چاند سورج کی۔" اب وہ بیلے جانے والے پراٹھے سے مخاطب تھیں۔ "مگر نجانے کیا ہوا۔ سرمد میاں بدلتے جا رہے ہیں۔ پیشانی پر ہر وقت سوچ کی لکیریں۔ آنکھوں میں پریشانی۔ بات کرتے کرتے .... ہنستے ہنستے اچانک چپ ہو جاتے ہیں۔ گم صم۔ لگتا ہے' پہلی زخم کی ٹیسیں ہنستے ہنستے رلا دیتی ہیں۔"

انہوں نے پراٹھا اتارا اور دوسرا پراٹھا توے پر ڈال دیا۔ پراٹھے پر گھی ڈالنے کے لئے ڈبے میں چمچہ ڈالتے ہوئے انہوں نے بڑے درد بھرے لہجے میں ڈبے سے سوال کیا "کوئی تو بتائے کہ اب کیا ہوگا۔ ہماری بٹیا نے تو عمر بتا دی ان کے لئے۔"

لیکن سچ یہ تھا کہ ابھی وہ میمونہ کی طرف سے پریشان نہیں تھیں۔ ان کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ پھر تجربہ بھی تھا۔ دنیا دیکھی تھی انہوں نے۔ میمونہ کو تو انہوں نے اس کی پیدائش سے اب تک ہر لمحے دیکھا تھا۔ سرمد کی بھی وہ مزاج آشنا تھیں۔ وہ ان کے ساتھ کم ہی بیٹھتی تھیں۔ انہیں تنہا بیٹھنے کا موقع دیتی تھیں لیکن چپکے چپکے انہیں دیکھتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سیروں خون بڑھتا تھا ان کا۔ مگر سرمد کی آمد کو مہینہ ہوتے ہوتے وہ پریشان ہو گئیں۔

یہ حقیقت تو بوا پر پہلے ہی کھل چکی تھی کہ مونا بٹیا سرمد میاں سے محبت کرتی ہے۔ سو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ وہ جب بھی دیکھتیں' وہ سرمد میاں کو وارفتہ نظروں سے دیکھتی نظر آتی۔ شروع میں تو سرمد کا رویہ بھی بوا کے لئے خوش کن تھا۔ وہ ہمیشہ میمونہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔ اس کی توجہ پوری طرح میمونہ پر ہوتی۔

لیکن بعد میں صورت حال بدلنے لگی۔ میمونہ کوئی بات کر رہی ہوتی اور سرمد اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہوتا پھر اچانک ہی اس کی نظریں جھک جاتیں۔ چند لمحے بعد وہ سر اٹھاتا تو اس کے چہرے پر شرمندگی ہوتی اور وہ کھسیائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور اب چند روز سے تو وہ لان میں بھی میمونہ کے ساتھ ذرا دیر

کے لئے بیٹھتا پھر اٹھ جاتا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ میمونہ سے گریز کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی تھا کہ میمونہ کے رویئے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"اب ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" بوا نے چولھے کو بتایا۔ "نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا..... خدانخواستہ ہمیشہ کے لئے۔"

چولھے نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔



سرمد کو آئے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا!

شروع میں وہ بہت خوش تھا۔ مگر پھر ایک عذاب اس پر مسلط ہو گیا۔ ہر روز اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل بھی نہیں تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا' اس پر اس کا کوئی اختیار بھی نہیں تھا۔

اسے ہمیشہ اپنے کردار پر فخر رہا تھا۔ وہ خوش شکل' وجیہہ اور پرکشش تھا۔ وہ کوئی نوخیز لڑکا نہیں تھا۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ پچھلے پندرہ برس اس نے کینیڈا کے آزاد ماحول میں گزارے تھے۔ معاشی اعتبار سے بھی وہ بے حد مستحکم تھا۔ چنانچہ وہ ہر اعتبار سے لڑکیوں کے لئے آئیڈیل شخصیت تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی اس پر ملتفت ہوئی لیکن وہ ایسا پتھر تھا' جس میں کبھی جونک نہیں لگی۔ شہلا کے بعد کوئی تصویر اس کے دل میں نہیں لگی۔ اسے کبھی شادی کا خیال تک نہیں آیا۔

مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ شاید تجرد کی زندگی اسے اندر سے کھوکھلا کر چکی ہے۔

بات ایسی تھی کہ اسے اپنے وجود پر شرم آنے لگی تھی۔ میمونہ ہمیشہ سے اس کے لئے چھوٹی بہن کی طرح تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ صرف اسی کی خاطر پاکستان واپس آیا تھا۔

وہ میمونہ سے پہلے کی طرح ملا مگر وہ بتدریج بدلتا گیا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ تبدیلی کا پہلا لمحہ کون سا تھا' اور کب آیا۔ اسے تو بس اچانک ایک لمحے یہ احساس



ہوا کہ مونا کے لئے اس کی محبت کا رنگ بدل گیا ہے۔ اس لمحے بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ مونا کا ہاتھ تھام لے .... اور کبھی نہ چھوڑے۔

وہ اس کے لئے بہت بڑا شاک تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر اور پھر مونا کو دیکھا۔ ادھر ادھر کوئی نہیں تھا اور مونا اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھا' مونا کی باتوں پر بمشکل ہوں ہاں کرتا ہوں۔

اس رات وہ سو نہیں سکا۔ اس نے خود کو ٹٹولا۔ یہ کام اتنا دشوار بھی ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ خرابی کافی اوپر تک آ گئی تھی۔ میمونہ اس کے لئے وہ چھوٹی سی بچی نہیں رہی تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی ... اور وہ ایک مرد بن کر اسے ایک عورت سمجھ کر اس کی طلب کر رہا تھا۔

اس رات سرمد نے خود کو خوب ملامت کی' اے گھٹیا انسان' یوں گرنا تھا تو گرنے کے مواقع تو بہت آئے تھے' کہیں بھی گر جاتے۔ اندر کی غلاظت کو' داغ دار کرنے کے لئے مونا کی پاکیزگی ہی درکار تھی۔ پستی اور وہ بھی پاتال کی پستی۔ ایسے گرو کہ سر تو کیا' کبھی نظر بھی نہ اٹھا سکو۔"

لیکن اس کے اندر کوئی اور بھی تھا .... اور وہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہا تھا۔ یہ بات کسی بھی طرح معیوب نہیں؟ اس اندر کے آدمی نے کہا۔ شرعاً" بھی ناجائز نہیں۔ اور پستی کیسی تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ شادی بہت مقدس بندھن ہے۔ شادی سے کوئی داغ دار ہو سکتا ہے' یہ خیال بھی گناہ ہے۔"

وہ بہن کی طرح ہے' اس نے ملامت کا کوڑا لہرایا' بہنوں سے شادی کی جا سکتی ہے۔"

"نہیں کی جا سکتی۔ لیکن وہ بہن نہیں ہے تمہاری اور سب سے بڑی بات! خود کو ٹٹولو ... تمہاری طلب میں بوالہوسی تو نہیں۔ اگر ہے تو پھر واقعی شرم کی بات ہے۔"

سرمد نے خود کو ٹٹولا مگر کوئی گھٹیا بات سامنے نہیں آئی لیکن یہ بھی کم نہیں تھا کہ وہ میمونہ کو اس طرح چاہ رہا تھا' جیسے اس نے شہلا کو چاہا تھا۔ اس کے لئے تو یہ خیال بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔

اندر کا آدمی اسے نہ قائل کرسکا۔ نہ مطمئن۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ خاموشی سے یہاں سے رخصت ہو جائے گا۔



میمونہ نے سرمد کا گریز بھانپ لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھنے سے بچنے کی کوششیں کرتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ گریز کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس ایک مہینے میں میمونہ بہت خوش رہی تھی .... اتنی خوش کہ ساری زندگی ملا کر بھی اتنی خوشی اسے نہیں ملی تھی اور اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ خوشی کے لمحے اس کے ہاتھوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔

"کیا کیا جائے؟ سرمد بھائی کو بتا دیا جائے! لیکن اس کی انا سر اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔" یہ ناممکن ہے۔ اس نے کہا۔ یہ کام تو آپی کا تھا۔ انہیں کرنا تھا۔ انہوں نے نہیں کیا تو اب کریں، میں کچھ نہیں کرسکتی۔"

پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی کہ وہ یوں بھی خوش ہے۔ اس نے بہت بڑی بڑی خوشیوں کی تو کبھی آرزو کی بھی نہیں تھی۔



بوا بھی وہ بات سمجھ گئی، جو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس روز میمونہ، سرمد کو کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی اور وہ میمونہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ بوا کے اندر روشنی سی پھیل گئی۔ سرمد کی وہ نظریں ایک محبت کرنے والے کی نظریں تھیں۔

بات پوری طرح سمجھ میں آگئی۔ اپنی عمر اور رشتے کے بوجھ تلے سرمد کو ابھی تک میمونہ کی محبت نظر نہیں آئی تھی۔ قدرتی بات تھی کہ ایسے میں وہ اپنی محبت پر شرم سار ہو رہا تھا۔

بوا کا اب تک کا فیصلہ یہ تھا کہ اس معاملے میں نہیں پڑیں گی۔ مگر اب انہیں برعکس سوچنا پڑا۔ یونہی چلتا رہا تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ شرم سار سرمد کسی دن چپکے سے چلا جائے گا۔ پھر کبھی نہیں آئے گا۔



بوا نے فیصلہ کرلیا کہ انہیں سرمد سے بات کرنی ہوگی۔



میمونہ نے دروازے پر دستک دی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ "میں پوچھنے آئی ہوں کہ چائے کا موڈ ...." وہ جملہ پورا نہ کرسکی۔ اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

سرمد اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میمونہ کو دیکھا اور شرمندہ ہوگیا۔

"سرمد بھائی، یہ کیا؟" میمونہ نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"گڑیا، میں جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟ میں نے تو سوچا تھا، آپ یہیں رہیں گے۔"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" سرمد نے اداسی سے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم ہوگیا کہ اس عزت کا اہل نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں بہت گھٹیا انسان ہوں۔ خود سے بہت مایوس ہوا ہوں۔ اور میں تمہیں مایوس کرنا نہیں چاہتا۔"

"مجھے تو سہارے کی امید تھی آپ سے۔"

"آیا تو میں بھی اسی ارادے سے تھا۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تم کس سے محبت کرتی ہو۔ تمہاری مدد کرنی چاہیے تھی مجھے مگر میں بہک گیا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

"دیکھو مونا میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ شہلا کے بعد زندگی گزر گئی۔ میں نے کبھی زندگی کی خوشیوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ کتنے ہی لوگوں نے ہم سفر بننا چاہا مگر میں نے گوارا نہیں کیا۔ میں خوش رہا کہ مجھے محبت کی عظمت میسر ہے۔ مجھے اپنے کردار پر ناز تھا۔ شاید مجھے اسی غرور کی سزا ملی ہے۔"

"میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔"

"میں اعتراف جرم کرلوں۔ تم مجھے سنگسار کر دو تو بھی میرا بوجھ ہلکا نہیں ہوگا۔ مجھے تم میں شہلا بھی نظر آتی ہے اور تم مونا بھی ہو۔ لیکن مونا کی حیثیت میں بھی میں تمہیں بھائی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہے نا کمینگی ....."

میمونہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے تصور میں شہلا کا چہرہ ابھرا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے آپی' اس نے بہن سے کہا کچھ کریں نا۔ کیا ہوگا؟

"مجھے جو کرنا چاہیے وہ میں نہیں کرسکتا۔ مجھے ہر رکاوٹ دور کرکے اس سے تمہاری شادی کرانی چاہیے تھی' جسے تم چاہتی ہو" سرمد اپنی کہے جا رہا تھا۔

"تو کرا دیجئے نا۔" میمونہ نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

"کیسے کرا دوں۔ میں تو پست ہوگیا۔ ذلت کی گہرائیوں میں گر گیا ہوں۔ میں خود سے تمہیں کسی کے حوالے نہیں کرسکتا۔"

"آپ اب بھی اپنے آپ میں ہی گم رہتے ہیں۔" میمونہ نے شکایت کی "آپ نے کچھ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے بھی نہیں۔"

"ہاں میں ہر جرم کا اعتراف کر رہا ہوں۔ تم مجھے جو چاہو' سزا دے لو۔"

"میں کیا سزا دے سکتی ہوں۔"

"تو میں خود یہ کام کرلوں گا۔ یہاں سے جانا میرے لئے سب سے بڑی سزا ہے۔ خزاں دیدہ پتے کی طرح اڑتا پھروں گا" وہ اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔

کچھ کیجئے نا آپی' میمونہ نے تصور میں بہن سے التجا کی' میں کیا کروں "بہن نے جواب دیا۔ تم نے تو میری امانت بھی سرمد کو نہیں دی۔

میمونہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ واقعی .... وہ یہ تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ جلدی سے ڈراور کی طرف لپکی۔ ڈراور کی اوپری دراز میں الماری کی چابیاں رکھی تھیں۔ چابیاں لے کر وہ الماری کی طرف بڑھی۔ سرمد اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ سوٹ کیس بھرنے میں مصروف تھا۔

میمونہ نے وہ لفافہ نکالا' جو سرمد کے نام تھا۔ وہ اسے لے کر سرمد کی طرف گئی "مجھے افسوس ہے سرمد بھائی۔ میں اچھی امین ثابت نہیں ہوئی" اس نے معذرت



ب لہجے میں کہا "آپی نے یہ آپ کے لئے چھوڑا تھا۔ مجھے پہلے ہی دے دینا چاہیے ۔ یاد نہیں رہا۔" اس نے لفافہ سرمد کی طرف بڑھایا۔

سرمد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' لفافہ لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی ہوں میں الجھن تھی "یہ شہلا نے دیا تھا؟ میرے لئے!"

"جی ہاں" میمونہ نے دھیرے سے کہا "یہ پڑھ لیجئے۔ میں آپ کا انتظار کر رہی ں" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔



سرمد چند لمحے لفافے کو لئے ساکت و صامت کھڑا رہا۔ اس کی حالت عجیب ہو ی تھی۔ اس لفافے نے ماضی سے اس کا ٹوٹا ہوا تعلق جوڑ دیا تھا۔ وہ ایک ایسی ب ہستی کا پیغام تھا' جس نے دس سال پہلے مرتے وقت یہ امانت رکھوائی تھی۔

ہلا دینے والی بات یہ تھی کہ یہ خط اسے پہلے نہیں ملا .... اب ملا' جب کہ وہ اس جرم سے بوجھل ہوکر سکون کی اس نگری کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اسی قع پر کیوں؟ اس کا احساس جرم اور شدید ہوگیا اور وہ خوف زدہ بھی ہوگیا۔ جانے ا میں کیا لکھا ہو۔ ممکن ہے' شہلا نے یہ مستقبل بھانپ لیا ہو۔ جان لیا ہو کہ وہ کا گھٹیا حرکت کرے گا اور اس خط میں اسے تنبیہہ کی ہو۔ اس کے ذہن میں عجیب ب خیالات آ رہے تھے ..... عجیب اور دور از کار۔ لیکن اس وقت کوئی خیال اسے راز کار نہیں لگ سکتا۔ تھا۔

وہ بے بسی سے لفافے کو گھورتا رہا پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی ٹانگیں کانپ ا ہیں۔ بے جان ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اب بھی اس فے پر جمی تھیں۔ جیسے لفافے نے اسے مسمرائز کر دیا ہو۔ وہ کوشش کے باوجود ں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔

خاصی دیر ہوگئی۔ اسے لفافہ چاک کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بیڈ پر کھلا رکھا۔ ٹ کیس اور بکھرے ہوئے کپڑے الگ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ پھر اسے خیال آیا وہ لفافہ گزرے ہوئے ماضی ہی کی سہی' مگر بہرحال ایک حقیقت ہے۔ اس سے

نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اس میں دو تہ کئے ہوئے کاغذ تھے۔ اس نے پہلا کاغذ کھولا۔ شہلا کی تحریر وہ خوب پہچانتا تھا۔ وہ ایک نظم تھی۔ عنوان تھا .... وصیت۔ وہ نظم پڑھتا گیا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے گئے۔ جادو سا ہوگیا تھا۔ جیسے شہلا اس کے سامنے کھڑی تھی اور نظم سنا رہی تھی۔ جو وہ پڑھ رہا تھا' اسے شہلا کی آواز میں سنائی دے رہا تھا۔

وعدوں کی شہادت تھے' ایفا سے عبارت تھے
جذبوں کی علامت تھے' رنگین روایت تھے
جو میری محبت تھے' جو تیری امانت تھے
وہ جھرنے سوکھ چکے' وہ پیڑ برہنہ ہیں
کاندھے پہ ہواؤں کے' سب پتے دور گئے
(انجانی بستی کی انجان فضاؤں میں)
پھولوں کے بجائے اب' خاک اڑتی ہے پھولوں کی
دل شاخ بدن پر ہے' سوکھا ہوا اک پتا
رات اتنی اندھیری ہے' ابلیس کا دل جیسے
تم کس لئے افسردہ' دم سادھے بیٹھے ہو
جب جھرنے سوکھ چکے' جب پیڑ برہنہ ہیں
آزاد ہو اب تم بھی
اپنے ہر وعدے سے' اس عہد محبت سے
جو تم نے کیا تھا کبھی' جو میں نے لیا تھا کبھی

سرمد کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ یہ کیسا پروانہ' آزادی تھا' جو دس برس پہلے جاری کیا گیا تھا اور اسے آج ملا تھا۔ اس لمحے جب وہ اپنے اندر کی آزادی کی تحریک سے ہار کر فرار اختیار کر رہا تھا۔ یہ کیا تھا؟ یہ کیسی نظم کہی تھی شہلا نے؟ یہ محبت کا کون سا درجہ تھا کہ مرتے وقت بھی وہ یہ فکر کر رہی تھی کہ عمر بھر کا قیدی گھٹ کر نہ رہ جائے۔ لہٰذا پنجرے کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ اور اس



...ادی نظم سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ شہلا کو اس پر کیسا اعتماد تھا .... کتنا یقین تھا۔ وہ ...تی تھی کہ اس پروانہ' آزادی کے بغیر وہ قید ہی رہے گا۔ کبھی آزاد نہیں ہوسکے گا۔

یہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ لیکن آزادی کا یہ پروانہ ...ہارے اندر کی کمینگی کو کوئی جواز' کوئی اثبات فراہم نہیں کرسکتا۔ یہ تمہیں میمونہ ...ے محبت کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں' یہ ہنسی خوشی ایک نارمل زندگی گزارنے کا اجازت ...مہ ہے۔ لیکن میمونہ کی خواہش نارمل نہیں۔

"تو میں کب انکار کر رہا ہوں۔" سرمد بڑبڑایا۔ "میں تو شہلا کی محبت کی عظمت ...سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اسے سلام کر رہا ہوں۔"

اس نے کھلے مفہوم کے باوجود معنویت سے بھری ہوئی اس نظم کو کئی بار پڑھا۔ ...ہاں تک کہ وہ اسے یاد ہوگئی۔ اس نظم نے ہر بار اسے پہلے سے بڑھ کر شرمندہ کیا۔

اچانک اسے دوسرے کاغذ کا خیال آیا۔ اس نے اسے کھولا۔ وہ شہلا کا خط تھا ...اس کے نام!

جان سے پیارے سرمد

سلام آخریں

یہ خط آپ کو اس وقت ملے گا' جب ہم اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔ ہمیں یہ ...ی نہیں معلوم کہ اس وقت آپ کہاں ہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ خیریت سے ہیں اور ...میابی کے زینے پر قدم رکھ چکے ہیں۔ ہماری دعا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ ...دگی میں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ ہم نہیں ملے تو اس کا صلہ اس سے بڑھ کر ہی ...ے گا۔

ہم اب جا رہے ہیں لیکن یونہی نہیں۔ آپ کو کچھ دے کر .... بہت کچھ .... ...ر سب کچھ دے کر۔ آپ کے بعد ہم نے دعائیں بہت کیں۔ کرتے ہی رہے اور ...ن کی قبولیت کا یقین بھی ہے۔ ہم نے دعا کی کہ جو خوشیاں ہمیں نہ ملیں' اللہ وہ ...ری مونا کو عطا کردے ..... ہماری ہی نہیں' آپ کی خوشیاں بھی۔ یہ دعا ہم نے بے ...ب نہیں کی۔ مونا اس کی حق دار تھی۔

آپ کو مزے کی بات بتائیں۔ یہ مونا جب شاید پانچ سال کی تھی تو ایک دن

اس نے ہمارے سامنے دعویٰ کیا کہ وہ آپ سے شادی کرے گی۔ آپ کی دلہن بنے گی۔ ہم اسے بچہ سمجھ کر ہنس دیئے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس کی زبان سے اس کا نصیب بول رہا ہے۔ بات تو اب سمجھ میں آئی ہے۔

مونا کو شاید پیدائشی طور پر آپ کی محبت ملی تھی۔ ہمیں وہ بہت چاہتی ہے لیکن اس نے ہمیشہ آپ کو ہم سے بڑھ کر چاہا۔ ہم نے بھی دیکھ لیا کہ وہ اہلیت بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ ہمارے دل میں جو آپ کی محبت رائیگاں پڑی تھی' وہ بھی ہم نے اسے سونپ دی۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آپ کا انتظار کرتی رہی ہے اور اب آپ آگئے ہیں۔ اسے مایوس نہ کیجئے گا۔

ہم دور رہ کر بھی ہمیشہ آپ کو مونا کی محبت کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم آپ تک پہنچ سکے یا نہیں۔ اب ہم آپ سے آخری التجا کر رہے ہیں۔ مونا کو اپنا لیں۔ آپ کے حصے کی تمام خوشیاں اس کے پاس موجود ہیں۔ آپ کے تصور سے بھی زیادہ۔ وہ آپ کا دامن نہیں' وجود بھی خوشیوں سے بھردے گی۔

یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ کوئی اپنے محبوب سے کسی اور سے محبت کرنے کی فرمائش کرے اور کسی کو کہنے سے ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لئے کہا ہے کہ ہماری تلقین غیر ضروری تھی۔ ہماری التجا بھی غیر ضروری ہے۔ اسے بس اجازت سمجھ لیں۔ کیونکہ ہم محبت کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں اور مونا کی محبت تو بہت طاقت ور ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کو اسیر کرلے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس لمحے کے بعد آپ بہت خوش رہیں گے۔

ہماری ہر غلطی معاف کر دیجئے گا۔ آپ کو اللہ کی امان میں دیتے ہیں۔

آپ کی شہلا

سرمد کو احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ کاغذ پر قطرے گرے اور پھیلتے گئے۔ لفظ بھی پھیلے اور شکلیں بدلنے لگے۔ روتے ہوئے لفظوں کو دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" اس نے خود سے پوچھا۔ "کیا شہلا نے



بغیر کسی تصدیق کے یہ خط لکھا ہے؟ صرف اپنے محسوسات کو سند جان کر! یہ مفروضے ہیں یا حقائق؟"

شہلا کی لکھی ہوئی ایک بات کے سچ ہونے کی تو وہ خود بھی گواہی دے سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے اندر کی کمینگی نہیں تھی تو یقیناً مونا کی محبت کی بے پناہ طاقت تھی جس نے اسے اسیر کرلیا تھا اور اس کے پاس اپنے حق میں دینے کے لئے گزرے ہوئے وقت کا' بنجر جوانی کا حوالہ تھا۔ کیف و نشاط اس کی دسترس سے کبھی دور نہیں تھے۔ خوشیاں بار بار اس کی طرف لپکی تھیں لیکن اس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیا تھا' دامن سمیٹ لیا تھا۔ اس لئے کہ اسے طلب ہی نہیں تھی۔ اور اب ... یہاں آکر اس میں تبدیلی آئی تھی تو یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کردار کی پختگی یوں ایک لمحے میں تو ڈھیر نہیں ہو جاتی۔ آثار تو پہلے سے نظر آتے ہیں۔

مگر شہلا نے جو لکھا تھا' وہ حقیقت سے ماورا اور افسانوی لگتا تھا اور وہ برسوں حقائق کے صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں پا برہنہ پھرا تھا۔ خوابوں اور انسانوں میں اس کے لئے اب بھی کشش تھی۔ لیکن اب وہ ان پر یقین نہیں کرسکتا تھا۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ فیصلہ کرنا اس کے لئے دشوار تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا "آیئے۔" اس نے کہا۔

اس کا خیال تھا کہ میمونہ آئی ہوگی مگر وہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ اس کی منتظر ہے۔

دروازہ کھلا تو انا بوا کا چہرہ نظر آیا "آیئے بوا۔"

بوا اندر آئیں مگر بیڈ پر سوٹ کیس اور بکھرے ہوئے کپڑے دیکھ کر ان کا بھی وہی حال ہوا' جو میمونہ کا ہوا تھا "سرمد میاں' یہ کیا؟ کہیں جا رہے ہو؟"

"جی ہاں بوا۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔ یہاں سے دور۔"

"محبت بھی کرتے ہو اور بھاگتے بھی ہو" بوا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

سرمد بری طرح چونکا "کیا کہہ رہی ہیں بوا؟"

"سچ کہہ رہے ہیں۔ دنیا دیکھی ہے ہم نے اور محبت تو ویسے بھی کہاں چھپتی

ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بٹیا سے محبت کرتے ہو۔"

سرمد کی نظریں جھک گئیں "تبھی تو منہ چھپا رہا ہوں۔ زمین تو نہیں پھٹے گی میرے لئے اور شرمندگی سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا" اس نے بے بسی سے کہا۔

"محبت کوئی گناہ ہے کہ شرمندہ ہو اور پھر بٹیا کا کیا دوش؟" بوا نے غصے سے کہا "اسے کیوں سزا دیتے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"نہیں جانتے کہ وہ کب سے تمہارے نام پر بیٹھی ہے۔ ایک تمہارے نام پر مرمٹی' دوسری جیتے جی مر رہی ہے۔ کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو میاں؟"

"تو کیا مونا.....؟"

"ہاں۔ اور یہ اس کے منہ سے نہیں سن سکو گے تم۔"

سرمد کے دل میں پھول سے کھل اٹھے پھر وہ بڑی بے نیازی سے جھکا اور سوٹ کیس کی پیکنگ مکمل کرنے میں مصروف ہوگیا۔

"تو تم نہیں رکو گے؟" بوا نے دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔

"جانا تو پڑے گا بوا۔"

"محبت پر شرم آتی ہے تو محبت چھوڑ دو۔ گھر کیوں چھوڑتے ہو۔"

سرمد نے کپڑے رکھ لیے تھے۔ دوسری چھوٹی چیزیں سوٹ کیس میں رکھنے کے بعد اس نے سوٹ کیس بند کیا اور بوا سے بولا۔ "آپ یہاں بیٹھیں تو۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی اہم بات کرنی ہے۔"

بوا بادل ناخواستہ بیٹھ گئیں۔ ان کے تیور بہت خراب تھے۔

"بات یہ ہے بوا کہ گھر ہی چھوڑنا پڑے گا۔ محبت تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔"

بوا کی سمجھ میں پہلے تو بات آئی ہی نہیں پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں "تو گھر کیوں چھوڑتے ہو؟" انہوں نے اعتراض کیا مگر لہجے میں محبت تھی۔

"آپ بہت سیدھی ہیں۔ معاملات کی نزاکت کو سمجھتی ہی نہیں" سرمد نے سنجیدگی سے کہا "دیکھیں' اب آپ ہی گھر کی بڑی اور ذمے دار ہیں۔ فیصلے بھی آپ ہی کو کرنے ہیں۔" اس نے بوا کا ہاتھ تھام لیا "میں آپ سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے



مایوس نہ کیجئے گا۔ آپ مونا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔"

بوا پر تو شادی مرگ کی کیفیت ہوگئی۔ چند لمحے وہ ساکت بیٹھی رہیں پھر انہیں اتنی شدت سے سرمد کی محبت آئی کہ وہ چھلک اٹھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سرمد کا چہرہ تھام کر اسے جھکایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر انہوں نے بے حد وقار سے کہا "سرمد میاں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ ہم نے ہمیشہ اسے پھولوں کی طرح رکھا ہے..."

"میں بھی اسے پھولوں ہی کی طرح رکھوں گا بوا۔"

"ہمیں اعتماد ہے تم پر میاں۔"

"بس تو بوا' میں اتوار کو مختصر سی برات لے کر آؤں گا..... بس چند دوست ہوں گے۔"

"لو .... اتوار میں دن ہی کتنے ہیں" بوا نے دہلنے کی اداکاری کی۔ وہ اس وقت پوری طرح بیٹی کی ماں کا رول کر رہی تھیں۔

"ہتھیلی پر ترسوں نہ جماؤ میاں۔"

"چھوڑیں بوا' سادگی کا زمانہ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ ۱۳ کو شادی ہوگی۔ ۱۴ کو ہم ہنی مون کے لئے روانہ ہوں گے۔ ۲۷ کو انشاء اللہ واپس آئیں گے۔ پھر اسکول بھی کھل جائیں گے نا۔"

"ہاں۔ مگر کیا بٹیا اسکول چلاتی رہے گی؟" بوا نے اچنبھے سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ آپ جانتی ہیں بوا۔ میں خواب دیکھنے' والا' خواب دینے والا ہوں۔ خواب کیسے چھین سکتا ہوں۔"

بوا خوش ہوگئیں۔ وہ یہ سوچ کر ہول رہی تھیں کہ ان کا کیا ہوگا۔ بچے پھر چھن جائیں گے ان سے! "تم بہت اچھے ہو سرمد میاں۔"

"میں اب چلتا ہوں بوا" سرمد نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا "آپ مونا کو کچھ نہ بتائیے گا۔"

بوا نے اثبات میں سرہلایا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

○

میمونہ کو سرمد کا انتظار' کرتے ہوئے کافی دیر ہوگئی۔ اب تک وہ یہ سوچ کر وقت دے رہی تھی کہ اسے آپی کا خط ... یا وہ جو کچھ بھی ہے' پڑھ کر سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن اب اسے تشویش ہونے لگی۔

بالآخر وہ کمرے کی طرف گئی۔ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر جھانکا تو کمرا خالی تھا۔ سرمد کا سوٹ کیس وہاں نظر آرہا تھا نہ کوئی اور چیز۔ اس نے اندر جا کر باتھ روم کا جائزہ لیا۔ سرمد کا شیو کا سامان اور ٹوتھ برش تک غائب تھا۔

عجیب سی کیفیت میں وہ کمرے سے نکلی۔ اسے غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی سرمد بھائی چلے گئے۔ آپی کے سمجھانے کے باوجود! اور اگر جانا ہی تھا تو اس کے بھی آداب تھے۔ اسے بتا کر ہی چلے جاتے۔ کوئی زبردستی تو کسی کو روک نہیں سکتا۔ وہ کہہ کر بھی آئی تھی کہ کمرے میں ان کا انتظار کر رہی ہے۔

بوا کچن میں مصروف تھیں "بوا .... سرمد بھائی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سرمد میاں؟ وہ وہ چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔ پوچھا تھا مگر انہوں نے بتایا نہیں۔ کہتے تھے۔ جانا ہی ہے۔ رک نہیں سکتا۔"

"دیکھیں تو بوا" اس نے بے حد دکھ سے کہا "ہم نے کیا کیا سوچا تھا اور وہ یوں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"اے بٹیا' وہ یہاں کیسے رہ سکتے تھے" بوا بولیں "انہیں تو جانا ہی تھا۔"

"کیوں؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ شادی جو کر رہے ہیں۔ اپنی بیوی کو کیا یہاں رکھتے۔ بھئی انہیں گھر بنانا بسانا ہے اپنا۔"

کہاں تو میمونہ اتنا جھنجلا کر بول رہی تھی' کہاں ایک دم سن ہو کر رہ گئی۔ آواز ہی بند ہوگئی۔ سرمد کا جانا بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ ایسے میں وہ بھلا کیسے رکتے۔ پہلے ہی کسی اور کا انتخاب کر چکے تھے۔ مگر پھر مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے؟ اسے



سرمد کی گفتگو یاد آئی۔ ذہن بری طرح الجھنے لگا۔

فون کی گھنٹی نے اس وقت بڑا سہارا دیا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف لپکی۔ فون کے گھر میں تین ایکس ٹینشن تھے۔ ایک اوپری منزل پر اسکول میں' دوسرا اس کے کمرے میں جو ابھی تھوڑی دیر تک اس کے پاس تھا' اور تیسرا ڈرائنگ روم میں۔ اس وقت وہ بس ڈرائنگ روم میں ہی جاسکتی تھی۔

اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں ہیلو کہا۔

دوسری طرف سے سرمد نے کہا "مونا اصولا" یہ بات تم سے بوا کو پوچھنی چاہیے...."

"کسی کو کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہیے مجھ سے" وہ چلائی۔

سرمد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "لیکن میں نے سوچا' میں ہی پوچھ لوں۔ میں نہیں چاہتا' تم مجھے مسترد کرنے کی اطلاع کسی اور کو دو۔"

میمونہ بری طرح بوکھلا گئی "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں نے بوا سے تمہارا رشتہ مانگا تھا۔ انہوں نے فوراً جواب دے دیا۔ میں نے کہا بھی کہ پہلے مونا سے پوچھ لیں۔ وہ بولیں' کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم ہی فیصلہ کرنے والے ہیں۔ سو میں نے سوچا' تم سے خود پوچھ لوں۔"

"بوا نے ٹھیک کہا ہے" وہ مجوب لہجے میں بولی۔

"کیا خاک ٹھیک کہا ہے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہے۔"

مگر اب میمونہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خود سے بھی منہ چھپا لے "وہ بھی ٹھیک ہے" اس نے کہا "آپ .... آپ بہت خراب ہیں" پھر وہ ریسیور رکھ کر اپنے پرانے کمرے کی طرف بھاگی۔ ذرا دیر پہلے وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کبھی وہاں نہیں جاسکے گی۔



وہ سہاگ رات تھی!

سب لوگ چلے گئے تو بوا سرمد کا ہاتھ تھام کر اس کمرے کی طرف چل دیں جو

کبھی میمونہ کا تھا مگر اس وقت حجلۂ عروسی تھا "کل کس وقت جاؤ گے تم لوگ!" انہوں نے پوچھا۔

"ساڑھے پانچ بجے کی فلائٹ ہے اماں۔" سرمد نے کہا "چار بجے نکلیں گے ہم۔"

بوا چلتے چلتے رک گئیں "تم نے کیا کہا ہمیں؟" انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ اب میں آپ کو اماں کہوں گا۔ اب کون رہ گیا ہے ہمارا۔ آپ ہی میں سب رشتے ہیں، سبھی کچھ ہیں آپ۔"

بوا کا دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلکنے لگیں "بیٹے۔"

سرمد نے ان کی آنکھیں پونچھ دیں۔ "اب روئیے گا نہیں۔"

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں بیٹے" وہ دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ "جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" بوا نے دعا دی۔ "کسی وقت بھی کوئی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔ ہمارا دروازہ کھلا ہوگا۔"

"کوئی ضرورت نہیں اماں۔ آپ آرام سے سوئیے گا۔"

"سونا کیسا" بوا بڑے جوش سے بولیں "اتنی مہمان داری میں کوئی سوتا ہے۔"

"لیکن بوا مہمان تو سب جا چکے۔" سرمد نے حیرت سے کہا۔

مگر بوا اپنی کہتی رہیں ".... آج تو سب بچھڑے ہوئے آئیں گے یہاں۔ صاحب، باجی، شہلا .... آج تو جشن ہوگا یہاں۔ پوری رات جاگیں گے ہم" ان کی آواز چٹک رہی تھی۔ پھر وہ پلٹیں اور چل دیں۔ سرمد نم آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

حجلۂ عروسی بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ کچے پھولوں کی لڑیوں کا دائرہ بیڈ کے گرد ہالہ سا بنا دیا تھا۔ میمونہ گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔

سرمد بڑھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا "السلام علیکم" اس نے آہستہ سے کہا۔ میمونہ نے بہت دھیرے سے جواب دیا "میں گھونگھٹ اٹھا سکتا ہوں؟" سرمد نے پوچھا۔ میمونہ کا جھکا ہوا سر تھوڑا سا اور جھک گیا۔

سرمد نے ہاتھ بڑھائے مگر کسی خیال سے رک گیا۔ اس نے جیب سے چھوٹی سی



ڈبیا نکال کر کھولی اور انگوٹھی نکال کر میمونہ کی انگلی میں پہنا دی "یہ ہے تمہاری منہ دکھائی کا ایک حصہ" اس نے کہا اور پھر گھونگھٹ اٹھا دیا۔ دلہن بنی میمونہ کو دیکھ کر وہ مبہوت ہوگیا۔

میمونہ نے بہت غور سے منہ دکھائی کی انگوٹھی کو دیکھا۔

"چاندی کی ہے اور یہ نگ نہیں، شیشہ ہے" سرمد نے کہا۔

میمونہ نے انگوٹھی کو چوم لیا "یہ مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی ... بہت عزیز۔"

"میں نے تمہیں شادی کے جوڑے اور اس انگوٹھی کے سوا کچھ نہیں دیا۔" سرمد نے افسردگی سے کہا۔

"یہ پھولوں کا زیور اچھا نہیں لگا؟" میمونہ نے معصومیت سے پوچھا۔ "یہ آپ ہی نے تو بھجوایا تھا۔"

"میں کبھی تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں دوں گا جو مجھے پسند نہ ہو" سرمد نے کہا "لیکن میں دنیاوی بات کر رہا تھا۔ میں نے تمہیں کوئی زیور نہیں دیا۔"

"دنیا کی بات چھوڑیئے۔ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں مگر تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری یہ منہ دکھائی نامکمل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ ہنی مون سے واپسی پر میں ایک سرپرائز کی صورت تمہیں دوں گا۔"

"میں اس کا انتظار کروں گی" میمونہ نے کہا "ایک بات کہوں۔ آج ہم رت جگا کریں گے۔"

"یقیناً۔"

"ہم ساری رات باتیں کریں گے" یہ کہتے کہتے میمونہ کی نظریں جھک گئیں۔

"تم شاید یقین نہ کرو، میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد کمرے میں داخل ہوا تھا۔"

"یقین کیوں نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے فیصلہ کرنے کے بعد یہ خیال میرے دل میں آیا تھا۔"

سرمد بڑی محبت سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا "تم نے مجھے وہ خوشیاں دی ہیں جن کا تصور بھی میں بہت .... بہت پہلے ترک کر چکا تھا۔"

"ہم پر بہت لوگوں کے احسانات ہیں۔"

"اور ہم احسان فراموش نہیں۔"

"اختر بھائی نے وہ فرض بھی ادا کیا جو ان کا نہیں' ارشد بھائی کا تھا" میمونہ نے کہا۔

اور یہ حقیقت تھی۔ بوا نے اختر کو فون کیا تھا اور اختر فوراً ہی دوڑا چلا آیا تھا۔ وہ آیا تو بوا نے اسے خوش خبری سنائی۔ وہ سیدھا میمونہ کے کمرے کی طرف گیا اور دروازے پر دستک دی۔ میمونہ نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر گھبرا گئی کہ وہ اسے چھیڑے گا۔ لیکن وہ بہت سنجیدہ تھا "میمونہ' تمہیں یہ رشتہ قبول ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

میمونہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمہیں معلوم تو ہے؟"

"معلوم ہے لیکن ذمے داری بڑی ہے۔ اس لئے احتیاطاً تصدیق کر رہا ہوں" اختر نے گہری سانس لی۔ "دیکھو میمونہ' آج ہی نہیں' یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ مجھ سے تم ہر بات کر سکتی ہو۔ میں تمہارا دوست بھی ہوں' بھائی بھی اور سرپرست بھی .... تایا ابو کی جگہ سمجھنا مجھے اور کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ میں جو موجود ہوں۔"

اور اختر ہی نے تمام انتظامات کئے تھے۔ اس نے حق ادا کر دیا تھا۔

"بہت پیارا آدمی ہے۔ بہت معصوم۔" سرمد نے کہا۔ "مجھ سے کہہ رہا تھا... سرمد بھائی' آپ میرے بڑے اور قابل احترام ہیں۔ لیکن میمونہ میری چھوٹی بہن ہے۔ رشتے میں' میں آپ سے بڑا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو کبھی جھجکئے گا نہیں۔ آپ کا حق ہے مجھ پر۔"

"ہاں۔ بہت اچھے ہیں اختر بھائی" میمونہ بولی۔

ان دونوں نے بوا کے .... اور ہر اس شخص کے متعلق باتیں کیں' جس سے ان کا تعلق تھا۔

"کل ہم کہاں جائیں گے؟ کیا پروگرام ہے؟" میمونہ نے ذرا دیر بعد پوچھا۔

"اسلام آباد اور پھر مری۔"

"بس؟"



"کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"چلنا ہے تو پھر جھیل سیف الملوک تک چلیں۔"

"جہاں تک کہو گی' چلیں گے۔"

میمونہ مسکرا دی پھر اس کی آنکھوں میں خواب اتر آئے "میرا ایک خواب ہے۔ میں پورے چاند کی رات جھیل کے کنارے گزارنا چاہتی ہوں۔"

"اور میں تمہارے ہر خواب کو تعبیر دینا چاہتا ہوں۔" سرمد نے بے حد محبت سے کہا۔

"لیکن یہ مشکل ہے۔ وہاں قیام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو ہم کھلے آسمان کے نیچے رات گزار لیں گے۔"

میمونہ ہنس دی "جھیل کے متعلق کچھ جانتے نہیں نا' اس لئے کہہ رہے ہیں۔ اتنی سردی ہوتی ہے کہ آدمی اکڑ کر مر جائے۔"

"اور تم ایسے باتیں کر رہی ہو' جیسے بارہا جا چکی ہو" سرمد نے خوش دلی سے کہا۔

"میں نے پڑھا بہت ہے جھیل کے بارے میں۔"

"پھر بھی کوئی جگہ تو ہو گی ٹھہرنے کی۔"

"ایک ریسٹ ہاؤس ہے مگر وہ عام لوگوں کو نہیں مل سکتا۔"

"بس تم بے فکر ہو جاؤ" سرمد نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "تمہیں اس خواب کی تعبیر بھی انشاء اللہ ضرور ملے گی۔"

رات گزر گئی۔ ان کی باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ فجر سے ذرا پہلے وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔ ان کے چہروں پر بچوں کی سی معصومیت اور پاکیزگی تھی۔



میمونہ کا وہ پہلا سفر تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ ہزارہ کے متعلق اس کی معلومات بس کتابی تھیں۔ اور سرمد تو کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

لیکن اسے یہ جان کر بے حد خوش گوار حیرت ہوئی کہ اس کا خواب دیکھنے والا جیون ساتھی عملی زندگی کا مرد میدان بھی ہے۔

اسلام آباد میں انہوں نے رات گزاری۔ صبح ناشتے کے بعد سرمد اکیلا کہیں چلا گیا۔ دوپہر کو واپس آیا تو بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا مگر چہرے پر بشاشت تھی "کھانا منگواؤ جلدی سے۔ پھر روانگی کی تیاری کرو۔ کھانا کھاتے ہی نکل لیں گے۔"

کھانا کھا کر وہ ہوٹل سے نکلے۔ ان کے ساتھ سامان بھی تھا۔ میمونہ پریشان تھی کہ اب سرمد رہنمائی کے لئے اس کی طرف دیکھے گا تو وہ کیا کرے گی۔ اس کو تو بس کے اڈوں کا بھی پتا نہیں تھا۔ نہ ہی روٹ اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔

مگر اسے حیرت ہوئی۔ سرمد نے پورٹر سے سامان سامنے کھڑی جیپ میں رکھنے کو کہا۔ وہ فور وھیل ڈرائیو جیپ تھی۔ میمونہ اور سرمد پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔

"چلیں میب۔"

"ہاں محبت خان۔" سرمد نے کہا۔

کسی جگہ کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ جیپ اسٹارٹ ہوگئی۔ سرمد نے بیگ سے ایک کتابچہ نکالا۔ اس میں رنگین نقشہ بھی تھا۔ وہ نقشے کا جائزہ لیتا اور اس پر نشان لگاتا رہا۔ ساتھ ہی وہ کچھ نوٹ بھی کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ میں اس کام سے نمٹ کر اس نے نقشے کو بیگ میں رکھ دیا "سوری مونا۔ تمہیں اتنی دیر کوفت ہوئی ہوگی۔ Now I am all yours" اس نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہ سوچ کر الجھ رہی ہوں کہ آپ نجانے کیا کرتے پھر رہے ہیں۔"

"تم صرف انجوائے کرو۔ کوئی الجھن پالنے کی ضرورت نہیں تمہیں" سرمد نے کہا "اس وقت ہم مری چل رہے ہیں۔"

"جیپ اب اوپر کی طرف بل کھاتی چڑھائی پر رواں تھی۔ سبزے سے ڈھکی گہری کھائیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے جسموں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر وہ خوب صورت گردو پیش میں گم ہوگئے۔

مری میں وہ دو دن رکے۔ مری میں قیام کی پہلی رات سرمد نے میمونہ سے کہا "وہ کتاب تو دکھاؤ مجھے ... سفر در سفر"



سفر در سفر بھی عجیب انداز میں پڑھی گئی۔ کبھی سرمد سناتا اور کبھی میمونہ۔ ہرے ہوتے' قہقہے لگائے جاتے' ایک دوسرے کو وارفتگی سے تکا جاتا۔ مگر وہ ایک سرے کی قربت کو بہت محتاط انداز میں انجوائے کر رہے تھے۔

دو دن بعد انہوں نے سفر شروع کیا۔ ایوبیہ کے راستے وہ نتھیا گلی پہنچے۔ وہاں وہ یادہ دیر نہیں رکے۔ کھانا کھایا اور بندروں کی مدارات کی۔ بندر یہاں آنے والوں ے اتنے مانوس تھے کہ ایک آہٹ پر جمع ہوگئے۔ ہر طرف سے ان کی چیں چیں سنائی ینے لگی۔ انہوں نے پھل اچھالنے شروع کئے تو چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ کچھ شریر در ان کے ہاتھوں سے ناشپاتیاں لے بھاگے۔

"ایک پکڑ کر نہ لے چلیں" سرمد نے کہا۔

میمونہ کے جواب دینے سے پہلے ہی محبت خان بول اٹھا "نہیں میب۔ بندر کڑنا منع ہے یہاں۔"

"چھوڑو محبت خان۔ منع تو بہت کچھ ہے اس ملک میں۔ رشوت لینا بھی تو منع ہے" سرمد بولا۔

"پتا نہیں میب۔ پرئیاں پکڑ لیتے ہیں۔ جرمانہ لگتا ہے۔ پھر بی کوئی لوگ پکڑ لے جاتا ہے بندر مندر۔"

"جرمانے سے پہلے نذرانہ دیں تو سب ٹھیک ہے لیکن محبت خان' میں تو یونہی کہ رہا تھا۔ ہمیں کیا کرنا ہے بندر کا۔"

وہ چل دیئے۔ راستے بہت خوبصورت تھے۔ اتنے خوب صورت کہ ان کی طرناکی سے خوف بھی نہیں آپا رہا تھا۔

موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان پر گھٹا تھی۔ پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ بت خان نے ایک سائیڈ میں جیپ روکی اور پلٹ کر بولا "میب ... چھت کھول دوں ڑی کا؟"

سرمد نے سوالیہ نظروں سے میمونہ کو دیکھا۔ اس نے دھیرے سے نفی میں سرہلا ا۔ سرمد نے محبت خان سے کہا "رہنے دو۔ بارش تیز تو ہے نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو میب۔ ام یہ سوچ کر بولا کہ شہر کا لوگ نازک ہوتا۔"

"ہر جگہ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں محبت خان۔ یہاں بھی تو ایسے لوگ ہوتے ہوں گے کہ جسم پر پھوار پڑی اور چھینکیں شروع۔"

"ہوتا ہے .... ہوتا ہے" محبت خان نے سرہلا کر کہا "ام لوگ ان کو شہری لوگ بولتا۔" "یہ تو زیادتی ہے" سرمد نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا "کمزوری کو شہر سے منسوب کرتے ہو۔ پھر ہمیں تو تم دیہاتی بولو گے۔"

"دیہاتی نئیں میب' پہاڑی بولے گا" محبت خان نے سادگی سے کہا۔

محبت خان میں ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ بلا ضرورت کبھی نہیں بولتا تھا۔ راستے میں ہر قابل ذکر چیز کے بارے میں ضرور بتاتا تھا۔ وہ ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتے رہے پھر سرمد نے ایک بیگ سے دو رین کوٹ نکالے اور ایک میمونہ کی طرف بڑھایا "پہن لو۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ کچھ پتا نہیں' بھیگنا کوئی مسئلہ بن جائے۔" اس نے خود بھی رین کوٹ پہن لیا۔ میمونہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی "کیا دیکھ رہی ہو؟" سرمد نے پوچھا۔

"یہ رین کوٹ کہاں سے آئے؟"

"اس بیگ سے" سرمد نے سادگی سے اشارہ کیا "یہ ایمرجنسی بیگ ہے۔ اس میں وہ چیزیں ہیں' جن کی اچانک کسی وقت ضرورت پڑسکتی ہے۔"

میمونہ کی نظروں سے ستائش جھلکنے لگی۔ "آپ نے ہر چیز کا خیال رکھا ہے! یہ جیپ ..."

"یہی ہمیں اسلام آباد واپس پہنچائے گی" سرمد نے کہا "اور یہی وہ واحد گاڑی ہے جو میری معلومات کے مطابق ان علاقوں میں ہمیں ہر جگہ لے جاسکتی ہے۔ اصل میں میں صرف خواب آنکھیں بند کرکے دیکھتا ہوں۔ تعبیر کے لئے آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ضروری ہیں اور ذہن سمیت تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔"

"ارے .... یہ کیا۔ ہاؤ بیوٹی فل!"

میمونہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو مبہوت ہوکر رہ گیا۔ جیپ نے ابھی ابھی ایک موڑ کاٹا تھا .... اور صورت حال یہ تھی کہ کہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ سامنے کوئی سڑک تھی' نہ دائیں بائیں کوئی پہاڑ۔ جیسے



وں کی ایک فوج ظفرموج نیچے اتر آئی تھی۔ اور بادل اتنے تھے کہ انہوں نے سب ھ ڈھانپ لیا تھا۔ وہ متحرک بادل تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیپ میں بھی گھس آئے۔

محبت خان نے جیپ کی ہیڈلائٹس روشن کر دیں مگر وہ روشنی بھی بادلوں کی ند سے لڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ تین چار فٹ سے آگے دیکھنا ناممکن تھا۔ محبت ن نے جیپ کی رفتار بہت کم کردی۔ ایک مناسب سی جگہ اس نے جیپ کھڑی ی "ابی میب' دعا کرو۔ یہ مصیبت ٹلے۔ اتنا خطرہ میں گاڑی نئیں چلا سکتا۔"

"یہ مصیبت ہے" سرمد نے محبت خان پر آنکھیں نکالیں "کیا حسین منظر ہے۔"

محبت خان نے اسے یوں دیکھا' جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو "اس سڑک پر یہ مصیبت ہے میب۔"

سرمد اور میمونہ ٹہلنے لگے۔ محبت خان نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کھائی کی ب نہ جائیں۔ پہاڑ والی سمت رہیں اور دائیں بائیں بھی زیادہ نہ بڑھیں۔ ذرا سا پھر کر ان دونوں کو بھی اندازہ ہوگیا کہ یوں چلنا خطرناک ہے۔ پتا ہی نہیں چل رہا کہ اگلا قدم کہاں ہوگا۔

میمونہ نے تھرماس میں سے چائے نکالی اور دونوں چائے پینے لگے۔ جیپ میں کر وہ اس خوب صورتی سے زیادہ لطف اندوز ہوسکتے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک دم ہی بادل ہٹ گئے۔ محبت خان نے اطمینان کی سانس لی اور پ دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔

"میب .... یہ کالا باغ ہے" ایک جگہ محبت خان نے بتایا۔ "گورنر کالا باغ ی کا تھا۔"

رات انہوں نے ایبٹ آباد میں گزاری۔ اگلے روز وہ ٹھنڈیائی گئے۔ وہاں سے ا میں شملہ پہاڑی۔ واپسی پر سرمد نے محبت خان سے پوچھا۔ "تم کہاں کے ہو خان؟"

"ام کاغان کا ہے میب۔"

میمونہ خوش ہوگئی "واہ ... تو جھیل سیف الملوک سے تو آپ واقف ہوں ر"

"وہ تو امارا گھر ہے بی بی صیب۔"

اگلے روز وہ ایبٹ آباد سے روانہ ہوگئے۔ ان کی منزل بالا کوٹ تھی، جہاں سے انہیں شوگران جانا تھا۔ اب محبت خان بول رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ اس سے جھیل سیف الملوک کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔

"خان .... جھیل پر رات گزار سکتے ہیں؟" سرمد نے پوچھا۔

"گزار سکتے ہیں صیب، پر اچھا یہی ہے کہ دن ڈھلنے سے پہلے واپس آجائیں۔"

"کیوں بھئی؟"

"وہ عجب جگہ ہے صیب، جادو والا۔ رات کو اس کا جادو بہت خطرناک ہوتا ہے۔"

"کیسے؟"

"رات کو جھیل آدمی کو پاگل بناتا ... اپنی طرف کھینچتا۔ ایسائی ایک آدمی جھیل میں اتر گیا تھا...."

"نہیں بھئی۔"

"یہ سچی بات ہے صیب۔ وہ چاند رات تھا۔"

"ہم بھی پورے چاند کی رات کو وہاں ٹھہریں گے" سرمد نے اسے بتایا پھر پوچھ "وہاں کیسے رک سکتے ہیں؟"

"ایک سرکاری گھر ہے صیب مگر اس کے لئے اجازت لینا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ خیمہ لگا کر بھی رہتا۔"

"کیا رات کو وہاں بہت بھیڑ ہوتی ہے؟"

"نئیں صیب۔ کون رکتا ہے وہاں۔ کبھی کوئی سرپھرا لوگ ہو تو الگ بات۔"

سرمد مسکرا دیا "ام بھی سرپھرا لوگ ہے محبت خاں۔"



شوگران انہیں بہت اچھا لگا۔ کاغان میں ایک دن زبردستی محبت خان نے ان کی مہمان داری کی پھر وہ ناران چلے گئے۔ ایک دن وہاں گزارا۔ اگلے روز کا تصور ہی



ان کے لئے سحر انگیز تھا۔ وہ سیف الملوک جا رہے تھے اور وہ چودھویں چاند کی رات تھی۔

ناران میں اپنے کمرے میں میمونہ نے سرمد سے پوچھا "ہم رات وہاں رکیں گے نا؟"

"انشاء اللہ۔"

"مگر کہاں؟ ٹینٹ تو ہے نہیں ہمارے پاس۔"

"دیکھا جائے گا۔ سو جاؤ۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"میں تو سو رہا ہوں۔ کل رات جاگنا ہوگا۔"

اس خیال سے میمونہ بھی سو گئی۔

جھیل دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئے۔ اتنی خوبصورتی کا تو انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پہاڑوں کے بیضوی فریم مین انگوٹھی کے بیضوی نگینے جیسی جھیل کا آئینہ جڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف پہاڑ تھے، جس پر پڑے ہوئے کئی گلیشیئر جھیل میں گرے ہوئے تھے۔

دن میں جھیل پر کافی ہجوم تھا۔ انہیں کراچی کی ایک فیملی مل گئی۔ وہ ان سے گھل مل گئے۔ والدین کے ساتھ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیاں میمونہ پر فدا ہوگئیں اور تمام وقت اس سے باتیں کرتی رہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر سرمد نے کہا "مونا ..... میں ابھی آتا ہوں۔ بس ایک گھنٹہ لگے گا۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"ایک ضروری کام ہے۔ محبت خان کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔"

انہی پہاڑوں میں سے ایک کے پیچھے ایک بستی تھی۔ سرمد کو بتایا گیا کہ جھیل والے ریسٹ ہاؤس کا چوکی دار جناب گل وہیں رہتا ہے۔ وہ چھوٹی سی بستی تھی۔ جناب گل کا پتا دو منٹ میں چل گیا۔ جناب گل بڑی خوش اخلاقی سے ملا "حکم کریں جی۔"

"مجھے شفیق صاحب نے بھیجا ہے۔ ناران والے شفیق صاحب۔" سرمد نے کہا۔

شفیق صاحب کو وہ جانتا نہیں تھا۔ ان کا پتا اسلام آباد کے صدیقی صاحب نے اسے دیا تھا۔

"ٹھیک ہے سر۔ آپ حکم کریں۔"

"ہم رات ریسٹ ہاؤس میں رکنا چاہتے ہیں۔"

"میں شام کو آکر کھول دوں گا سر اور کوئی ضرورت ہو تو بولیں۔"

"کھانے پینے کا کیا ہوگا؟"

"چولھا وہاں ہے سر۔ میں مرغی پکا دوں گا۔ روٹی بھی گھر سے لے آؤں گا لیکن سر میں وہاں رکوں گا نہیں۔ صبح سویرے ناشتا لے کر آؤں گا۔"

"رکے گا ام بھی نہیں صیب۔" محبت خان نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر؟" سرمد نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ام ناران چلا جائے گا۔ صبح میں آجائے گا۔"

"تم میرے مہمان بنو خان۔" جناب گل نے اسے پیشکش کی۔ "صبح میرے ساتھ چلے چلنا۔"

ذرا ہچکچاہٹ کے بعد محبت خان مان گیا۔ سرمد نے جناب گل کو پانچ سو کا نوٹ دیا "چائے کا سامان بھی لے آنا۔" اس نے کہا۔

وہ واپس آگئے۔ پانچ بجے سے بھیڑ چھٹنے لگی۔ ساڑھے چھ بجے تک وہاں ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں رہا۔ سورج ڈھلنے سے ذرا دیر پہلے جناب گل سامان لے کر آگیا۔ اس نے ریسٹ ہاؤس کھولا پھر وہ مرغی پکانے میں مصروف ہوگیا۔

انہیں کھانا کھلانے کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔ محبت خان اس کے ساتھ تھا۔

ریسٹ ہاؤس آرام دہ تھا۔ نرم گرم بستر کی اہمیت کا اب انہیں اندازہ ہو رہا تھا۔ باہر پہلے خوب موسلا دھار بارش ہوئی۔ سرد ہوا کی تیزی اور کاٹ بڑھ گئی۔ سرمد نے اپنا ایمرجنسی بیگ کھول کر اس میں سے گرم کپڑے نکالے اور میمونہ کی طرف بڑھائے مگر گرم کپڑوں کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔

ریسٹ ہاؤس میں انہیں ایک بات بہت عجیب لگی بلکہ وہ بہت بڑی کمی تھی۔ وہاں دونوں پہلوؤں کی جانب چھوٹی کھڑکیاں تھیں لیکن سامنے والے حصے میں جو جھیل



کے رخ پر تھا، کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ حالانکہ ہونی چاہیے تھی۔ یوں وہاں سے جھیل کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

انہوں نے دروازہ کھولا اور برآمدے میں آگئے لیکن باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جھیل تک نظر نہیں آرہی تھی۔ بس انہیں معلوم تھا کہ جھیل سامنے ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر ان سے آگے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"اللہ .... سب کچھ کتنا ڈراؤنا لگ رہا ہے۔" میمونہ نے ... جھرجھری لے کر کہا۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"واقعی ... دن میں کتنا خوب صورت سماں تھا۔" سرمد بولا۔ اس وقت تو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ یہ وہی جگہ ہے۔"

برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر انہوں نے ہاتھ باہر پھیلائے۔ اب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پانی برف کی طرح سرد تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے جھیل کی سمت دیکھتے رہے، جہاں درحقیقت دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

اس وقت بجلی چمکی اور ایک لمحے کو سب کچھ جگمگا گیا۔ اس لمحے میں سامنے والے برف پوش پہاڑ چمکے .... اور انہیں جھیل بھی نظر آئی۔ لیکن جھیل کا منظر کچھ خوشگوار نہیں تھا۔ ساکت جھیل کا پانی بالکل سیاہ نظر آرہا تھا۔ جیسے وہ لوہے کی سطح ہو۔ ان کے دل عجیب سے ہوگئے "ہم خوامخواہ ہی رکے۔" میمونہ نے مایوسی سے کہا۔

"اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔" سرمد نے اسے ٹوکا۔

"سب کچھ اتنا خوفناک لگ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کیا پتا ..... لوگ یونہی اتنی تعریفیں نہیں کرتے ہوں گے..."

"کیا پتا۔ مگر یہاں اتنے اندھیرے میں کوئی کیا دیکھ سکتا ہے۔"

"مت بھولو کہ یہ چودھویں کی رات ہے۔"

"لیکن آسمان پر گھنا ہے۔ یہاں تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

"تمہارا خواب سچا ہے تو تعبیر بھی ملے گی۔" سرمد نے اسے تسلی دی "دیکھونا،

ہم نے کوشش تو کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چاند ضرور نکلے گا۔"

میمونہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ مایوس تھی۔ ڈر لگ رہا تھا۔ مگر چند منٹ بعد سرمد کی بات سچ ہوگئی۔ سیاہ گھٹا ایک طرف سمٹتی گئی اور نیلا آسمان نمایاں ہوتا گیا۔ تارے بھی نظر آنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کھل گیا اور یہی نہیں، آسمان پر ستاروں کی گنجان آبادی بھی تھی۔

اندھیرا شاید اتنا گہرا تھا کہ ستاروں نے بھی اچھی خاصی روشنی کردی۔ پہاڑ اب ہیولوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ جبکہ پہلے انہیں تصور میں بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا اور جہاں جہاں برف تھی، وہاں ستاروں کی دھیمی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ برف سے رنگ برنگی شعاعیں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھو، اب جھیل بھی نظر آرہی ہے۔" سرمد نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اب بھی ڈراؤنی لگ رہی ہے۔"

بات سچی تھی۔ وہاں خوب صورتی تھی تو اتنی کہ جھیل کے پانی میں ستاروں کا عکس نظر آرہا تھا مگر جھیل کا رنگ اب بھی سیاہ تھا۔ وہ ایسے سیاہ آنچل کی طرح لگ رہی تھی، جس میں رنگ برنگے ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔

"باہر چلیں۔ ٹہلیں گے۔" سرمد نے تجویز پیش کی۔

"یہیں ٹھیک ہیں۔ بیٹھے رہیں۔"

یہ ضرور تھا کہ اب وہ ٹہل سکتے تھے مگر سرمد نے زور نہیں دیا۔ میمونہ ڈر رہی تھی۔ اسے بھی مایوسی ہونے لگی۔ خوامخواہ ہی رکے۔ اس نے سوچا۔ ایسے میں تو اچھی نیند بھی نہیں آسکتی۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ وہ گھڑی سے نظر ہٹا ہی رہا تھا کہ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی اور سب کچھ بدل گیا۔

مغربی پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں اچانک ہی جگمگا اٹھیں۔ قدرتی طور پر انہوں نے سر گھما کر اسی طرف دیکھا۔ اس بار کی جگمگاہٹ وقتی نہیں تھی بلکہ چمک بتدریج بڑھ رہی تھی بلکہ جھیل کا اس طرف کا حصہ بھی جگمگانے لگا تھا۔



اس لمحے سرمد کی نظر خودبخود مخالف سمت کی طرف اٹھی۔ اسے اپنے سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ چند لمحے تو وہ بت بنا رہا۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔ "مون، ادھر دیکھو۔"

میمونہ نے بھی ادھر دیکھا اور وہ بھی سحر زدہ ہوکر رہ گئی!

مشرقی سمت کے پہاڑ کی ایک چوٹی سے ایک بہت بڑی روشن گیند دھیرے دھیرے سر اٹھا رہی تھی۔

وہ سحر زدہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ روشن گیند بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پہاڑ کی چوٹی کے اوپر آگئی۔ اس بار گردوپیش پوری طرح روشن ہوگیا۔ سب کچھ یوں جگمگایا کہ ان کی نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں۔ اگر انہوں نے تیزی سے اپنے بازو آنکھوں پر نہ رکھ لیے ہوتے تو شاید وہ بینائی ہی سے محروم ہو جاتے۔ بازو آنکھوں پر ہونے کے باوجود وہ جگمگاہٹ ان کی آنکھوں تک پہنچ تھی اور اس کے بعد جیسے ایک دم اندھیرا سا ہوگیا۔

وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے کو بھی بھول گئے!

سرمد نے دھیرے دھیرے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ روشنی اب بھی نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ تاہم اب وہ دیکھ سکتا تھا۔

"آنکھیں کھولو مون۔" اس نے میمونہ کو پکارا۔

میمونہ نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ سحر زدہ سے اس حسین منظر کو تکے جا رہے تھے۔

پہاڑ واضح طور پر حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے نظریں جھکا کر جھیل کو دیکھا "مائی گاڈ" سرمد کے ہونٹوں سے سسکاری نکلی۔ میمونہ ساکت وصامت بیٹھی تھی "سبحان اللہ۔" سرمد نے بے خودی میں کہا "کیا خوب صورتی ہے۔"

درحقیقت وہ منظر ارضی لگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ غیر ارضی منظر تھا.... کسی اور ہی دنیا کا .... جنت کا! جھیل کی سطح پگھلی ہوئی چاندی جیسی .... لیکن شفاف تھی۔ چاروں طرف موجود پہاڑ اس کے اندر پڑے نظر آرہے تھے۔ سر کے بل، جیسے اس کے حسن کو سجدہ کر رہے ہوں۔ پھر آسمان بھی مچھیرے کے جال کی طرح جھیل پر پھیلا

ہوا تھا۔ اس میں ستارے بھی تھے اور ایک طرف چاند بھی تھا۔ یہ پورا منظر ٹھہرا ہوا تھا۔ یعنی جھیل ساکن تھی۔ ہوا اس سکوت کو مرتعش کرنے میں ناکام تھی۔

"دیکھیں تو .... ایک لہر بھی نہیں ہے۔" میمونہ نے سرمد سے کہا۔

"یہ بے حد پرسکون جھیل ہے۔" سرمد نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ یہ بہت .... بہت زیادہ گہری ہے۔"

دیکھتے دیکھتے نگاہیں خیرہ ہونے لگیں تو میمونہ نے سر اٹھایا۔ "ارے - یہ کیا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "یہ سورج ہے؟"

سرمد نے بھی سر اٹھا کر دیکھا اور وہ بھی حیران ہوا۔ روشنی کا فرق واضح تھا۔ دھوپ اور چاندنی میں بہت نمایاں فرق ہوتا ہے۔ چاندنی خواب ہے اور دھوپ بیداری۔ پھر تھوڑی دیر پہلے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے لیکن پھر بھی اسے ایک لمحے کو یہی گمان ہوا کہ یہ سورج طلوع ہوا ہے۔ بس اس کی کرنوں میں تمازت کی جگہ ٹھنڈک ہے۔ وہ سحرزدہ سا دیکھتا رہا۔ اتنا بڑا چاند اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا "واقعی .... دیکھنے میں تو یہ سورج جیسا ہی لگ رہا ہے۔" اس نے کہا "کمال ہے' اتنا بڑا چاند!"

"مجھے تو یہ سورج ہی لگ رہا ہے۔" میمونہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"سورج سونے کی رنگت دیتا ہے اور چاند چاندی کی۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن ...."

سرمد اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس کی اپنی بھی یہی کیفیت تھی۔ تمام دلیلوں کے باوجود وہ چاند اسے سورج ہی لگ رہا تھا" اور یہ بھی تو دیکھو کہ آسمان کتنا نیچے نظر آرہا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ ہاتھ بڑھاؤں تو میں ستاروں کو توڑ سکتی ہوں۔" میمونہ نے خواب ناک لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھا کر یوں ٹٹولنے لگی' جیسے ستاروں کو منتخب کر رہی ہو۔

اس لمحے جھیل کو دیکھتے ہوئے سرمد کے دل میں ایک عجیب خیال آیا .... پورے یقین کے ساتھ۔ اس نے سوچا کہ وہ جھیل کی سطح پر چل سکتا ہے۔ کیونکہ جھیل کا پانی اب پانی نہیں رہا' وہ چاندی بن گیا ہے۔ دماغ کے ایک گوشے میں اس کی تردید



ابھری لیکن وہ بس صدا بہ صحرا تھی۔

وہ ایک دم چوکنا ہوگیا۔ اسے روایتیں یاد آگئیں۔ لوگ اسی طرح پورے چاند کی رات میں مسحور ہوکر جھیل میں اتر گئے تھے۔ شاید یہی سوچ کر۔ اس نے پوری کوشش کرکے اپنے ذہن کو اس خیال پر مرکوز کیا۔ ہاں ..... یہ بات ناقابل فہم نہیں تھی۔ حسن اگر بے پایاں ہو تو دیکھنے والوں کو ایسی مستی اور بے خودی میں گرفتار کرتا ہے کہ انہیں کسی بات کا احساس نہیں رہتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی محض ایک جھلک دیکھ کر مصر کی عورتوں نے لیموں کے بجائے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں اور انہیں تکلیف کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ جبکہ یہاں تو قدرت نے اپنے تخلیق کردہ بے شمار عوامل کو بہت خوب صورتی سے یکجا کر دیا تھا۔ یہ حسن وارفتگی جگا رہا تھا اور ایسی صورت میں انسان کسی بھی وہم کو حقیقت سمجھ سکتا ہے' کچھ بھی کرسکتا ہے۔

پہلی بار سرمد کو احساس ہوا کہ جھیل کتنی خطرناک ہے۔ یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ وہ کس حد تک خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ یعنی اسے اپنے ہوش و حواس پر' اپنے ذہن پر قابو رکھنا ہوگا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جھیل سے۔ اور گرد و پیش کے حسن سے نظر چرائی جائے۔ کیونکہ اس منظر کی ایک لمحاتی دید ہوش و حواس کی دنیا زیرو زبر کردیتی ہے۔ اس لمحے اس کی سمجھ میں آیا کہ انسان کی کیمیاوی ساخت میں قدرت نے دیوانگی کا ایک بہت بڑا عنصر چھپا رکھا ہے۔ بہت گہرائی ہیں۔ شعور' ہوش اور حواس کی دبیز تہوں کے بہت نیچے اور کوئی بہت طاقت ور جذبہ شعور اور حواس سے ماورا ہو جائے تو وہ ایک ثانیے میں اس چھپی ہوئی دیوانگی کو چھولیتا ہے۔ اس میں کیمیاوی ردعمل جگا دیتا ہے۔ اس کے بعد کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ روز ازل سے آج تک' ارتقا کے باوجود انسان کو اپنی دیوانگی سے کام لینا نہیں آیا۔ وہ دیوانگی کو اپنا اسیر نہیں کرسکتا۔ ہمیشہ خود ہی اس کا اسیر ہو جاتا ہے۔

اور دیوانگی کو Activate کرنے کے لئے قدرت نے کچھ "عمل انگیز" بھی تخلیق کئے ہوں گے۔ وہ ان سب کے بارے میں تو نہیں جانتا مگر تاریخ بتاتی ہے کہ عبودیت' حسن اور عشق ایسے جذبے ہیں' جو دیوانگی کو جگاتے ہیں' اسے مہمیز کرتے

ہیں۔ عبودیت کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نار نمرود میں چھلانگ لگا دی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن بے مثال نے عورتوں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور عشق میں ہمیشہ آدمی وہ کچھ کر گزرتا ہے، جسے کرنے کے متعلق ایک باشعور اور ہوش مند آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ عشق میں جان سے گزر جانا تو کوئی بات ہی نہیں اور اسے یاد آیا۔ مشہور ہے کہ پورا چاند آدمی میں دیوانگی جگاتا ہے۔ ارے ..... وہ تو سمندر کے سینے میں بھی بھونچال لے آتا ہے! مختصر یہ کہ اسے بے حد محتاط رہنا تھا، یہ سوچ کر وہ جھیل سے خاص طور پر نظریں چرانے لگا۔ چنانچہ پہلی بار اس نے گردو پیش کو ..... اپنے سامنے اور قریب دیکھا۔

سب کچھ چاندنی میں یوں نہایا ہوا تھا کہ ہر چیز ..... چھوٹی سی چھوٹی چیز واضح ہوگئی تھی۔ وہ چیزیں بھی، جو دن کی روشنی میں بھی نظر نہیں آتیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ مائیکرو اسکوپ کی مدد سے دیکھ رہا ہو۔ بہت چھوٹے نازک پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی صاف نظر آرہی تھی۔ چالیس گز دور بکھرے ہوئے رنگ برنگے سنگریزے بھی صاف نظر آرہے تھے۔ ہر چیز روشن تھی اور چاندنی کے پیراہن میں تھی۔

سرمد کا ذہن بس ایک ہی گردان کئے جا رہا تھا ... مجھے محتاط رہنا ہے۔ محتاط رہنا ہے۔ ہوش کا دامن نہیں چھوڑنا۔ دیوانگی سے خبردار۔ یہ تلقین جیسے ریکارڈ کر دی گئی تھی اور ایک خود کار نظام کے تحت نشر کی جا رہی تھی۔

میمونہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "چلیں۔ اب تو ہم ٹہل سکتے ہیں۔"

وہ اٹھ رہی تھی کہ سرمد نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچ لیا۔ "بیٹھی رہو۔ یہیں سے سب کچھ نظر آرہا ہے۔"

"واہ ..... پھر یہاں رکنے کا کیا فائدہ۔" میمونہ نے ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میمونہ پلیز....." سرمد نے پھر اس کا ہاتھ تھاما۔

"ہم یہاں انجوائے کرنے کے لئے رکے تھے۔" میمونہ کے لہجے میں خفیف سی



رہی تھی "اچھا، آپ بیٹھیں۔ میں ٹہل کر آتی ہوں۔"

یہ ممکن نہیں تھا۔ سرمد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سوچا، میمونہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے اور ٹہلنے میں حرج بھی کیا ہے۔

ٹہلتے ہوئے سرمد کو عجیب سا احساس ہوا۔ یہ کائنات تھی ... بے کراں ... وسیع .... خوب صورتی سے بھری ہوئی .... افق تا افق پھیلی ہوئی لیکن ان کے سوا کہیں کوئی انسان نہیں تھا۔ وہ آدم تھا اور میمونہ حوا تھی۔ اب اس کائنات میں ان سے زندگی کا سرچشمہ پھوٹے گا۔ ان کے بچے یہاں کھیلیں گے، بڑے ہوں گے، محبت کریں گے، پھر ان کے بچے ہوں گے .... اور کائنات بھر جائے گی۔

"کتنا حسین پھول ہے۔" میمونہ نے اسے چونکا دیا۔

سرمد نے بے حد نازک سے اس پھول کو دیکھا "واقعی .... بہت حسین ہے۔"

"نہیں۔ بہت ہی حسین ہے۔" میمونہ کا لہجہ تشددانہ تھا۔

سرمد نے گھبرا کر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا "ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے نرمی سے کہا "میں اس کے حسن کو بیان نہیں کر سکتا۔" پھر اس نے جھک کر پھول کو توڑا اور بڑی نزاکت سے میمونہ کے بالوں میں لگا دیا۔

چند لمحے بعد میمونہ ہنسنے لگی۔ وہ اوپر اپنے بالوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی "نہیں .... پلیز .... دیکھو، گدگدی مت کرو۔ پلیز۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" سرمد نے پوچھا۔

"آپ کو نظر نہیں آرہا ہے۔ یہ پھول نہیں، پری ہے جو آپ نے میرے بالوں میں لگائی ہے۔ گدگدی کر رہی ہے۔"

سرمد کے دماغ میں تلقین کا ریکارڈ اب بھی بج رہا تھا مگر میمونہ کی بات سن کر وہ بری طرح چونکا۔ ارے ... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے صرف اپنی طرف سے نہیں، مونا کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہے۔ اس کی ذمے داری دہری ہے۔ اسے خوف آنے لگا۔

اس نے میمونہ کی دیوانگی کو روکنے کی کوشش کی "یہاں پریاں کہاں۔" اس نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا "پریاں کہانیوں میں یا پھر خوابوں میں ہوتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ یہاں بھی ہوتی ہیں۔" میمونہ کے لہجے میں شدت تھی "یہاں کا ہر پھول درحقیقت پری ہوتا ہے۔ رات کی تنہائی میں پریاں انگڑائی لے کر اپنے پھول پیراہن سے نکلتی ہیں اور کھیلتی پھرتی ہیں۔ رقص کرتی ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے وہ پھر پھول بن جاتی ہیں .... اے گدگدی مت کرو۔" اس نے اپنے بالوں میں موجود پری سے کہا۔

"یہ سب روایتیں ہیں .... داستانیں ہیں۔" سرمد نے کہا۔

"اچھا .... ذرا سامنے تو دیکھئے .... جھیل میں۔" میمونہ نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

سرمد نے سامنے جھیل کی طرف دیکھا۔ اور جیسے کسی طلسم میں پھنس گیا۔ اس سے نظریں ہٹائی ہی نہیں جا رہی تھیں "کیا ہے وہاں؟"

"آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے۔" میمونہ نے کہا۔

"نظر آرہا ہے۔ پگھلی ہوئی چاندی ہے' جو نہ جانے کتنی گہری ہے۔"

"جی نہیں۔ چاندی پگھلی ہوئی نہیں۔ یہ چاندنی کا چکنا فرش ہے اور وہ دیکھیں .... کتنی ساری پریاں' اس پر پھسلتی پھر رہی ہیں۔ وہ پکڑم پکڑی کھیل رہی ہیں۔"

میمونہ کے ہاتھ پر سرمد کی گرفت اور سخت ہوگئی۔ اس کے دماغ میں تلقین کا ٹیپ ریکارڈ اب بھی چل رہا تھا مگر آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی "یہ وہم ہے تمہارا۔" اس نے میمونہ سے کہا "فریب نظر ہے اور وہ بھی بے حد مہلک۔"

"یہ اس لئے کہہ رہے ہیں آپ کہ پریاں آپ کو نظر نہیں آرہی ہیں۔ آپ مرد ہیں نا۔ وہ شرما رہی ہیں آپ سے۔ آپ کے سامنے نہیں آنا چاہتیں۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔"

لیکن اب میمونہ کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ "لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں منالوں گی۔ وہ ہمیں بھی کھیل میں شامل کرلیں گی۔ میں .... میں آپ کو شیئر کر سکتی ہوں ان کے ساتھ۔"

سرمد کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ میمونہ پوری طرح اس سحر میں کھو چکی تھی۔

اسی لمحے میمونہ نے جھیل کی طرف ہاتھ لہرایا "ہم آرہے ہیں۔" پھر وہ سرمد کی



طرف مڑی "دیکھیں ... وہ اشارے کر رہی ہیں۔ بلا رہی ہیں۔ چلیں نا۔ آپ ان سے بھی محبت کرسکتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی۔ رقابت نہیں محسوس کروں گی۔ چلیں نا۔"

اب میمونہ اسے کھینچ رہی تھی اور وہ گھسٹ رہا تھا۔ میمونہ میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی۔ اس نے میمونہ کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی رفتار کم ہی کرسکا "کیا کر رہی ہو میمونہ؟ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم ڈوب جائیں گے۔"

جواب میں میمونہ کی کھنکھناتی ہنسی سنائی دی "ڈوبتے تو پانی میں ہیں۔ وہ پانی تھوڑا ہی ہے۔ دیکھیں پریاں کیسے پھسل رہی ہیں۔"

اب وہ پانی کے اس دھارے کے پاس پہنچ گئے تھے' جو جھیل سے باہر آرہا تھا۔ ایک اعتبار سے وہ جھیل کا دہانہ تھا۔ سرمد کے ذہن میں تلقین بدستور گونجے چلی جا رہی تھی۔ وہ اب خوف زدہ تھا۔ نازک سی میمونہ اسے کھینچے لئے جارہی تھی "میمونہ کیا کر رہی ہو؟" وہ چلایا۔

"دیکھیں تو' میرا دل کتنا بڑا ہے۔ میں خود آپ کو پریوں سے ملانے لے جا رہی ہوں۔ یہ بھی ڈر نہیں مجھے کہ یوں آپ کو کھو بھی سکتی ہوں۔" میمونہ کے لہجے میں وارفتگی تھی۔

اب ان کے پاؤں دھارے کے برف جیسے پانی کو چھو رہے تھے۔ سرمد پر کپکپی چڑھ گئی لیکن میمونہ نارمل تھی۔ واقعہ دیوانگی بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔

"لیں دیکھیں' ہم پانی پر چل رہے ہیں نا۔" فضا میں میمونہ کی ہنسی کا جلترنگ بجا "کوئی ڈوب رہے ہیں ہم۔"

سرمد نے سمجھ لیا کہ میمونہ کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔ اسے کچھ کرنا ہوگا۔ دھارے سے جھیل کا فاصلہ اب بمشکل بیس قدم تھا۔ اس نے پوری طاقت سے میمونہ کو روکنے کی کوشش کی' لیکن لگتا تھا' دوسری طرف کوئی زیادہ بڑی طاقت ہے جو میمونہ کو جھیل کی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ میمونہ کو تو نہیں کھینچ سکا۔ البتہ اس کے اپنے کھنچنے اور میمونہ کے جھیل کی طرف بڑھنے کی رفتار کچھ کم ہوگئی۔ مگر فاصلہ بہرحال ہر لمحے کم ہو

رہا تھا۔ پندرہ قدم ... دس قدم ... پانچ قدم ...

اب وہ ہانپ رہا تھا۔ جھیل بالکل سامنے تھی اور انہیں نگلنے کے لئے بالکل تیار۔ اب بھی وہ کچھ نہ کرتا تو موت یقینی تھی۔ اس کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ خود کو بچانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بس اسے میمونہ کا ہاتھ چھوڑ دینا تھا لیکن اس سے تو بہتر اس کے لیے یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی مرجائے۔ دوسری صورت میمونہ کو روکنے کی تھی۔ اب وہ جھیل سے بمشکل تین قدم دور تھے۔

اس نے اپنی طاقت مجتمع کرنے کے لئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں دو قدم کا فاصلہ اور سمٹ گیا۔ اب جھیل ایک قدم کے فاصلے پر تھی ... اور وہ قدم بھی سمٹنے ہی والا تھا۔ اس نے بالکل اچانک پوری قوت سے جھٹکا دے کر میمونہ کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجتاً" دونوں ہی گر پڑے۔ میمونہ زور لگا رہی تھی اور کسی بھی وقت جھیل میں گر سکتی تھی اور سرمد جانتا تھا کہ ایک بار وہ جھیل کے پانی میں گری تو وہ اسے واپس نہیں کھینچ سکتا۔ بس اس کے ساتھ ہی جاسکتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش تھی۔

سرمد نے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا جو میمونہ کی کنپٹی پر لگا۔ اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑگیا۔ شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ سرمد نے خود کو سنبھالا لیکن میمونہ کا ہاتھ بھی نہیں چھوڑا۔ اس وقت اسے یہ خوفناک احساس ہوا کہ میمونہ جھیل کی طرف پھسل رہی ہے۔ اس نے دیکھا' میمونہ کا ایک ہاتھ جھیل کے پانی میں جا پڑا تھا۔ اس نے میمونہ کو اٹھانے کے بجائے گھسیٹنے کا فیصلہ کیا۔ دھارے سے نکلنے کے بعد اس نے سکون کی سانس لی اور میمونہ کو لیٹا چھوڑ کر جھیل کی طرف دیکھا۔ اس لمحے اس کے دل میں جو آرہا تھا۔ اگر وہ جھیل میں جا رہا ہوتا تو وہ بچ نہیں سکتے تھے۔

اس نے اپنی سانسیں درست ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اسے ڈر تھا کہ میمونہ کو ہوش آگیا اور اس پر دوبارہ دیوانگی طاری ہوگئی تو اس بار وہ اس پر قابو نہیں پاسکے گا۔ اس نےمیمونہ کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔

ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوکر اس نے ہاتھوں کا بوجھ ہلکا کیا اور جھپٹ کر دروازہ یوں بند کیا' جیسے بلاؤں کے اندر گھس آنے کا خدشہ ہو۔ اس نے جلدی سے میمونہ



کے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر اسے دوسرے کپڑے پہنائے اور اسے بستر پر لٹا کر کمبلوں سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کپڑے بدلے اور بستر پر آگیا۔ اس نے میمونہ کا ہاتھ چھو کر دیکھا' وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو سہلاتا رہا۔ اس کے اپنے ہاتھ بھی گرم ہوگئے۔ جانے کب وہ اسی حال میں سوگیا۔

اسے بس اتنا یاد تھا کہ اس کی آنکھ چیخ سے کھلی تھی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ میمونہ بستر پر نہیں تھی۔ اس لمحے وہ اسے دروازے پر نظر آئی۔ "پریاں مجھے بلا رہی ہیں۔" وہ چلائی۔ "میں ان کے ساتھ کھیلوں گی۔" اور سرمد کے بستر سے اترتے اترتے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

سرمد ننگے پاؤں ہی باہر کی طرف لپکا۔ اسے ڈر تھا کہ اس بار وہ میمونہ کو نہیں روک سکے گا لیکن دروازے سے نکلتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ میمونہ برآمدے کے دروازے سے ٹیک لگائے بت بنی کھڑی تھی۔ سرمد اس کے پاس جاکھڑا ہوا۔ اس نے حیرت سے جھیل کو دیکھا۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا!

چاند نجانے کب مغربی پہاڑیوں کے پار اتر کر اوجھل ہوچکا تھا۔ جھیل اب پھر مہیب اور خوف ناک لگ رہی تھی۔ اندھیرا اگرچہ رات جیسا ہی تھا۔ شاید اس لئے کہ صبح کی سفید دھاری آسمان پر چمک رہی تھی۔ ستارے یوں ٹمٹما رہے تھے' جیسے بجھنے والے ہوں۔ جھیل رات جیسی سیاہ تو نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ شفاف نہیں تھی۔ اس کا رنگ اب بھی گہرا ہی تھا۔

"سب کچھ ختم ہوگیا۔" میمونہ نے اداس لہجے میں خود کلامی کی۔ اسے سرمد کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا "پریاں پھول بنتی رہیں گی۔ سب کچھ زندگی سے ہے۔"

میمونہ اندر جانے کے لئے پلٹی۔ سرمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ابھی نہیں۔ آؤ یہاں بیٹھو۔"

"اب یہاں دیکھنے کو ہے ہی کیا۔" میمونہ نے دل کی گرفتگی سے کہا مگر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"دیکھنے کو بھی بہت کچھ ہے .... اور سمجھنے کو بھی۔" سرمد نے کہا۔ "رات تم

نے خوابوں کا ۔ دیوانگی کا چاند ابھرتے دیکھا تھا۔ اب حقیقت کا سورج بھی ابھرتے دیکھو۔"

میمونہ نے اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں مونا۔ چاند سے خواب ہیں' اوہام ہیں' دیوانگی ہے اور سورج حقیقت ہے' زندگی ہے اور کڑوا سچ ۔ ہے۔"

اچانک میمونہ نے اپنی بائیں کنپٹی سہلائی "مجھے اس جگہ بہت تکلیف ہے۔ ورم بھی ہے ...."

"ہوتا رہے۔" سرمد نے بے پروائی سے کہا۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ حقائق سورج کی روشنی میں ہی حقائق لگتے ہیں ورنہ افسانے انہیں نگل لیتے ہیں۔ اس لمحے مشرقی پہاڑی کی اوٹ سے سورج نے سر ابھارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ نارمل ہوگیا۔ "دیکھو ... یہ سب کچھ کتنا حسین ہے۔" سرمد نے کہا۔

"رات جتنا نہیں۔"

"رات اوہام تھے۔ یہ حقیقت ہے۔"

"آیئے چلیں۔" میمونہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی "ارے .... میں یہ کپڑے تو نہیں پہنے ہوئے تھی۔"

بستر پر لیٹ کر سرمد نے اسے سب کچھ سنایا۔ وہ بے یقینی سے سنتی رہی۔ کپڑے بدلوانے کے تذکرے پر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سرمد نے کہا "کتنی عجیب اور حیرت انگیز لگتی ہے یہ بات کہ میں نے آج تک تمہیں پیار نہیں کیا۔"

میمونہ نے سپردگی کی کیفیت میں آنکھیں موندلیں۔ اس کے ہونٹ خفیف سے کھل گئے۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو سرمد کا چہرہ اس ے اتنا ہی دور تھا" صبر بڑی چیز ہے۔" سرمد نے کہا "اوز ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ ابھی تو ہماری سہاگ رات ہی نہیں آئی۔"

میمونہ مسکرائی اور اس نے پھر آنکھیں موند لیں "یہی کیا کم ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور اتنا قریب ہیں۔"

"میں نے آج ایک بات سیکھی اور سمجھی ہے۔" سرمد نے .... خود کلامی کے



انداز میں کہا "حسن بہت سفاک ہوتا ہے ... سفاک' بے پرواہ ... بے نیاز۔ وہ جادو کرتا ہے اور اسے بس خراج لینے سے غرض ہوتی ہے ... جیسے جھیل سیف الملوک۔"



اب واپسی کا سفر بھی ختم ہو رہا تھا "اتنا اچھا سفر آپ ہی کرا سکتے تھے مجھے۔" میمونہ نے کہا۔

"تم جو خواب چاہو دیکھو۔ میں تمہارے ہر خواب کی تعبیر دوں گا۔" سرمد بولا۔

وہ اسلام آباد کے ہوٹل میں تھے۔ اگلی صبح ان کی فلائٹ تھی۔ سرمد نے بوا کو فون کر دیا تھا "بوا ناراض ہو رہی تھیں۔" سرمد نے میمونہ کو بتایا "ہم دو دن لیٹ ہوگئے۔ ہمیں ۲۷ تاریخ کو پہنچنا تھا اور کل ۲۹ تاریخ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میمونہ نے بے پرواہی سے کہا۔

"اسکول تو ۴ اگست کو کھلے گا نا۔ لیٹ ہونے کے باوجود ہمارے پاس خاصا وقت ہے۔"

میمونہ نے بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اسکول کے حوالے پر اسے ایک بات یاد آگئی تھی۔ "وہ جو غزل آپ گاتے تھے نا۔" اس نے سرمد سے کہا "چراغ طور جلاؤ ..."

"ہاں ہاں۔" سرمد پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"اس میں ایک شعر تھا۔ کوئی ستارہ نہ آجائے پاؤں کے نیچے۔"

"قدم سنبھل کے اٹھاؤ' بڑا اندھیرا ہے۔" سرمد نے شعر مکمل کر دیا۔

"جی ہاں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ستارے جیسی روشن چیز نظر نہ آنے کی وجہ ے پاؤں کے نیچے کیسے آسکتی ہے؟"

"یہی تو خوب صورتی ہے اس شعر کی۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ندھیرے کا تصور تو کرو' جو اتنا گہرا ہے کہ اس میں ستارہ موجود ہوتے ہوئے بھی نظر ہیں آرہا اور اس کے پاؤں کے نیچے آنے کا خدشہ ہے۔ کیسے اندھیرے کا نقشہ کھینچا ہے۔ ساغر نے۔"

میمونہ نے ایک لمحے تصور کیا اور پھڑک اٹھی "واہ سبحان اللہ۔ واقعی کمال کا شعر ہے۔ اس سے بڑھ کر اندھیرا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہے۔" سرمد نے کہا "میرے خیال میں اندھیرے کے بارے میں اس سے بہتر طور پر کہا ہی نہیں جاسکتا۔ ایک تو ساغر کا یہ شعر ہے اور دوسرے شہلا کی نظم کی دو لائنیں' سنو گی؟"

"سنائیں۔"

"رات اتنی اندھیری ہے' ابلیس کا دل جیسے۔"

"واہ ... کیا کہنے۔ سیاہی' اندھیرا اور وہ بھی ابلیس کے دل جیسا۔" میمونہ نے بے ساختہ داد دی "پوری نظم سنائیں نا۔"

سرمد نظم سنانے لگا "عنوان ہے ... وصیت۔"

نظم سن کر میمونہ کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ وہ بار بار دہراتی رہی۔ "کیسی خوب صورتی ہے ان مصرعوں میں۔ پھولوں کے بجائے اب خاک اڑتی ہے پھولوں کی۔ دل شاخ بدن پر ہے' سوکھا ہوا اک پتا۔ رات اتنی اندھیری ہے' ابلیس کا دل جیسے ... واہ وا۔ کیا چیز تھیں آپی بھی۔" وہ رونے لگی۔

سرمد نے اسے لپٹا لیا۔

"میں بھی آپ کو آپی کی ایک نظم دکھاؤں گی۔ آپ کے بارے میں ایک خواب تھا' جو میں نے بھی دیکھا تھا اور آپی نے بھی۔ آپی نے اس خواب کو نظم کیا تھا۔"

سرمد اسے تھپکتا رہا!



وہ کراچی پہنچے تو بارش ہو رہی تھی "کیسا استقبال کیا ہے کراچی نے۔ جانتا ہے کہ مجھے رم جھم کا یہ موسم کتنا پسند ہے۔" سرمد نے خوش ہو کر کہا۔

گھر پہنچ کر میمونہ تو بوا کی ہوگئی۔ بوا بہت خفا تھیں ان کے لیٹ ہونے پر "دو دن سے انتظار کر رہے تھے ہم .... سولی پر ٹنگے تھے۔" لیکن ان کا چہرہ ان کے لہجے کی



نفی۔ ان کی خوشیوں کی غمازی کر رہا تھا "اے ماشاء اللہ کتنی پیاری ہوگئیں تم۔"

سرمد اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے ضروری چیزوں کا ایک کارٹن تیار کیا تھا اور اب اسے باندھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ فون کی گھنٹی کئی بار بجی ہے۔ اس نے رسی کو وہیں چھوڑا اور بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا "**سرمد اسپیکنگ**"

عین اسی لمحے ڈرائنگ روم میں میمونہ نے بھی ریسیور اٹھایا لیکن سرمد کی آواز سن کر وہ بولی نہیں۔ وہ ریسیور رکھنے ہی والی تھی کہ' سر... میں زبیر بول رہا ہوں۔ آپ واپس آگئے؟' .... سن کر رک گئی۔ اصل میں "سر" کے تخاطب نے اس کا تجسس بھڑکا دیا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔" سرمد نے ماؤتھ پیس میں کہا "تم سناؤ۔ کام ہوگیا۔"

"جی سر۔"

"سب مکمل ہے؟"

"سب ۔ آرائش سمیت۔ سب کچھ تو آپ پسند کر کے گئے تھے۔"

"اور دوسرے کام کا کیا رہا؟"

"وہ دو کروڑ نذرانہ مانگ رہے ہیں سر لیکن زمین کی قیمت کے لحاظ سے دو کروڑ دے کر بھی ہم کم از کم ایک کروڑ کے فائدے میں ہوں گے۔"

"مجھے ایک کروڑ اصول سے زیادہ عزیز نہیں۔" سرمد نے ناگواری سے کہا "خیر ... بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی تم ایک گھنٹے میں میری کار یہاں پہنچا دو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"شکریہ زبیر۔ اللہ حافظ۔"

چند ہی لمحے بعد میمونہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سرمد اس وقت رسی ہاتھ میں لیے بیٹھا "مونا' آج میں تمہیں منہ دکھائی کا اصل تحفہ دوں گا۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا "آج ہماری سہاگ رات ہوگی۔"

"یہ ممکن نہیں۔"

میمونہ کی سرد اور سخت آواز سن کر سرمد نے سر اٹھایا اور حیرت سے دیکھا۔

میمونہ کے چہرے پر درشتی اور آنکھوں میں بے مہری تھی "کیا کہہ رہی ہو؟"

"پوچھ رہی ہوں کہ یہ تحفہ کیا دو کروڑ سے زیادہ کا ہوگا؟" میمونہ کا لہجہ زہریلا تھا۔

"ہاں' ہو بھی سکتا ہے۔" سرمد نے سادگی سے کہا۔

"آپ دو کروڑ رشوت دے سکتے ہیں تو دس ارب کے مالک بھی ہوں گے۔" زہریلے لہجے کی کاٹ اور بڑھ گئی۔

"اس سے کہیں زیادہ ہے میرے پاس۔"

میمونہ کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ پھٹ پڑی۔ "یہی سب کچھ کرنا تھا تو میری آپی کی زندگی کیوں تباہ کی؟"

سرمد بھونچکا رہ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ایک پل نہیں گزار سکتی بدبودار آدمی۔ تمہارے وجود سے سڑانڈ اٹھ رہی ہے۔ انسانی محنت کے لہو کا اور ضمیر کی سیاہی کا اور جھوٹ' رشوت ستانی اور بے ایمانی کا تعفن اٹھ رہا ہے تمہارے جسم سے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں برداشت نہیں کرسکتی۔"

سرمد شاک کی حالت میں تھا "کیا کہہ رہی ہو مونا؟"

"جو کچھ تم کرچکے ہو' کیا اس ایک سال کی مہلت میں نہیں کرسکتے تھے' جو ابو نے تمہیں دی تھی۔ اس وقت یہ سب کچھ کرلیتے تو مجھے گوارا ہو جاتا۔ میری آپی کی زندگی تو بچ جاتی۔ انہیں خوشیاں تو مل جاتیں۔ تم نے تباہ کر دیا میری آپی کو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے .... میرے کمرے سے نکل جاؤ۔"

"میری بات تو سنو۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

لیکن میمونہ پر وحشت طاری تھی جو ہر لحظ بڑھتی جا رہی تھی۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری آواز زہر لگ رہی ہے۔" وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

"مونا' میری بات سنو۔"



"مجھے کچھ نہیں سننا بدبو دار آدمی۔"

سرمد دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا پھر وہ میمونہ کی طرف بڑھا "سننا تو تمہیں پڑے گا مونا جان۔" اس نے کہا۔

میمونہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ کمرے سے چلا گیا ہے

"نکل جاؤ یہاں سے۔" وہ چلائی "مجھے کچھ نہیں سننا...."

"سننا تو پڑے گا۔" سرمد نے کہا پھر اس نے جھپٹ کر میمونہ کے منہ پر سختی سے ہاتھ جما دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ پر میمونہ کا دوپٹا پڑا تھا۔ وہ زور لگاتی وحشت زدہ میمونہ کو دھکیل کر بیڈ کی طرف لے چلا۔ اسے بیڈ پر گرا کر اس نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ چلائی۔ اس نے بوا کو پکارا مگر سرمد نے تیزی سے دوپٹے کا گولا بنا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ جکڑ کر اس نے اسے اٹھایا اور قریب پڑی رسی اٹھالی۔ میمونہ بری طرح مچل رہی تھی مگر سرمد نے اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے جاکر سختی سے باندھ دیئے "بات تو تمہیں سننا ہوگی مونا جان۔" وہ بڑبڑایا۔

جواب میں میمونہ نے زبان کی بجائے لاتیں چلا کر نفرت کا اظہار کیا۔

"خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور میری بات سنو۔" سرمد غرایا "ورنہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ختم بھی کرسکتا ہوں۔"

اس کے لہجے نے میمونہ کو سہما دیا۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی لیکن اس کی نگاہوں میں دہکتی ہوئی نفرت تھی۔

سرمد کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے۔ اس ہاتھ سے اس نے مونا کا منہ دبایا تھا اور اس نے کاٹ لیا تھا۔ "کٹ کھنی بھی ہو۔" اس نے میمونہ سے کہا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا "مگر کوئی حرج نہیں۔ زیادہ خراب اور خطرناک بات یہ ہے کہ بہت جلد باز ہو۔ عجلت میں بہت بڑے فیصلے کرتی ہو۔"

میمونہ نے پھر پاؤں چلائے۔

"خاموش بیٹھ کر سنو۔" سرمد نے اسے ڈانٹا "ہاں' میری بات سننے کے بعد بھی تم یہی کہو گی تو میں ایک لمحہ بھی نہیں رکوں گا۔ ہمیشہ کے لئے دور چلا جاؤں گا تم

ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ سرمد کہیں کھویا ہوا تھا‘ جیسے کسی دور کے منظر کو دیکھ رہا ہو۔ میمونہ اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک سرمد کی خواب ناک آواز ابھری "تم نے غلط سمجھا۔ میرے وجود سے سڑاند نہیں اٹھ سکتی۔ تعفن نہیں اٹھ سکتا۔ میں نے بیلچے کا سیاہ پھول خریدا تو نہیں تھا۔ وہ اللہ نے اپنے کرم سے میرے مقدر کی شاخ پر خود کھلایا تھا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا۔ "چلو .... میرے ساتھ چل کر خود دیکھو۔ مجھے خوب یاد ہے کہ شہلا کی شادی کو دو مہینے ہو چکے تھے۔"

وہ ماضی کی بھولی بسری گلیوں میں چلا گیا۔



سرمد کھویا کھویا ہی رہتا تھا۔ لگتا تھا‘ شہلا اس کا دھیان اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ وہ اس وقت صدر سے گزر رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ سوٹ میں ملبوس ایک خوش پوش اور باوقار شخص کے پاس سے گزرا لیکن اس کی کیفیت بے دھیانی کی تھی۔ چند قدم آگے جاکر اسے احساس ہوا کہ اس کے گزرتے ہی خوش پوش شخص نے اسے پکارا ہے۔ کئی بار .... اور ہر بار اس کی آواز پہلے سے بلند ہوتی گئی ہے "سنو بیٹے۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خوش پوش شخص چہرے سے بہت پریشان .... بلکہ متوحش لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سوٹ کیس تھا "بیٹے‘ میری بات سنو۔" اس نے سرمد کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے دیکھا تو بلند آواز میں پکارا۔

سرمد اس کے پاس گیا "جی فرمایئے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے بیٹے؟"

"یہ صدر ہے محترم!"

"صدر!" خوش پوش شخص کی نگاہوں میں اجنبیت تھی "یہ کون سی جگہ ہے؟"

سرمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ صدر کے بارے میں اور کس طرح بتایا جاسکتا ہے۔



اس نے پوچھا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"پتا نہیں۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پتا نہیں بیٹے۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں معلوم بیٹے۔ میں کھو گیا ہوں۔"

سرمد گڑبڑا گیا۔ اس نے سوچا کہ پیچھا چھڑا کر چل دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جائے لیکن اسے اس ادھیڑ عمر‘ باوقار شخص پر ترس آ رہا تھا۔ کتنی خوف ناک بات ہے کہ کوئی یوں راستہ چلتے چلتے اچانک سب کچھ بھول جائے۔ خود سمیت۔ کیسی کرب ناک بات ہے "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے کہیں لے چلو۔" وہ شخص گڑگڑایا۔

"کہاں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ کہیں بھی لے چلو۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ چکر بھی آرہے ہیں۔"

"میں بس آپ کو اپنے گھر لے جاسکتا ہوں۔"

"لے چلو۔"

اس کے گھر پہنچتے ہی وہ شخص چارپائی پر لیٹا اور سو گیا۔ سرمد نے اس کی جامہ تلاشی لی لیکن ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی‘ جس سے پتا چلتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ چنانچہ سرمد سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ چابیاں اس شخص کے کوٹ کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں مگر چابیوں کے علاوہ سوٹ کیس میں ایک خفیہ کھٹکا بھی تھا۔ کچھ دیر کی مغز ماری کے بعد سوٹ کیس کھل گیا لیکن سوٹ کیس کے اندر دیکھتے ہی سرمد کے ہوش اڑ گئے۔ سوٹ کیس نئے اور کرارے نوٹوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ رقم کے متعلق اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ وہ یقیناً لاکھوں میں تھی۔

سرمد نے جلدی سے سوٹ کیس کو لاک کیا اور چارپائی کے نیچے دھکیل دیا۔ پھر

اس نے سوٹ کیس پر اپنے میلے کپڑے ڈال دیئے۔ اس کے بعد وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ یقیناً بہت مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

وہ سوچتا رہا۔ اب اس مصیبت سے نہیں نکلا جاسکتا تھا۔ بس وہ یہ دعا کرسکتا تھا کہ اس شخص کی یادداشت فوراً واپس آجائے۔ تبھی جان چھوٹ سکتی تھی اور جب تک ایسا نہ ہوتا' اس کی نیند حرام رہتی۔ اتنی بڑی رقم اس کے گھر میں موجود تھی۔ اب وہ اس شخص کو چھوڑ کر ذرا دیر کے لئے بھی گھر سے نہیں جاسکتا تھا۔ ملازمت پر جانا تو بہت دور کی بات تھی۔

یہ سلسلہ پانچ دن تک چلتا رہا۔ وہ دفتر بھی نہیں گیا۔ ڈاکٹر کو بلانے کے معاملے میں وہ الجھتا رہا۔ وہ ڈرتا بھی بہت تھا۔ بات ذرا دیر میں کچھ کی کچھ ہوسکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ پولیس تک پہنچے۔

چارپائی ایک ہی تھی۔ اسے نیچے سونا پڑ رہا تھا۔ بس وہ کھانا ناشتہ لانے کے لئے گھر سے نکلتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں قیدی ہوکر رہ گیا ہے۔ ادھیڑ عمر شخص زیادہ تر سوتا ہی رہتا تھا۔

پانچویں دن وہ شخص جاگا اور اپنے گردو پیش کو .... اور سرمد کو دیکھ کر بھڑک اٹھا "تم کون ہو جی؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

سرمد گڑبڑا گیا۔ "جی میں سرمد ہوں۔"

"کون سرمد؟"

اس کا جواب سرمد کیسے دیتا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے گھر میں۔"

"ارے .... میرا سوٹ کیس؟"

"وہ محفوظ ہے جناب۔" سرمد نے نیچے سے سوٹ کیس نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

اس شخص نے شک آمیز نظروں سے سرمد کو دیکھا "تم نے اسے کھولا تو نہیں تھا؟"



"جی کھولا تھا۔" سرمد نے کہا پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ "آپ کے نام پتے کی تلاش میں لیکن کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

ادھیڑ عمر شخص نے جلدی سے سوٹ کیس کھولا اور نوٹوں کی گڈیوں کو ٹٹولا پھر اس نے سوٹ کیس بند کیا اور سرمد کو دیکھا۔ وہ پہلی بار مسکرایا "تمہارا کیا نام ہے بیٹے؟"

"سرمد .... سرمد حسین۔"

"اچھا نام ہے۔ جانتے ہو' اس سوٹ کیس میں کتنی رقم ہے؟"

"جی .... بہت .... بہت زیادہ۔"

"اس میں پچاس لاکھ روپے ہیں۔ اچھا .... میں کتنے دن سے یہاں ہوں؟"

"پانچ دن ہوگئے۔"

"تم نے یہ رقم ہتھیائی کیوں نہیں۔ مجھے شہر لے جاتے اور کہیں بھی چھوڑ کر نکل لیتے۔ رقم تمہاری ہو جاتی۔"

"میں چور نہیں ہوں جناب۔" سرمد نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"اچھا.. اب ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے لئے ٹیکسی لے آؤ۔"

سرمد ٹیکسی لایا تو اس نے کہا "تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔"

وہ شخص کینیڈا کا ارب پتی شیخ سرفراز تھا۔ کینیڈا میں اس کی بہت بڑی تعمیراتی فرم تھی۔ پاکستان میں بھی اس کی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ یہ اس کی بیماری تھی کہ اس پر یادداشت غائب ہونے کے دورے پڑتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ یہ احتیاط کرتا تھا کہ بڑی رقم یا کوئی قیمتی چیز لے کر کبھی نہیں نکلتا تھا اور اس کی جیب میں ہمیشہ کارڈ موجود ہوتا تھا۔ یہ صاحب بیمار ہیں۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اگر یہ آپ کو اس حال میں ملیں تو اس ٹیلی فون نمبر پر اطلاع دیں۔ آپ کو انعام بھی ملے گا۔ ساتھ میں نمبر ہوتا۔

لیکن اس صبح شیخ صاحب نے ایک قطعہ زمین کی خریداری کے لئے خود جاکر پچاس لاکھ روپے کی رقم بینک سے نکلوائی۔ انہوں نے سوچا کہ ذرا سی دیر کا کام ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اتنی دیر میں ان پر نسیان کا دورہ پڑے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں

رہا کہ فون نمبر والا کارڈ وہ جیب میں رکھ کر نہیں لائے ہیں۔

بینک سے نکلتے ہی ان پر نسیان کا دورہ پڑ گیا۔ انہیں اپنی کار بھی یاد نہیں رہی۔ وہ شام تک صدر میں بھٹکتے رہے مگر انہوں نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں۔ اس دورے کے دوران میں وہ بہت ڈرنے لگتے تھے لیکن نجانے کیوں' سرمد ان کے پاس سے گزرا تو انہیں اس سے ڈر نہیں لگا۔ انہوں نے اسے پکار لیا۔

سرمد نے انعام قبول کرنے سے انکار کیا تو شیخ صاحب نے اسے کینیڈا میں ملازمت کی آفر کر دی۔ یوں وہ ان کے ساتھ چلا گیا مگر شیخ صاحب نے جو بے اولاد تھے' اسے بیٹا بنا لیا۔ ان کی بیوی بھی مر چکی تھی۔ دنیا میں ان کا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ سرمد کو سونپ دیا۔

سرمد نے بارہا پاکستان آنا چاہا لیکن شیخ صاحب کو اس سے ایک پل کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ تین سال پہلے شیخ صاحب کا انتقال ہوا۔ سرمد وراثت کے معاملات اور وہاں کے کاروبار میں الجھا رہا مگر اس نے اپنے معتمد خاص زبیر کو پاکستان بھیج دیا۔ یہاں کا تمام کاروبار سمیٹ کر اس نے زبیر سے دھنک بلڈرز کی داغ بیل ڈلوائی۔ وہ اپنے خواب کبھی نہیں بھولا تھا اور شیخ صاحب کے ساتھ رہ کر اس نے خواب کی تعبیر حاصل کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔

پھر وہ پاکستان واپس آیا۔



"معجزاتی طور پر میں تم تک پہنچا تھا۔" سرمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر وہ جھک کر میمونہ کے منہ سے دوپٹا نکالنے لگا "یہ تھی بیلے کے سیاہ پھول کی کہانی۔ ہاں' جو کچھ تم نے پہلے کہا' اب بھی کہو گی تو میں ہمیشہ کے لئے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔ اگر اب بھی تمہیں میرے وجود سے سڑاند....."

میمونہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پوری طاقت سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

سرمد اب اس کے ہاتھ کھول رہا تھا "میں بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے میمونہ



کے ہاتھوں پر رسیوں کے نشان چومتے ہوئے کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کروں گا۔ کیسا ظلم ہے۔"

اچانک میمونہ کو کھوئی ہوئی زبان مل گئی "آپ نے ایک بار پھر مجھے جھیل سیف الملوک میں گرنے سے بچا لیا۔ آپ نے تو احسان کیا ہے مجھ پر۔"

"محبت میں کوئی احسان وحسان نہیں ہوتا۔" سرمد نے اس کی بات دہرائی۔

"سوری سرمد۔" میمونہ نے جھجکتے ہوئے اس کا نام لیا "میں واقعی عجلت میں فیصلے کرتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔"

"محبت میں معذرت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔" سرمد نے پھر اس کی بات دہرائی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بوا نے پکارا "سرمد بیٹے' تمہاری گاڑی آگئی ہے۔"

"آتا ہوں اماں۔" سرمد نے بلند آواز میں کہا پھر وہ میمونہ کی طرف مڑا "جلدی سے تیار ہو جاؤ مونا۔"

"کہیں چلنا ہے؟؟"

"ہاں۔"

"لیکن بارش ہو رہی ہے۔"

"یہ رم جھم کا موسم تو ہمارا ہی موسم ہے۔" سرمد نے کہا "ہاں سنو' اپنے ضروری کپڑے ایک بیگ میں رکھ لینا اور ہاں' سہاگ کا جوڑا رکھنا نہ بھولنا۔ آج ہماری سہاگ رات ہے۔ سمجھیں؟"

میمونہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ سرمد نے کارٹن کو رسی سے باندھا اور اسے اٹھا کر باہر نکل گیا۔

میمونہ نے دروازہ اندر سے بند کیا پھر آپی کی الماری کھولی۔ آپی کی دی ہوئی تمام چیزیں اس نے نکالیں اور بیگ میں بھر لیں۔

ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور سرمد نے پکارا۔ "کب نکلو گی بھئی۔"

"بس آرہی ہوں۔"

میمونہ باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ باہر بوا بھی تیار تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑا والا ٹفن کیریئر تھا۔ سرمد نے بیگ میمونہ کے ہاتھ سے لے لیا "واہ بھئی، آج بسنتی سوٹ پہنا ہے تم نے۔ اچھی لگ رہی ہو۔"

"آج میں اس نئے دور میں پہلی بار آپ کے ساتھ دھنک دیکھوں گی۔"

"ضروری ہے کہ دھنک نکلے۔" سرمد نے اسے چھیڑا۔

"آج تو دھنک کو نکلنا ہی ہوگا۔" میمونہ نے کہا "جانتے ہیں، یہ آپی کا وہ سوٹ ہے، جو پہن کر انہوں نے پہلی بار آپ کے ساتھ دھنک دیکھی تھی۔"

"اوہ۔" سرمد نے اسے غور سے دیکھا۔

"آپ جس دن آئے، اس دن بھی میں نے آپی کا سوٹ پہنا تھا.... وہ سفید کام دار کرتہ اور چنا ہوا دوپٹہ۔ وہ سوٹ آپی نے اس روز پہنا تھا، جب انہوں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔"

"اور تم نے بھی اسی روز مجھے پہلی بار دیکھا۔ اس نئے دور میں۔"

"جی ہاں۔ آپی نے اپنا سب کچھ مجھے دے دیا تھا۔"

"شہلا بھی عجیب تھی اور تم بھی عجیب ہو۔"

"میں آدھی آپی ہوں اور آدھی میں۔"

"ارے بھئی چلو گے نہیں۔ باتیں ہی کرتے رہو گے۔" بوا نے بھنا کر پکارا۔

باہر سرمد کی سفید مرسڈیز کھڑی تھی۔ میمونہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور بوا پچھلی سیٹ پر۔ سرمد ڈرائیو کر رہا تھا۔

گاڑی کلفٹن کی حدود میں داخل ہوئی تو بوا نے کہا "ہم سمجھ گئے۔ ساحل سمندر پر پکنک ہوگی۔ کھانا کھایا جائے گا۔"

"دیکھتی رہیے اماں۔"

ڈھلوان سڑک پر ساحل کی طرف جاتے ہوئے سرمد نے گاڑی سائیڈ میں روک لی۔ "یہ دیکھو مونا۔" اس نے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ زمین ہے، جو میں دھنک لگژری اپارٹمنٹس کے لئے لینا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ لوں گا بھی۔ اسی



کے متعلق فون پر بات ہو رہی تھی۔ میں رشوت نہیں دوں گا۔ کروڑ دو کروڑ کے منافع سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"اچھی جگہ ہے۔" میمونہ نے تبصرہ کیا۔

سرمد نے گاڑی بڑھا دی۔ بارش رک گئی تھی۔ اچانک میمونہ چلائی "وہ دیکھیں ... کتنی خوب صورت دھنک ـــ وہ بھی سمندر پر۔ کتنا حسین منظر ہے۔"

سرمد مسکرایا "دھنک اتنی نیچی کیسے ہوسکتی ہے۔ اسے تو آسمان پر ہونا چاہیے۔"

میمونہ نے غور کیا۔ بات تو ٹھیک تھی۔ دھنک کافی نیچی تھی مگر دھنک کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

فاصلہ کچھ کم ہوا تو اس نے بے اختیار کہا "ارے ... یہ تو مکان ہے۔ اس طرف چلیں۔ مجھے دکھائیں۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی اس مکان کے پاس کھڑی تھی۔ مکان کا نچلا حصہ تقریباً بارہ فٹ اونچا پلیٹ فارم تھا۔ اس کے اوپر دو منزلیں تھیں اور وہی دو منزلیں ٹیرس سمیت دھنک کی طرح بنائی گئی تھیں۔ "پلیٹ فارم نہ ہوتا تو دھنک زمین پر ٹکی محسوس ہوتی۔" سرمد نے تبصرہ کیا۔

"کمال کر دیا بنانے والوں نے۔" میمونہ بولی۔

"اور یہ مکان کا عقبی حصہ ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ سب کچھ تو فرنٹ پر ہونا چاہیے تھا۔" سرمد نے کہا "چلو... ذرا پہلوؤں سے دیکھیں۔"

مگر مکان کی دونوں سائیڈیں بھی اسی انداز کی تھیں "چلو ... گاڑی میں بیٹھو۔" سرمد نے کہا۔

میمونہ کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ گاڑی میں آبیٹھی۔ سرمد ڈرائیو کرتا رہا۔ اچانک انہوں نے خود کو اسی مکان میں پایا۔ سرمد نے گاڑی روک دی "چلو، اترو۔" سرمد نے کہا۔

میمونہ مبہوت ہو کر مکان کو دیکھتی رہی۔ وہاں دو گیٹ تھے۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ بڑے گیٹ کے ساتھ گھومتا ہوا اوپر جاتا ہوا ڈرائیو وے تھا۔ چھوٹے گیٹ کے

ساتھ سیڑھیاں تھیں۔ چھوٹے گیٹ کے اطراف میں شفاف بلوری کیس تھے، جن میں کچھ لکھا تھا۔

"ارے یہ کیا۔" سرمد نے حیرت سے کہا "یہ تو تمہارا مکان ہے مونا۔" اس نے بلوری کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مذاق مت کریں۔" میمونہ نے کہا مگر اس نے پڑھا تو حیران رہ گئی۔ ایک طرف قوس قزح اور اس کے نیچے پلاٹ نمبر اور علاقے کا نام لکھا تھا اور دوسری طرف میمونہ سرمد "یہ ... یہ سب کیا ہے؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ارے .... میمونہ تو جانے کتنی ہوں گی شہر میں۔" سرمد نے کہا۔

"لیکن میمونہ سرمد ایک ہی ہے۔"

"یہ تمہارا ہی ہے میری مونا۔" سرمد نے بے حد محبت سے کہا۔ "یہ تمہارا منہ دکھائی کا تحفہ ہے۔"

میمونہ کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں "چلو۔ بیٹھو۔" سرمد نے کار کی طرف اشارہ کیا۔ میمونہ بیٹھ گئی لیکن اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ سرمد نے ہارن دیا۔ تیسرے ہارن پر بڑا گیٹ کھل گیا۔ سرمد کار گیٹ سے گزار کر ڈرائیو وے میں لے گیا۔ گیٹ بند ہوگیا۔



سرمد، بوا اور میمونہ کو ایک ایک کمرا دکھاتا پھر رہا تھا۔ بوا بہت خوش تھیں۔ بار بار کہہ رہی تھیں .... کیسا خوب صورت مکان ہے۔ اللہ لاکھ مبارک کرے۔ پھر بوا نے ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کمرا تو تم نے دکھایا ہی نہیں ہمیں۔"

"یہ کمرا ابھی نہیں کھلے گا اماں۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن اس میں سب سے پہلے آپ اور مونا ہی داخل ہوں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی میاں۔"

"یہ حجلہ عروسی ہے اماں۔" سرمد نے نظریں جھکا کر کہا "شام کو آپ بیوٹی پارلر



جائیں گی اور مونا کو دلہن بنا کر واپس لائیں گی۔ پھر وہ کمرا کھلے گا۔"

"اچھا .... ہم کھانا لگاتے ہیں۔" بوا نے کہا "کھانے کے کمرے میں ہی کھاؤ گے نا؟"

"جی ہاں اماں۔"

بوا کو کچن ایسا بھایا کہ وہ اسی کی ہوگئیں "اے ہے ... ضرورت کی ہر چیز موجود ہے یہاں۔" وہ خوش ہو کر بولیں۔

کھانے کے بعد بوا نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا "اب ہم چائے لائیں گے۔"

"چائے لان میں پئیں گے۔"

لان بے حد خوب صورت تھا۔ ترتیب اور سلیقے میں بے مثال۔ سنگ مرمر کی خوب صورت بینچوں پر دھنک رنگ چھتریاں لگی تھیں۔ دودھیا روشنی کے لیمپ پوسٹ بھی ترتیب سے لگے تھے۔ میمونہ کی ایسی کیفیت تھی، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ اچھا نہیں لگا؟" سرمد نے اسے ٹوکا۔

"بہت خوب صورت ہے۔ جیسے خواب۔" میمونہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "اور کمال ہے۔ کہیں سے بھی دیکھیں، یہ دھنک ہی نظر آئے گا۔"

"سمندر پر دھنک۔ کیسا خوب صورت خیال ہے!"

"لیکن آپ نے اسے حقیقت بنا دیا۔"

"تم خواب دیکھتی رہو۔ میں انہیں تعبیر دیتا رہوں گا۔" سرمد گنگنایا۔

بوا چائے لے آئیں اور چائے بھی پی لی گئی۔ میمونہ اب کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں تھا "دھنک نہیں نکلی۔" وہ بولی۔

"تو پریشان کیوں ہو۔ ادھر دیکھو۔ یہ دھنک ہے تمہارے سامنے۔"

میمونہ نے اپنے دھنک مکان کو دیکھا پھر بولی "لیکن آج تو مجھے وہی دھنک چاہیے۔ میں نے آپی کا بسنتی سوٹ پہنا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ آج دھنک ضرور نکلے گی، اور تم ان کپڑوں میں میرے ساتھ اسے دیکھو گی۔"

اسی لمحے افق پر دھنک کے خدوخال ابھرنے لگے "وہ دیکھو۔" سرمد نے میمونہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ میمونہ کے چہرے پر پھول کھل اٹھے۔

دھنک کو دیکھتے دیکھتے سرمد نے گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکرا دیا۔ مرادیں پوری کرنے والا دن تیزی سے ملن کی رات کی طرف بڑھ رہا تھا۔

